UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224101
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۰۵ Accession No. ۴

Author: سال نامہ ادبی دنیا

Title: سال نامہ ادبی دنیا ۱۹۳۶ء

This book should be returned on or before the date last marked below

محمد شریف منشی فاضل

فہرست

جلد ۴ نمبر ۴

تصاویر:- سہ رنگی :- عرض و نیاز

یک رنگی :- (۱) سہیلیوں کی خوش فعلیاں - ۲- شاہجہان کی آخری گھڑیاں - ۳- آبشار

۱	مختصرات	تاجور	۵
۲	غزل	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (ایم - اے (الہ آباد))	۶
۳	انیس اور حالی میری نظر میں	جناب عطاء اللہ پالوی	۷
۴	عہد اکبری کے علمی و ادبی نوادر	سید نیاز احمد صدیقی ایم - اے - بی - ٹی	۱۸
۵	جگ بیتی کا ایک ورق	جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (دہلوی)	۲۵
۶	محبت اور فرض	جناب مہتاب رائے ایم - اے	۲۷
۷	حسن	جناب محمد نعیم احمد بریلوی - بی - اے	۳۱
۸	اشکبار فراق ہے	جناب احسان دانش	۳۲
۹	مشاہیر عالم (رضا شاہ)	جناب حبیب احمد بی - اے	۳۳
۱۰	موت (ڈرامہ)	جناب امین حزیں (بہاولپور)	۳۷
۱۱	غزل	جناب حرماں خیرآبادی	۳۹
۱۲	شاعر اور روح الانیس (نظم)	شیخ روشن دین بی - اے - ایل - ایل - بی (وکیل)	۴۰
۱۳	کیا بیکاری کا کوئی حل ہے؟	جناب عبدالرحیم شبلی - بی - کام	۴۲
۱۴	غزل	جناب حمید عرفانی - ایم - اے	۴۵
۱۵	بے چین روحیں	پنڈت پریم ناتھ سادھو دلق کاشمیری	۴۶
۱۶	غزل	جناب حرماں خیرآبادی	۴۹
۱۷	غزل	جناب محمد علیخاں شاد عارف	۳۶
۱۸	سیلنا	تماشائی	۵۰
۱۹	مالا	جناب عبدالعلیم ہاشمی	۵۲
۲۰	پیاسے من کی آس	میرزا یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی	۵۴
۲۱	آہ! (صفر گونڈوی)	بابو کرشن سہائے وحشی کانپوری بی - اے - ایل - ایل - بی	۵۵
۲۲	تعلیمات	جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات و تعلیمات حیدرآباد دکن	
۲۳	درس عمل (نظم)	جناب بدھ بال کول	۵۸
۲۴	تمنائے مسرت	جناب منشی "ہدیہ" شمیم	۵۹
۲۵	غزل	جناب اختر مرحوم	۶۰
۲۶	اردو شاعری کے محاسن کلام اعتراف	مولینا ابو محمد امام الدین مدیر ترجمان	۶۱
۲۷	غزل	(پیرزادہ) احمد ندیم قاسمی بی - اے	۶۲
۲۸	نورجہاں (نظم)	جناب واصلی مرحوم	۶۵
	صفحۂ اطفال :-		
۲۹	(چوہوں کا سوداگر)	تاجور	۶۷

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع ہوا)

(قیمت ۴ روپے)

پنجاب کی اتحاد پارٹی کے رہنما جس سیاسی پروگرام کو لے کر میدان میں آئے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے کوئی سمجھ بوجھ کا انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پروگرام "آئیڈیلزم" یا شاعرانہ تخیلات کا آئینہ دار ہے۔ اور اس لئے ناممکن العمل ہے۔

پنجاب کے سیاسی حالات کا معتبر یہ ایک نظر اس پروگرام کو وقت کا بہترین نظامِ عمل تصور کرے گا۔

اتحاد پارٹی کا پروگرام جمہوریت کی حسین ترین تصویر پیش کر رہا ہے۔ پھر اس پارٹی کے بنیا حکومت کے نظم و نسق کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں۔ اُن کی سابقہ خدمات صوبے کی تاریخ کے صفحات کو جگمگا رہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں جو پارٹیاں نیرو آزمائی کا ارادہ رکھتی ہیں نا تجربہ کار، فرقہ پرست، اور ان کے سیاسی پروگرام کا اصلی عنصر تعمیر کی بجائے تخریب ہے۔

گذشتہ تجربات ہمارے لئے شاہدِ عادل اور گواہِ ناطق کا حکم رکھتے ہیں ان تجربات کی جانب سے چشم و گوش کو بند کر لینا مستقبل کو خطرہ زار بنا لینے کے مرادف ہوگا۔

اتحاد پارٹی کا پروگرام تعمیری ہے۔ وہ مانتی ہے کہ آئندہ دستورِ حکومت ہمارے مطالبات کو پورا نہیں کرتا۔ اس لئے ناقص بھی ہے اور ہمارے واجبی حقوق کے لئے غاصبانہ بھی۔ مگر اس لعنت کو ایک ضروری لعنت کے طور پر قبول کر لینے کے سوا چارۂ کار بھی نہیں۔ موجودہ دستورِ حکومت اس سے بھی زیادہ ناقص اور حقوق کش تھا، لیکن اس کو رد کرنے کے تمام افسوں بیکار ثابت ہوئے اور اسے بادلِ ناخواستہ ہر گرم سے گرم پارٹی کو قبول کرنا پڑا۔ سول نافرمانی، پکٹنگ، ٹیکس کی عدم ادائیگی، جیل، دار و رسن کے تمام ہنگامے بھی اس دستورِ حکومت کو تبدیل نہ کرا سکے۔ اور بالآخر ہنگامہ آفریں جماعتیں بھی تعاون و موالات پر مجبور ہوئیں اور اس تعاون کے ذریعہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ اس وقت مجلسِ قانون ساز ہند میں سب سے طاقتور پارٹی کانگریسیوں اور سوشلسٹوں کی ہے۔ آئندہ دستورِ حکومت ناقص سہی مگر موجودہ دستور کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر ہے اور بقول پروفیسر گلشن رائے "یہ دستورِ حکومت بھی نافذ ہوگا۔ اور کوئی حقیقت یہ ہے کہ اتحاد پارٹی ایک دن ... رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جدید دستورِ حکومت کو کامیاب بنانا موجودہ حالت میں صحیح پالیسی ہے۔ موجودہ ناقص ترین دستورِ حکومت سے تعاون کر کے اتحاد پارٹی نے اپنی اقلیت کے باوجود صوبے کی تعمیر و تخلیق سے متعلق جو شاندار اور زرین خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی صوبہ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ ذیل کے جدول سے اتحاد پارٹی کی قابلِ قدر مساعی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

موجودہ دستورِ حکومت سے پہلے صوبے کی تعلیمی رفتار حسب ذیل تھی۔

آرٹ کالج	۳	پرائمری اسکول	۴۰۶۰
میڈیکل کالج	۱	زنانہ ہائی اسکول	۳
ایگریکلچر کالج	۱	مڈل اسکول	۴
ویٹرنری کالج	۱	پرائمری اسکول	۶۹۵
ہائی اسکول	۴۰	طلبہ کی تعداد	۴۸۰۲۸۳
مڈل اسکول	۲۶۷	طالبات کی تعداد	۶۲۵۸۱

موجودہ دستورِ حکومت سے تعاون کر کے اتحاد پارٹی نے مذکورہ بالا نعماءِ تعلیم کو پرواز میں تبدیل کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

ڈگری کالج	۵	ٹریننگ اسکول	۳
انٹرمیڈیٹ کالج	۱۹	صنعت و حرفت کے اسکول	۲۰۰
ہائی اسکول	۱۱۵	تعداد طلبہ	۱۰۷۹۸۷۹
مڈل اسکول	۳۱۰۶	تعداد طالبات	۲۸۰۰۰۰
پرائمری اسکول	۵۰۰۰۰		

یہ حیرت انگیز رفتار تعلیم حسب تفصیل ذیل ہوئی ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج۔ ہر تحصیل میں ایک ہائی اسکول۔ ہر آٹھ میل کے رقبے میں ایک اپر مڈل اسکول ہر چھ میل کے اندر ایک لوئر مڈل اسکول۔ ہر دو میل میں ایک پرائمری اسکول، جاری کیا گیا۔

اس رسالے کے تمام مضامین کے حقوق بحق ادبی دنیا محفوظ ہیں۔

ادبی دنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون
۱	پیغاماتِ تہنیت	
۲	بزمِ ادب	منصور احمد
	افسانے	
۳	جہارانی کا تحفہ	جناب سردار راجندر سنگھ صاحب بیدی
۴	نینا	جناب مظفر احمد صاحب
۵	دولہا دلہن کی ڈائری	حضرت نسیم رضوانی
۶	جھکی جھکی آنکھیں	جناب ممتاز مفتی صاحب بی اے
۷	خوشبودار خط	جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی بی اے ایل ایل
۸	مسرت	حضرت طاہر قریشی بی اے
۹	تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو	جناب محترمہ سلیمہ سلطانی بیگم صاحبہ لکھنوی
۱۰	محبت کے کرشمے	جناب ایف ایم ساقی صاحب
۱۱	مینارِ غزالاں	حضرت ظفر قریشی بی اے آنرز
۱۲	بیاہ	جناب مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب
۱۳	جھوٹ	جناب مولانا محمد امیر اللہ صاحب
۱۴	خواب یا حقیقت	جناب محمود احمد خاں صاحب
	ڈرامے	
۱۵	کمار	جناب اندر لال [illegible]
۱۶	تخیل پرست انسان	جناب مولانا شاہ [illegible]
۱۷	بھیڑیا	جناب مظفر [illegible]
۱۸	دو مسئلے	[illegible]
۱۹	پنجاب کا اولیں اردو ماہنامہ	جنا[illegible]

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۲۰	مسلمان اور ہندی زبان	جناب پنڈت رام سروپ صاحب شاستری بی اے	۶۳
۲۱	جاپان میں تین نو روز	جناب پروفیسر نور الحسن صاحب برلاس، توکیو سکول آف فارن لینگویجز جاپان	۸۹
۲۲	جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر	جناب پروفیسر آرگاموصاحب جاپانی	۱۱۳
۲۳	جواہر لال نہرو	جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی	۱۲۹
۲۴	تہذیب کدھر جا رہی ہے	جناب ڈاکٹر ایس ایم اختر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور	۱۹۳
۲۷	آزادی	جناب میاں کفایت علی صاحب بی اے	۲۰۶
	شاہزادیوں کی شاعری	حضرت تسکین عابدی حیدرآباد دکن	۲۰۸

تنقیدی مضامین

سیفو	منصور احمد	۱۰
غالب کی فارسی شاعری	جناب علامہ عرشی امرت سری	۲۶
کے دیہاتی گیت	جناب مولانا فضل حق صاحب قریشی دہلوی بی اے	۸۲
نازجنگ اور ان کی شاعری	حضرت تکمین کاظمی، حیدرآباد، دکن	۱۴۷
شاعری	جناب پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی ایم اے، ہندو یونیورسٹی، بنارس	۲۲۲

ادبی مضامین

	جناب خورشید محمد صاحب بی ایس سی	۶۸
	حضرت عظیم قریشی	۱۰۹
	غلام عباس صاحب مولوی	۱۶۴
	شیر ہندی صاحب	۱۹۱
	مل	۲۳۰

حصہ نظم

		۱۵
		۱۷
	فراق گورکھپوری ایم اے، پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی	۲۴
		۲۵
	آزاد انصاری	۳۸
		۴۸
	اثر صہبائی، اسماعیل بی وکیل سری نگر	۴۹
	شاہنامۂ اسد	۶۰
		۶۱

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۴۶	صدائے درد دل	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی	۶۹
۴۷	پھر مانگ پھر مانگ	" "	۷۰
۴۸	یادِ فراموشی	حضرت عرشی امرتسری	۷۴
۴۹	خفا اور انسان	جناب سید عبدالحمید صاحب عدم	۸۱
۵۰	نوا ہائے راز	حضرت صدق جائسی	۸۷
۵۱	نئی بات، پرانی بات	جناب میراجی	۹۷
۵۲	جو ہونا ہیں راجہ	" "	۹۸
۵۳	غزل	جناب مہرلال سونی صاحب ضیا فتح آبادی ایم اے	۱۰۸
۵۴	فکرِ اقبال	حضرت حفیظ ہوشیارپوری ایم اے	۱۱۱
۵۵	بہار	جناب خواجہ عبدالحمید صاحب عرفانی ایم اے	۱۱۶
۵۶	غزل	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	۱۲۷
۵۷	بنامِ یگانہ	حضرت یگانہ چنگیزی لکھنوی	۱۲۸
۵۸	اے ابنِ آدم	حضرت وقار رانبالوی	۱۳۵
۵۹	کون؟	جناب شاہد رامپوری	۱۴۴
۶۰	مناظرِ فطرت	جناب مرزا عباس بیگ صاحب محشر	۱۴۵
۶۱	جامِ صہبائی	حضرت اثر صہبائی	۱۵۲
۶۲	طلسمِ گلنار	جناب سید عبدالحمید صاحب عدم	۱۵۷
۶۳	سرودِ ہندی	جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم اے، الہ آباد یونیورسٹی	۱۵۸
۶۴	قطعات	حضرت ضیا فتح آبادی	۱۶۲
۶۵	پریتم کو ڈھونڈنے	جناب پنڈت اندرجیت صاحب شرما	۱۶۳
۶۶	احساسِ تغافل	جناب روشن لال صاحب روشن نکودری بی ایس سی آنرز	۱۶۹
۶۷	غزل	جناب حاجی صاحب سرحدی	۱۷۴
۶۸	کوئل	جناب مسعود شاہد صاحب بی اے	۱۷۵
۶۹	غزل	حضرت سیفی لوگانوی	۱۷۶
۷۰	رباعیات	جناب سعید احمد صاحب اعجاز	۱۸۴
۷۱	ٹیپو کی وصیت	جناب شہید ابن علی	۱۸۸
۷۲	غزل	جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر ایم اے	۱۹۲
۷۳	تجلیات	جناب مولانا جلال الدین صاحب اکبر بی اے آنرز	۱۹۹
۷۴	غزل	جناب سید محمد ابراہیم صاحب نجم ندوی ایم اے	۲۰۷
۷۵	تجلیات	جناب اختر انصاری دہلوی بی اے آنرز	۲۱۹
۷۶	اشکبارِ فراق سے	حضرت احسان دانش	۲۲۹

فہرست تصاویر

نمبر	تصویر	مصور	تفصیل
			سہ رنگی
۱	سرورق	سرفراز	سرورق کے تخیل میں آرٹ اور لٹریچر کا امتزاج ہے مصور نے اس میں تجریدی طرز کا تتبع کیا ہے۔ اس طرزِ مصوری میں رنگوں کا سجانا بہت مشکل کام ہے لیکن انہوں نے تھوڑے سے رنگوں سے بہت کام لیا ہے اور اس کی تزئین میں اپنے کمال کی انتہا کر دی ہے۔
۲	ماں کی گود	الفریڈ گاٹس	یہ تصویر مصور نے ۱۹۱۰ء میں بنائی تھی اور ۱۹۱۳ء میں انجمن مصورانِ فرانس کی نمائش میں پیش ہوئی۔ ماں اور بچے کا موضوع ایک قدیم اور ابدی موضوع ہے لیکن اس تصویر کی خصوصیت ماں کی گود کا سکون اطمینان ہے
۳	پنڈورا	سی ای پیرگینی	پنڈورا یونانی اساطیر میں ایک ایسی عورت ہے جسے دیوتاؤں نے تمام خوبیوں سے متصف کر دیا تھا وہ گھر سے اپنے شوہر کے لئے ایک صندوقچہ لائی تھی جسے کھولنے پر نوعِ انسان کے لئے ہر قسم کی آفات نمودار ہو گئیں۔ صرف امید اس میں باقی رہ گئی کیونکہ پنڈورا نے کھولنے سے ڈھکنا بند ہو گیا تھا۔ اس کا شوہر صرف حال پر نظر رکھتا تھا وہ انجام سے بے خبر ہو کر صرف اپنی بیوی کے حسن سے مسرور رہتا تھا یہی ہماری موجودہ تہذیب کا حال ہے۔
۴	کرشن لیلا	سوزان لیگناؤ	ایک فرانسیسی مصورہ نے ہندو تخیل کے اظہار میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ وشنو کے اوتار کرشن جب نبسی بجاتے تھے تو نہ صرف انسان بلکہ فطرت کی دوسری مخلوقات بھی اس کی شیرینی کی وجہ سے ہمہ تن گوش ہو جاتی تھی۔ گاؤں کی گوپیاں اور چرند و پرند نبسی کی لے سے محو ہو رہے ہیں۔ یہ تصویر زندگی، آرائش اور رنگ کاری کے لحاظ سے نظیر ہے
۵	لبِ آبجو	ہیرٹ مارڈنر	یہ خیالات میں کھوئی ہوئی ایک حسینہ کی تصویر ہے۔ پُرکیف فضا اور ہلکے ہلکے دھیمے دھیمے رنگ تصویر کے موضوع سے بہم آہنگ ہیں۔
۶	کیفِ بہار	ہنری سے لینڈ	یہ ایک یونانی محل کا ایک حصہ ہے جس میں بہار اور اس کی شعرت آمیز فضا پیش کی گئی ہے محل کی وسعت میں پرندوں کو پھیلا کر تصویر میں جان ڈال دی گئی ہے۔ اس تصویر کی ایک خصوصیت صرف حسن بھی ہے۔
۷	دخترِ صحرا	نامعلوم	صحرا اور صحرائی زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے۔ لڑکی مسافر کو زادِ راہ دے رہی ہے۔
			یک رنگ
۸	محبت کا جال	آرمیڈو روڈھیکسٹر	سنگِ مرمر کا ایک حیرت انگیز مجسمہ ہے۔ محبت کے دیوتا کیوپڈ نے ایک بھولی بھالی دوشیزہ کو اپنے دام میں پہلی دفعہ گرفتار کیا ہے یعنی اسے پہلی دفعہ عشق کا خیال آیا ہے۔ گلاب اور دوسرے گلہائے جذبات اس کے سڈول اعضا کے گرد لپٹ رہے ہیں اور ان کی خوشبو حسین فیدی کو مغلوب ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔
۹	محبت اور موت	میکگڈ اسکول	حسن، عشق اور رخافت کو یکجا دکھایا گیا ہے تصویر اگرچہ کھلونوں کو ترتیب کر کے بنائی گئی ہے تاہم شوکت اور دلچسپی کے لحاظ سے نگاہ کے لئے خاص کشش رکھتی ہے۔
۱۰	کیوپڈ کی شادی	نامعلوم	ایک نئی تصویر ہے۔ تاروں بھری دلکش رات میں حسن و عشق کی شادی کا منظر دکھایا ہے۔
۱۱	نیویارک		سالنامہ ہذا سے ماخوذ ہے۔ نیویارک کے پُرشوکت اور مغرور شہر کا فوٹو ہے جو ہوائی جہاز پر سے لیا گیا۔
۱۲	جاپانی ضیافت		پروفیسر الموس صاحب بروس کے مضمون جاپان میں عورت سے متعلق
۱۳	راشو کا کھیل		" " "
۱۴	شہنشاہِ چین کی خود کشی		حضرت نظر قوشی کے مضمون بلیغ فرعون سے متعلق

تین درجن سے زیادہ اہلِ قلم کی تصاویر

۱۵- مسجدِ غرناطہ- اندلسی اور گاتھک طرز تعمیر و تزئین کا لاجواب سنگ جو ہسپانیہ سے آئیرالی ایک خاتون نے عنایت کیا ہے (سہ رنگی)- ۱۶- ساحرہ لیڈی ہلفن مشہور یونانی ساحرہ سرسی کے بھیس میں (یک رنگی)۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہر روز ہزاروں لوگ کیوں "سیکنڈس" سے متاثر ہوتے ہیں

اس لئے کہ یہ گھڑیاں ان اوسط درجہ کے لوگوں کے مذاق اور استطاعت کے نہایت مطابق اور مناسب ہیں جو کم خرچ اور بالانشیں کے مقولہ پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان گھڑیوں کا خوبصورت سائز اور بہترین ساخت نہایت درجہ تسلی بخش ہے۔

SECUNDUS'

خوب صورتی۔ خوش وضعی اور کم قیمتی کے لحاظ سے لاثانی ہیں اور بہت سے ڈیزائن آپ کو ہماری بڑی فہرست میں ملیں گے جو طلب کرنے پر مفت ارسال ہوتی ہے

سیکنڈس نیو کیلی برٹونیو ہمیشہ چمکدار رہنے والا فولاد ۲۴۔ چوبیس روپے
۹ قیراط سونا ۲۸۔ اٹھائیس روپے
۱۸ قیراط سونا ۳۲ روپے
رولڈ گولڈ ۳۲ روپے
۳۰ تیس روپے
۸۰ روپے

سیکنڈس چھوٹی محفوظی

رولڈ گولڈ . . . . . ۲۹ روپے

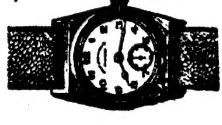

سیکنڈس ٹونیو ریگولر سٹائل اے

سدا چمکدار فولاد . . . . . ۲۶ روپے
رولڈ گولڈ . . . . . ۳۰ روپے
۹ قیراط گولڈ . . . . . ۵۵ روپے

سیکنڈس چھوٹی چوکور

سدا چمکدار فولاد . . . . . ۲۷ روپے
۹ قیراط سونا . . . . . ۴۰ روپے
رولڈ گولڈ ۳۰ روپے
۱۸ قیراط سونا ۵۰ روپے

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی
بمبئی ـــــ کلکتہ

WEST END WATCH Co.
BOMBAY CALCUTTA

Send for large FREE Catalogue

پیغاماتِ تہنیت

"ادبی دنیا" اس سالنامے کی اشاعت سے اپنی عمر کی دسویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس عرصے میں اس نے جو مفید خدمات انجام دیں اُن کی قدردانی کے اظہار میں "ادبی دنیا" کے بعض معزز سرپرستوں نے ہمیں تہنیت کے پیغامات بھیجے ہیں۔ جو شکریے کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

آنریبل سر جگندر سنگھ وزیر زراعت پنجاب

"ادبی دنیا" کا ایک مقصد اور پیغام ہے۔ یہ اپنے ناظرین کے سامنے آرٹ اور ادب کا بلند مطمحِ نظر پیش کر کے اُن میں ایک ایسی روح پھونکتا رہتا ہے جو زندگی کی اُن بے کیفیوں پر غالب آنا سکھاتی ہے جو ہماری طاقت کو ہر لمحہ سلب کرتی رہتی ہیں اور ہمیں اُن برکات سے بہرہ اندوز کرنے والی قوتوں سے محروم کرتی رہتی ہیں۔ جو فطرت اور خدا کی طرف سے بارش کی طرح ہمارے ملک پر ارزانی ہوا کرتی ہیں میں ہمیشہ "ادبی دنیا" کی کامیابی کا خواہاں ہوں

آنریبل سر گوکل چند نارنگ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب

مجھے یہ سُن کر نہایت مسرت ہوئی کہ "ادبی دنیا" اپنی عمر کی دسویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد اور بہترین خواہشات کا ہدیہ قبول کیجیے۔

آنریبل میجر سر راؤ سکندر حیات خاں وزیر مالیات حکومت پنجاب

"ادبی دنیا" پچھلے نو سال سے پنجاب اور بیرونجات میں اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اس

کے مضامین ہر پہلو سے نہایت پسندیدہ ہوتے ہیں۔ بالخصوص اقتصادی مضامین ملک کی بہبودی کے لئے نہایت مفید ثابت ہونے چاہئیں۔ امید ہے اس کی اشاعت میں دن بہ دن توسیع ہوتی رہے گی۔ میں ادارۂ "ادبی دنیا" کو اُن کی خدماتِ اردو ادب پر مبارک باد دیتا ہوں اور اس کی ترقی کا خواہاں ہوں۔

آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ

میں آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ مجھے آپ کے رسالے کے لئے کوئی مضمون لکھنے کا شاید موقع نہ ملے گا۔ بہر حال میں ہر وقت "ادبی دنیا" کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

فاضلِ محترم سیّد عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل

مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ "ادبی دنیا" نے اپنی عمر کے نو سال ختم کر لئے ہیں۔ اس زمانے کے دوران میں اس نے اردو کے حق میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں میری دلی خواہش ہے کہ اس کو اپنے مقاصد میں بیش از بیش کامیابی ہو۔

خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ ایم ایل سی رئیسِ اعظم و چیف سکرٹری یونینسٹ پارٹی لاہور

ادبی دنیا مشرق کے بہترین رسائل میں سے ہے اور ہندوستان کے اردو رسائل میں تو اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی اپنا جواب نہیں رکھتی اس کی صورت اور سیرت دونوں نہایت مسرت افروز ہیں میں تہِ دل سے آرزومند ہوں کہ "ادبی دنیا" کے مدیر اور اُن کے معاونوں کو اپنی کوششوں میں ہمیشہ کامیابی ہو۔

بزمِ ادب

جیسے یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں ہر لمحہ اپنے محور کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے اور مختلف فضاؤں اور ہواؤں سے انقلاب آفریں اثر لیتی رہتی ہے۔ یہی حال دنیائے ادب کا بھی ہے۔ اسے بھی ایک فضا میں قرار نہیں اور یہی اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ ادب کی مختلف تحریکات اور مختلف رجحانات اس کی اسی سرگرمی کا نتیجہ ہیں۔ اور جو اثرات یہ اخذ کرتی رہتی ہے اُن کے ماخذ کی تجدید اور تنوع بھی اس کی اسی حرکت پر منحصر ہے۔ گزشتہ چند سال کے اردو ادب پر اور خصوصاً اُس ادب پر جو رسائل کے ذریعے سے ملک میں پیش ہو رہا ہے اگر نظر ڈالی جائے تو بیسیوں نئی باتیں اور سیکڑوں نئے رنگ ملیں گے جنہوں نے ادب کی ترقی اور توسیع میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان چند سالوں میں چونکہ ہر زبان کے خادموں کی توجہ متقابل مطالعے کی طرف رہی اس لئے اپنی زبان کے ساتھ دوسری زبانوں کی خوبیوں پر غور کرنے کا بھی انہیں موقع ملتا رہا۔ اردو چونکہ ملی جلی زبان ہے اس کے لئے ایسے مواقع اس کی روح ترقی کو اور تازہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ متفکرین ادب نے دیکھا ہوگا کہ اردو زبان آج کتنی شگفتگیوں جدتوں اور وسعتوں کی حامل بن رہی ہے۔ طرزِ تحریر کا انقلاب سلاست اور ٹھیٹھ پن میں نمود ارہوا ہے۔ علمی حیثیت سے مصنفین نے کئی نئے شعبہ ہائے علم پر قلم اٹھایا ہے۔ تحقیقی لحاظ سے ایسے ایسے مضامین لکھے گئے جو نہ صرف حامیانِ زبان کے لئے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں بلکہ جو ہمارے ملک کی صحیح حیثیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعری میں کئی ایسے اسلوبِ بیان اور اصنافِ سخن رائج ہو چکے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے بغاوت خیال کئے جاتے تھے۔ غرضکہ اردو نے اس سعی و جہد کے زمانے میں ترقی کی طرف جتنے قدم بھی اٹھائے ہیں اُن کے لئے وہ مستحق مبارک باد ہے۔

اس تجدید و توسیع کی ذمہ داری زبان اور ملک کے جن بیدار مغز اور تخلیق پرور طبقے پر عائد ہوتی ہے ہمیں مسرت ہے کہ اس کا ایک معتد بہ حصہ دوسرے بلند پایہ رسالوں کے ساتھ "ادبی دنیا" کو بھی ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ سالنامے میں جو مضامین درج ہوئے اگرچہ اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ناظرین کو سرِ سرسری پڑھنے ہی سے ہوگا لیکن تعارف کے طور پر یا توجیہ انتخاب کے طور پر ہم یہاں چند سطور لکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ انتخاب شاید اس سے دس گنا زیادہ مواد میں سے عمل میں آیا۔

علمی مضامین میں علامہ کیفی دہلوی کا مضمون "پنجاب کا اولین اردو ماہنامہ" حسبِ معمول اُن کے تحقیقی انداز کا ایک پُر از معلومات ذخیرہ ہے۔ اس اولین ماہنامے کے موضوعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو صحافت پنجاب میں آغازِ بی سے ایک شاندار اٹھان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ علوم جدیدہ پر جس بے تکلفی سے اس کے مقالہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے اور جس خوبی سے انہیں بنایا ہے اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا ہی ایک اور تحقیقی مضمون "مسلمان اور ہندی زبان" ہے، جسے پروفیسر رام سروپ صاحب شاستری نے بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے۔ ایسے مضامین کی اشاعت اردو ہندی کے متعصب حامیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ "جاپان میں جشنِ نوروز" اور "جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر" دونوں مضامین ہمیں بیرونِ ہند سے موصول ہوئے ہیں۔ پہلا پروفیسر نورالحسن صاحب برلاس کا اور دوسرا پروفیسر آرگا موصاحب کا ہے۔ یہ دونوں حضرات توکیو کے سکول آف فارن لینگویجز کے فاضل اساتذہ میں سے ہیں اور جاپان میں اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ "پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح عمری" سید بادشاہ حسن صاحب نے لکھی ہے۔ اختصار کے باوجود انھوں نے کوئی اہم واقعہ نظر انداز نہیں کیا اور واقعات کی کثرت کے باوجود اسے دلچسپ بنانے اور ذاتی رنگ دینے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ "تہذیب کدھر جا رہی ہے" ڈاکٹر ایس ایم اختر صاحب کا ایک بصیرت افروز مضمون ہے جسے انہوں نے پورے تین مہینے کی محنت اور ہزارہا صفحات کے مطالعہ کے بعد قلمبند کیا ہے۔ دنیا کی موجودہ اقتصادی کشمکش کا تجزیہ اور تین بڑی آویزشوں کا تذکرہ انہوں نے ایسے طریق سے کیا ہے کہ اقوامِ عالم کے مسالک اور سیاسیاتِ حاضرہ سے کافی واقفیت ہو جاتی ہے میاں کفایت علی صاحب کا مضمون "آزادی بھی ایک قیمتی مطالعہ ہے" شہزادیوں

کی شاعری" حضرت تسکین عابدی کی تخلیق اور کاوش کا نتیجہ ہے اور ایک ٹھوس سرمایۂ ادب ہونے کے ساتھ ہی بے حد دلچسپ بھی ہے۔

تنقیدی مضامین میں علامہ عرشی امرت سری کا مضمون "مرزا غالب کی فارسی شاعری" مصنف کے تبحرِ علمی اور قوتِ تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ غالب کے فارسی کلام پر اس وقت تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ مضمون مبسوط ہونے کے ساتھ ہی اس کمی کو بھی بڑی حد تک پورا کر رہا ہے۔ مولانا فضل حق صاحب قریشی کا مضمون "نیپال کے دیہاتی گیت" ایک انوکھا اور دلکش موضوع ہے۔ سادگی اور اثر اس کی خصوصیات ہیں۔ حضرتِ تسکین کاظمی کے مضمون کی نسبت یہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ ایک بیناء مضمون ہے۔ انہوں نے ہمیں اردو کے ایک خوش گو شاعر سے متعارف کرایا ہے اور اس کے لئے وہ تمام شائقینِ ادب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ "ایمان کی جدید شاعری" پر پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی کا تبصرہ ایک بلند پرواز کے لائق مضمون ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ ایرانی شاعری کی جدتیں اور موضوع اردو شعرا کے لئے دعوتِ فکر ثابت ہوں گی۔

ادبی مضامین میں جناب عظیم قریشی کے "رادھا کے گیت" اپنی نرم و شیریں ہندی زبان کے لئے، غلام عباس صاحب مولوی کا "شریک سفر" اپنی فلسفیانہ ظرافت کے لئے اور حضرتِ عقیل کا مضمون اپنے شگفتہ مزاح کے لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

افسانوں میں "مہمانی کا تحفہ" اپنی رنگینی اور رفعت کے لحاظ سے خوب ہے۔ مصنف نے اس میں دنیائے احساس کی قیامت دکھائی ہے مظفر احمد صاحب کا افسانہ "بینا" ایک دلکش انتخاب ہے اور اُن کی کوہستانی مصوفیات میں ایک جوئے شیر کا حکم رکھتا ہے۔ "دولہا دلین کی ڈائری" حضرتِ نسیم رضوانی کا ایک واقعیت سے لبریز افسانہ ہے۔ معاشرت کے اس پہلو کو شاید نسیم صاحب نے پہلی بار چھیڑا ہے۔ اُن کے انوکھے طرزِ بیان نے اسے اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب کا افسانہ "کبھی کبھی" اُن کے آرٹ اور نفسیات کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ وہ تحلیلِ نفسی کے ایک سرگرم طالب علم ہیں۔ اور اس جدید علم کو وہ اپنے افسانوں میں اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی علمی حیثیت اور اثر اندازی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ عاشق حسین صاحب بٹالوی کا افسانہ "خوشبو دار خط" واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ حضرت طاہر قریشی کا افسانہ "مسرتِ مہمت" کے کارناموں کا ایک مثالی بیان ہے۔ "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" میں محترمہ سلیمہ سلطانی بیگم صاحبہ لکھنوی نے ایک شگفتہ اور شوخ کردار کی تخلیق نہایت عمدگی سے کی ہے۔ ساقی صاحب کا افسانہ "محبت کے کرشمے" اپنے موضوع کی عظمت اپنے نام سے ظاہر کرتا ہے۔ "مینارِ غزالاں" حضرت ظفر قریشی کا ایک تاریخی افسانہ ہے جس کی سطر سطر سنسنی سے بھری ہوئی ہے۔ مہر محمد خاں صاحب شہاب اور حضرت آسی کے افسانے "بیاہ" اور "جھوٹ" ہندی طرزِ تحریر کے دو بہترین نمونے ہیں۔ "خواب یا حقیقت" محمود احمد خاں صاحب کا ایک روحانی افسانہ ہے جس کے واقعات کی دلچسپی اس کے انجام میں مرکوز ہے۔

ڈراموں میں اندر لال داس صاحب کا طنز اور ڈراما "کمار" مکالمے کرداروں کی تعمیر اور دوسری فنی خصوصیات کا بدرجہ اتم حامل ہے۔ مولانا شاہد احمد صاحب کا ڈراما "تخیل پرستِ انسان" کامیاب ترجمہ ہے اور دلچسپ ہے۔ "پھیلا" مظفر احمد صاحب کا ترجمہ شدہ ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اسے خوب اپنایا ہے۔ "دو سکے" صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم نے ٹالسٹائی کے اسی انداز کے ڈراموں کو مدِ نظر رکھ کر لکھے ہیں۔ دراصل ان میں دنیا وی معیاروں پر ایک طنزِ لطیف ہے۔

اب رہا حصہ **نظم**۔ اس کی نسبت ابھی تک ہمارا مذہب وہی ہے جس کا اظہار ہم گزشتہ سالنامے میں کر چکے ہیں یعنی شعر ایک نہایت بلیغ اور وجدانی متعلقِ ادب ہے۔ مجمل طور پر اس کا ذکر کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کے راگ، رنگ اور روس کو بدستور اہلِ ذوق کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ البتہ سالنامے کے اس باب کے متعلق اس قدر میں ضرور کہتا ہے کہ اس دفعہ یہ پہلے سے بہت بڑھ چڑھ کر رہا ہے، اور تنوع کے لحاظ سے ایک ایسے چمن سے مشابہت رکھتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوں اور ہر ایک کی خوشبو دوسرے سے الگ ہو۔

سالنامے کی ترتیب میں اس دفعہ تقدم و تاخر درجے کے لحاظ سے نہیں رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بعض بہتر اور اہم تر مضامین دیر سے موصول ہوئے۔ اس کی ذمہ داری کچھ وقت پر اور کچھ مصنفین پر عاید ہوتی ہے۔ امید ہے کہ وہ ہمیں بری الذمہ سمجھیں گے۔

آخر میں ہم اپنے محترم اہلِ قلم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہیں کی اعانت اور انہیں کے علم و فضل نے اس بلند پایہ مجلے کی تکمیل و تزئین کی۔ ہماری ناچیز کوششیں ان کی مساعی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

نورِ احمد

سیفو

سیفو کے عہد میں دنیا ابھی بالکل جوان تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک زمانے نے ہزاروں رنگ بدلے ہیں۔ نگاہ سے اوجھل بلکہ غالباً خیال سے بھی پرے اس کا جلوہ ناز ہے۔

سیفو کی دنیا اور ہماری دنیا کے درمیان وقت کا جو وسیع عرصہ حائل ہے اسے سالوں کے پیمانے سے ناپ کر تخیل احساس کامل کی سرحد تک نہیں پہنچ سکتا، اسے دوروں میں بیان کرنا چاہئے، جیسے ہیئت دان ستاروں کے فاصلوں کا اظہار میلوں سے نہیں بلکہ نوری سالوں سے کرتے ہیں۔

ہمارے اور سیفو کے درمیان سلطنتِ رومہ اور حضرتِ مسیح کا عہد ہے اور واقعۂ صلیب سے پرے اثینہ کی تہذیب جس کا معراجِ کمال دنیا کا بلند ترین شہر تھا۔

سیفو کی چند ناتمام نظموں سے اندازہ لگا کر لوگ کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی شاعرۂ غزل تھی۔ لیکن اس کی آواز ایک غزل گو شاعر کی آواز سے بلند تر آواز ہے۔ یہ ایک اُس دنیا کی آواز ہے جو شادابی اور حسن کی دنیا تھی اور جو اب پھر کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ اس آواز کی شیرینی میں اضافہ اس حقیقت نے کر دیا ہے کہ ہم تک یہ ایک بازگشت کی صورت میں پہنچ رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سیفو کا مشکل کوئی شعر ایسا ہوگا جو براہِ راست ہم تک پہنچا ہو اور جو اُس کے حُسنِ ادا و خیال یا شوکتِ بیان یا دانش و حکمت کے کسی پرستار کی تحریر میں نقل ہو کر اہلِ ہیئش کی آنکھوں کا سرمہ نہ بنا ہو۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ سیفو کی تصانیف قسطنطنیہ یا روم کے عیسائیوں نے جلا دی تھیں۔ یہ بات قدیم عیسائیوں کی ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ بعید بھی معلوم نہیں ہوتی۔ بعض کہتے ہیں کہ بدنظر عیسائی شہنشاہوں نے انہیں جلایا تھا اور ان کی جگہہ گریگوری نازین زن کی نظموں کی اشاعت کی تھی۔

لیکن تقدیر نے سیفو کی شاعری کو مٹانے کی جتنی بھی تدبیریں کیں وہ سب ناکام رہیں۔ سیفو شعری کی طرح ہمیشہ کے لئے تاباں و درخشاں ہے اور یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اگر اس کا کلام محفوظ یا مصئون رہتا تو اُس صورت میں بھی اُس کی شیرینی اور اثر اندازی کا یہی حال ہوتا۔

سیفو کے کلام کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں جسے پڑھ کر پڑھنے والے کا دل ایک ابائی قوسِ قزح میں لپٹ نہ گیا ہو جس طرح دیوتاؤں نے انسانی پیکر کو لباس میں ملبوس کر کے آرزو کو تخیل عطا کیا ہے اسی طرح شاید تقدیر نے نہیں بلکہ کسی دیوتا ہی نے سیفو کے قلب کو ہم سے چھپا لیا ہے

سیفو کا حسن اس کے کلام کے ذرے ذرے میں روشن ہے اس کے نغموں کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں بھی ایک زندہ و پائندہ طاقت ہے جو ہر زمانے کی ادبیات میں تازہ روح پھونکتی رہتی ہے، اور یہ روح ایک رشتۂ تابندہ کی طرح تمام ادب میں جاری و ساری ہے۔

سیفو کے متفرق اشعار تو ہم ناظرینِ "ادبی دنیا" کی خدمت میں کسی اور وقت پیش کریں گے، یہاں ہم اس کی ایک طویل نظم کا ترجمہ درج کر رہے ہیں جس میں اس نے اپنے محبوب سے خطاب کیا ہے۔

سیفو فے آن سے

(۱)

فے آن اے حسین ترین اور میرے دل سے قریب ترین،
کہا تیری پیاری پیاری آنکھیں بھول سکتی ہیں یا مجھے اب تیری یاد ہی کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔
اے محبوب! جو مجھ سے دور ایک دوسرے ملک میں ہے۔
اب سیفو تجھے بلا رہی ہے۔ تجھے اُس کو بھول چکے ہیں اور اُس کا رباب ٹوٹ چکا ہے،
اور اُس کی خطاؤں نے جو آنسو پیدا کئے تھے۔
وہ اس کی آنکھوں کو اندھا کر رہے ہیں،
وہ آسمان کی طرف لگی ہوئی ہیں، لیکن فی نفس کو نہیں دیکھتیں جو تمام نغمہ ہائے مسرت کا سرچشمہ ہے

میں جل رہی ہوں، اور جس طرح ہوا سے اڑائے ہوئے تنکوں پر شعلہ تیزی سے لپکتا ہے
اسی طرح میری آرزو کی آگ مجھ پر لپک رہی ہے۔

اُنا کے شعلے میری آتشِ آرزو کے آگے کیا ہیں،
اے وہ جو اُنا کے قریب محوِ خرام ہے!
شاعری کی دیوی نے بھی اُسی طرح مجھ سے مُنہ پھیر لیا ہے جس طرح میں اس سے روگرداں ہوگئی،
سکون، ہاں سکون ہی اب پھر ہمیں گلے ملا سکتا ہے،
نیلا سمندر اپنی تنہائی میں اُسی طرح حسین ہے
مگر میں جب کبھی جاتی ہوں اُس کے ساحلوں سے درد لے کر واپس آتی ہوں۔
لزباس کی لڑکیاں اب میرے دل کو نہیں بھاتیں،
اُن کے لئے اب میری بے لوث محبت ختم ہو چکی،
اے میرے محبوب تیری محبت کے سامنے دوسروں کی محبت کو قیام نہیں،
اے مجھ سے دُور ساحلوں پر پھرنے والے سرد مہر محبوب!

آہ تو کتنا حسین ہے! اگر تو اپالو کے بھیس میں کھڑا ہو
تو اپالو تیرے پہلو میں ایک سائے کی طرح نظر آئے۔
اگر تو اپنے بالوں کو عشق پیچے کی بیلوں میں گوندھ لے
تو بیکس تیرے سامنے مرجھا جائے
اپالو نے سیسیلم خم کیا اور بیکس شکست کھا گیا،
ایک کرینتھ سے اور دوسرا دو آفنے کی آگ سے،
مگر میرے آگے وہ کیا ہیں،
میرا جادو خشکی و تری پر برابر چلتا ہے،
میرے رباب کا نغمہ اُس دنیا سے بھی پرے گونجتا ہے جس میں فانی انسان رہتے ہیں،
اور دنیا کو اپنی آواز سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

السیس کا نغمہ اولمپس سے ٹکراتا ہے،
اور اس کی موسیقی بے باکانہ و آزادانہ اپنا مامن ڈھونڈ لیتی ہے۔
میری آواز کا تعلق انسانوں سے ہے
دیکھو دور سے افروڈائٹ مجھ پر ہنس رہی ہے۔
کیا میں حسین نہیں ہوں؟

کیا خوش ذوقی نے سادگی کو حسن کی دنیا سے نکال دیا ہے۔
کیا میں بہت ادنیٰ ہوں!
تو پھر وہ عالی قدر کون ہے کہ جس کے لئے میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔

ہاں میرا رنگ ملیح ہے ——
لیکن اُس شعلۂ جوالہ پر سیس کو بھی تو ایک سیہ فام نے بے راہ کر دیا تھا۔
کیا سفید کبوتر خوبصورت ہوتے ہیں یا سیاہ؟
کیا وہ یکساں نہیں ہوتے، خواہشات کے پیکر؟

اگر اپنے حُسن شاداب کے مقابلے میں تجھے کوئی حُسن متاثر نہیں کر سکتا
تو آہ پھر افسوس ہے میرے حال پر!
دنیا کی آگ تیری سرد مہری کو گرما نہیں سکتی،
اور آہ نے آن تو اپنا آپ محبوب ہے۔

تاہم ایک دفعہ آہ ایک دفعہ! دنیا جہان کو بھول کر
اس میری دنیا میں تو محصور ہو گیا تھا،
وہ راتیں آہ وہ راتیں کاش یہ کرۂ زمین ابدی تاریکی میں لڑھکا دیا جائے ——
جذبات کی عشرتِ ابدی کی غیر فانی راتیں تھیں۔
میرے نغمے پرندوں کی طرح تیرے آس پاس چہچہاتے تھے
اور صرف میری آواز کی موسیقی تیرے کانوں میں گونجتی تھی۔
اپنے آتشیں بوسوں سے تو میرے الفاظ کو جلا ڈالتا تھا
اور میرے بوسے تجھے اپنی آرزو سے زیادہ شیریں معلوم ہوتے تھے۔
میری تنگ آغوشیاں تیرے جامِ مسرت کو لبریز کر دیتی تھیں
اور محبت کے آخری مرحلے میں میں تجھے بہشت میں پہنچا دیتی تھی۔
پھر جب ہم مست و مدہوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف جھکتے تھے۔
اور پھر جب ہم تھک کر چور ہو جاتے تھے،

یہاں تک کہ محبت آدھی رہ جاتی تھی
دنیا اور زندگی آدھی رہ جاتی تھی مگر بہشت حاصل ہو چکی تھی۔

اور اب اے سسلی کی لڑکیو ــــ اے میرے دل،
آہ میں کیوں سسلی سے اتنی دور پیدا ہوئی!ــــ
اے سسلی کی لڑکیو، میری بات توجہ سے سنو،
تم سحر کن نسیم سے اور بے وفائی سے ہوشیار رہنا،
اُن الفاظ سے ہوشیار رہنا جو کبھی میری ملکیت تھے،
عشق کے ثمروں سے اور غم کے بیجوں سے،
اے سسلی کے حسین سمندر پر بسنے والے محبوب!
اب سیفو تجھے بلاتی ہے، اس کی تسکین خاطر کے لئے آ!

کیا اب بھی دولت مجھ بدبخت کا تعاقب کرے گی،
مصیبت انگیز بھیڑیے ساتھ لے کر تا عمر میرا تعاقب کرے گی؟
جب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں غم میرے حصے میں
آچکا تھا،
میرے ماں باپ کی خاک میرے آنسوؤں سے نمناک تھی۔
میرا بھائی تمام مخالف زندگی سے دست بردار ہو گیا
اُس ایک ناسزا تحفے کے لئے جسے زر کہتے ہیں،
ایک غم کے بعد دوسرا غم آتا ہے، اور آج کے بدبخت دن
ایک دودھ پیتی بچی میری آغوش میں ہے۔
اے میری تقدیر! تو اور کیا کر سکتی ہے، تو اب کس کوشش میں ہے!
فے آن! ہائے وہ آخری ہستی جسے میں جانتی ہوں۔
اے میری تقدیر! جو اب ملول ہے اور کبھی ہنستی تھی۔
میری ارغوانی قبا پر سیاہ نقاب ڈال دے۔
میری زلفیں اب وہ زلفیں نہیں۔
نہ اب وہ ہوا کو مصر کے پھولوں کی خوشبو سے معطر کرتی ہیں۔
سونے کے وہ تار جو ان حسین لٹوں میں گندھے رہتے تھے۔
اب ان کو چھوڑ گئے ہیں تاکہ ہوا انہیں اڑائے۔
عشق کے سب ہنر میرے تھے جب وہ میرے پاس تھا،
وہ جس کے شب و روز اب سسلی میں گزرتے ہیں۔

فے آن! جب میں پیدا ہوئی تو تین عارفوں نے
مجھ پر نگاہ کرنے کے لئے افروڈائٹ کو بلایا
اُس نے میری طرف سے مڑ کر تجھے آواز دی۔
کہ تُو آئے اور میری قسمت بنے اور میرے خوابوں اور میری
بیداریوں کو بھرپور کرے۔
تو جس کے لئے آرورا کی نگاہ سیفالوس سے ہٹ جائے
یا جس پر سنتھیا رات کی مرمریں سرامی میں سے شراب انڈیل
کر نیند طاری کر دے۔
اور انڈیمین کو تیری بھیڑوں کی پاسبانی سپرد کر دے۔

دیکھنا! لکھتے لکھتے میں رونے لگی
اور کچھ مجھے سجھائی نہیں دیتا، مگر عشق،
جس پر ٹوٹے ہوئے لفظوں اور آنسوؤں کا ایک نیم نقاب
سا پڑا ہے۔

تم، تم! جو مجھے ایک بوسہ یا ایک آنسو یا ایک لفظ اپنی یادگار
دیئے بغیر رخصت ہو گئے،
آہ، فریب تمہاری اس خاموشی سے کم بے رحمی کا حامل ہوتا،
تم جو کتنی ہی دفعہ جھوٹ موٹ مسکرا دیئے ہو گے کیا تمہارے
پاس کہنے کے لئے ایک جھوٹا کلمہ نہیں تھا ــــ
تم جو اکثر جھوٹی کہانیاں کہا کرتے تھے ــــ
کیا رخصت کے وقت ایک بات بھی تمہاری زبان سے نکل
نہ سکتی تھی،
تم کہتے "رخصت اے محبوب!" یا بس "رخصت!"

جب تم مجھ سے جدا ہوئے میرے پاس تمہیں دینے کے لئے
کوئی تحفہ نہ تھا،
اور جو تحفے تم نے مجھے دیئے تھے وہ خطائیں تھیں اور عیب،
آخری وقت میرے پاس تم سے کہنے کو کوئی بات نہ تھی،
مگر یہ کہ "زندگی کو نہ چھوڑو، مجھ کو نہ بھولو۔"
اور جب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتی تھی کہ تم چلے گئے۔

تو غم سے میں پتھر کے مانند ہو جاتی تھی۔
خاموش، جیسے میں کبھی بولی ہی نہیں
بے حس و حرکت، کھوئی ہوئی، تنہا، بے بس۔
ایک آہ میرے منہ سے نہ نکلتی تھی اور ایک آنسو میری آنکھوں سے نہ ٹپکتا تھا
غم، بے حساب غم مجھے گنگ کر دیتا تھا۔
پھر میں اٹھتی تھی جیسے کوئی مرکر دوبارہ اٹھتا ہے۔
میری روح آگے بڑھتی تھی جیسے کوئی قتل کرنے کے لئے بڑھتا ہے،
میرے سارے جسم کو چھیدتی اور زخمی کرتی،
دیوتاؤں، لمحوں اور سالوں پر لعنت بھیجتی،
کبھی طوفان بھرے بادلوں کی طرح جس میں بجلیاں چمکتی ہوں،
کبھی برس کر پھر آنسو بن جاتی ہوئی۔
رسوائی کا احساس دل میں لئے ہوئے جب میرا بھائی آتا ہے
اور میرے غم کی ہنسی اڑاتا ہوا میری بچی کی طرف حقارت کے ساتھ انگلی اٹھاتا ہے
تو دیوانگی مجھ پر اس طرح حملہ کرتی ہے جس طرح آگ تنکوں سے لپٹتی ہے۔
اور تم رسوا ہوتے ہو تو میں بھی رسوا ہوتی ہوں۔

آہ! مگر رات کے وقت،
رات کے وقت میں تمہارے پاس ہوتی ہوں۔
خواب میں ہمارے جسم اس طرح ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتے ہیں جیسے شعلے سے شعلہ،
خواب میں پھر تمہاری باہیں میرے گرد حمائل ہوتی ہیں،
میں تمہاری روح سے لذت اندوز ہوتی ہوں اور مجھے وہ مسرت حاصل ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

آہ، مگر رات کے بعد جب دن آتا ہے
تو میرا ویران اور اجاڑ دل مجھے مرغزار میں لے جاتا ہے
کہ میں اُن مقامات کو ڈھونڈوں جو میری کھوئی ہوئی عشرتوں کی یادگار ہیں۔
آہ پہاڑ کی وہ اوٹ جو اب کبھی ہماری پردہ داری نہ کرے گی۔

یہ ہے وہ گھاس جسے اعمال محبت میں ہم نے روندا تھا۔
جب ہمارے لب و اعضا ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے،
آج میں اس زمین کو چومتی ہوں۔
بوٹیاں مرجھا گئی ہیں اور پرندے خاموش ہیں
اور درخت خزاں سے بے برگ و بار ہو چکے ہیں۔
رات دن کو آلیتی ہے اور درختوں کے جھنڈ پر چھا جاتی ہے
صرف بلبل نالے کرنے کے لئے باقی رہ گئی ہے،
وہ اُس لے میں نوحے گاتی ہے جو غم کو پسند ہے
وہ ٹیریس کو بلاتی ہے اور میں فے آن کو۔

---

(۲)

ایک بہار ایسی بھی ہوتی ہے جس کے ٹھنڈے پانیوں میں سے ریت چاندی کی طرح سفید نظر آتی ہے، صاف جیسے ہوا میں سے نظر آئے۔
ایک بہار ایسی بھی ہوتی ہے جس کے آئینے پر
کنول چمن کے ایک خوبصورت کنج کی طرح کھلتا ہے۔
جب میں یہاں پڑی رو رہی تھی ایک روح میرے سامنے آکھڑی ہوئی
جو پانی سے پیدا ہوئی تھی۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا:
"سیفو، محبت کی دیوانی، غم تیرا دیوانہ ہے،
سیفو، نیلے لیوکیڈین سمندر کے کنارے
ایک چٹان ہے، اور وہاں، فاروں کے اوپر،
جن کی گونج اپالو کے مندر تک پہنچتی ہے،
اور نیچے نیلے سمندر اور لڑکھڑاتی ہوئی موجوں تک جاتی ہے
عشاق کو نیند آجاتی ہے اور پھر وہ محبت کے خواب نہیں دیکھتے۔
ڈیوکیلین نے پراہ کی بے وفائی سے یہیں پناہ لی تھی،
سیفو اٹھ اور جہاں پہاڑیوں کی بلندیاں سیدھی نیچے کو آتی ہیں

اپنا جسم، جو پیدا نہ ہوتا تو بہتر تھا،
لہروں کے حوالے کر دے نیلی نیلی پکارتی ہوئی موجوں کے حوالے۔
میں اٹھتی ہوں، اور خاموشی سے روتی ہوئی روانہ ہو جاتی ہوں،
میں بہت ڈرتی ہوں، مگر ڈر سے زیادہ میری محبت ہے۔
اس محبت سے تو ویرانی اور خلا بہتر،
اور فے آن سے تو نیلی لہریں زیادہ شفیق اور رحمل ہیں۔

اے ساز گار ہوا، آج میرا دھیان رکھنا،
اے عشق، اپنے پر مجھے مستعار دے کہ سمندر کو عبور کر سکوں
اور وہاں جہاں اے فیبس تیرا مندر ہے
میں اس تحریر کے ساتھ اپنا رباب ڈال دوں گی۔
"سیفو اپنا رباب فیبس کی نذر کرتی ہے،
تحفہ دیوتا کے لئے، آگ آگ کے لئے!"

---

(۳)

افسوس، افسوس ہے مجھ پر۔
مگر کیا مجھے فیبس کے آستانے پر جانا سزاوار ہے؟
اور فے آن، فیبس میرے لئے فے آن سے کہتر ہے ——
کیا تو مجھے یوں پستی میں گرا دے گا
شکستہ و ریختہ، اور یہ ظالم چٹانیں میرے سینے کے پرخچے اڑائیں گی
اُس برباد شدہ سینے کے جس نے تجھ سے محبت کی ہے؟
آہ! وہ نغمہ، جسے موسیقی کی پریوں نے جنا
مجھے چھوڑ رہا ہے اور میرا رباب خاموش ہو گیا ہے،
وہ اب میری دوست نہیں ہیں،
اور اس تاریکی میں آسمانی آگ بھی خاموش ہو رہی ہے۔

رخصت اے لزباس کی لڑکیو، رخصت!
اب یہ کنج میرے نغموں کا جواب نہیں دیں گے، میری آواز سے نہیں گونجیں گے
اب یہ ہاتھ عشق اور زندگی کا راگ سنانے کے لئے کبھی بیدار نہ ہوں گے۔
یہ فے آن کی ملکیت ہیں،
اور وہ بھاگ گیا ہے۔
اے شگفتگی و شادابی واپس آ،
ایک دفعہ پھر میری روح کو پھر اُسی پہلی سی مسرت کے ساتھ گانے دے،
ایک دفعہ پھر اُسی بھڑکتی ہوئی آگ سے اس دل کو لذت یاب کر
اے دیوتاؤ کیا اب کوئی دعا قبول نہ ہوگی۔

کیا اُسے کوئی گیت واپس نہیں لا سکتا جو کھو گیا،
کیا اُسے کوئی آہ واپس نہیں لا سکتی جو کھو گیا،
میرا محبوب، میری زندگی، میری کل کائنات؟

آ جا! آ جا!
اپنا بادبان ہوا میں بلند کر دے،
عرصۂ بحر کو عبور کر اور وقت کو میرے لئے لوٹا کے لے آ،
اے اس ہوا کو تیرے لئے ساز گار کر دے گا۔
وہی سیدھی راہ ہے جس طرف افروڈائٹ رہنمائی کرتی ہے۔
اُس افق سے اپنا سفید بادبان بلند کر
جہاں آسمان نفاق ڈالنے والے سیاہ سمندروں کو الگ الگ کرتا ہے۔
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو وہ نیلی گہرائیاں
جن کو کبھی ڈیوسکیلین نے اپنا مامن بنایا تھا، اسی طرح تاریک رہیں گی،
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو یہ موجیں
یا مجھے موت دیں گی، یا فراموشی اگر میں زندہ رہی۔

منصور احمد

سیفو کے چند اشعار

مضمون ختم کر چکنے کے بعد بلا ارادہ سیفو کا کچھ کلام اردو اشعار میں منتقل ہو گیا ہے۔ اب اسے کسی آئندہ اشاعت کے لئے مؤخر کرنا موزوں معلوم نہیں ہوتا اس لئے یہیں ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پیشین گوئی

ہماری زندگی کے بعد شاید — کوئی فصلِ بہار آئے گی ایسی
اٹھے گی اک صدائے بازگشت اور — ہمارے گیت اک دنیا سنے گی

دوست

اے دوست نگاہ اُٹھاؤ — آنکھوں میں آنکھیں ڈالو
اس راہ سے دل میں اترو — تن من کو حسین بنا دو

خوبی

خوب ہے جو حسیں ہوا — بُت ہوا نازنیں ہوا
جو نہ حسیں ہوا مگر — خوب ہوا حسیں ہوا

بندِ عشق

اب مجھ کو گرفتارِ محبت نے کیا ہے — سر تا بہ قدم خوف سے میں کانپ گئی ہوں
تلخی ہے تو شیریں ہے ستم ہے تو مروت — اس راحتِ جاں سوز کو میں بھانپ گئی ہوں

ایک زمانہ

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے
ایک زمانے میں جس کو اب مدت ہی گزری ہے

طوفان

جب عشق کے آثار نظر آتے ہیں اس طرح یہ جسم و روح گھبراتے ہیں
طوفان میں جس طرح ہوا کے اندر اشجار کہستان کے تھرّاتے ہیں

شام

بچے ماؤں کی گودوں میں بھیڑیں اپنے گلوں میں
بکری بکری والے کے پاس لال شفق میں پرند اداس
حورِ سحر نے بکھیری ہے زرّیں ہاتھوں سے جو جو شے
تو اُس پر چھائی ہے اے شام
جادو ہے تیرا کتنا عام

نیند

کالی کالی آنکھوں والی نیند رات کی بیٹی

منصور احمد

رُوحِ استبداد کا فرمان

ہاں اے مرے ذی ہوش و فسوں کار سپوتو
جاگے ہوئے محکوم دماغوں کو سُلا دو

تہذیب کے جادو سے ہر اک پیر و جواں کو
اپنی روشِ عام کا نقّال بنا دو

چلتی ہیں جن افکار سے اقوام کی نبضیں
ذہنوں میں اُن افکار کی بنیاد ہلا دو

جو قفل سکھاتا ہے زبانوں کو خموشی
وہ قفلِ خطابات زبانوں پہ لگا دو

حاصل ہو جو پبلک کے اداروں کی صدارت
چندہ تو نہ دو صرف ترقی کی دعا دو

اوروں کو جو روزی سے لگانے پہ مصر ہے
چپ کرنے کی خاطر اُسے روزی سے لگا دو

جو عدل و مساوات کا ہو خاص منادی
چپکے سے اُسے عدل کی کرسی پہ بٹھا دو

اس خاص رعایت پہ بھی وہ سرکش و باغی
بیٹھے نہ جو کرسی پہ تو سر تن سے اُڑا دو

پہلے تو ہر اک رہرو آزاد کو ٹوکو
مانے نہ اگر بات تو زنجیر پنہا دو

حل جاتا ہے جس آگ سے ظالم کا کلیجہ
اُس آگ کو مظلوم کے سینے میں گھسا دو

اور آگ اگر بجھ نہ سکے آب رسا سے
جلتے ہوئے سینوں کو تہِ خاک چھپا دو

محکوم کو دو فکر و تامل کی نہ فرصت
ہر فرد کو بے ہودہ مشاغل میں لگا دو

سچائی سے تامل نہ سکیں بزم کے ارکان
جو جھوٹ پہ مبنی ہے وہ تاریخ پڑھا دو

گھر آئیں جو باد دل کی طرح تند عناصر
آپس ہی میں ان تند عناصر کو لڑا دو

دنیا میں پنپنے کے جو آئین سکھائے
کچھ دے کے اُسے دین کے دھندے میں لگا دو

جس مرغ کی پرواز ہے تا عرش معلّٰے
اس مرغ کو شہباز کے چنگل میں پھنسا دو

اوہام کے بندوں کے یہی دو تو ہیں دلال
پنڈت کو جو زنّار تو ملّا کو عبا دو

تحقیق سے تابندہ ہے جس ذہن کا میدان
اُس ذہن میں اک وہم کی دیوار اٹھا دو

بہتے ہوئے آنسو جو کریں رحم کی درخواست
پگھلے ہوئے الفاظ کا انبار لگا دو

چھیڑے کوئی کمزور اگر نغمۂ طاقت
اُس شخص کو تلوار کی جھنکار سنا دو

روٹی کا جو طالب ہو اُسے بھوک سے مارو
جو بھوک کا شاکی ہو اُسے زہر کھلا دو

پانی کا طلبگار ہو جس کھیت کا دہقان
اُس کھیت میں پانی کے عوض آگ لگا دو

سینے میں کھٹکتی ہے مرے جوش کی ہر سانس
اس شاعرِ گستاخ کو سولی پہ چڑھا دو

جوشؔ

پنجاب کا اوّلیں اردو ماہنامہ

پچھلے سال اردو سبھا کی سرپرستی میں راقم نے قدیم اردو اخبارات سے متعلق لکچروں کا ایک سلسلہ ختم کیا تھا جو مجموعی صورت میں اورنگ آباد کے مشہور رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۳۵ء میں آب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ آج میں پنجاب کے اوّلیں ماہ نامہ سے متعلق اپنی تحقیقات ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں میں نے احتیاط کی نظر سے اوپر کے عنوان میں اردو کا لفظ بڑھا دیا ہے ورنہ میری تلاش میں اس وقت تک پنجاب سے کسی اور دیسی زبان کا (دیسی کا لفظ بھی احتیاطاً استعمال کیا گیا ہے) رسالہ نہیں نکلا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۷ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور میں آکر مطبع کوہ نور اور اخبار کوہ نور جاری کیا۔ اردو کے اسی ہندو بزرگ نے جنوری ۱۸۵۶ء سے پنجاب میں پہلا ماہنامہ یعنی رسالہ جاری کیا۔ اس کا نام خورشید پنجاب تھا۔ اس کی تقطیع ۲۱×۱۷ انچ۔ ضخامت عموماً پچاس صفحے ہوا کرتی تھی۔ ہر صفحہ دو کالموں پر منقسم تھا۔ سالانہ قیمت چار روپے اور ڈاک کا محصول بارہ آنے تھا۔ اُس زمانے میں رسالہ کا لفظ کم ضخامت کی کتابوں کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا جیسے "رسالہ عبدالواسع ہانسوی" صاحب خورشید پنجاب اپنے رسالے کو کتاب کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ خورشید پنجاب کی سب سے پہلی اشاعت کی پشت پر یہ عبارت درج ہے:۔

"واضح ہو کہ درصورت روانہ کرنے اس کتاب کے بہ صیغہ بیرنگ شائقین کو فی کتاب ۲ر دینے پڑتے اس واسطے بہ صیغہ پوسپیڈ روانہ کی جاتی ہے . . ."

اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں ڈاک خانے کا ضابطہ ایسا تھا کہ اس رسالے کی روانگی ایک آنہ کے ٹکٹ سے ہوتی تھی۔

راقم کے کتب خانے میں اس رسالے کی پہلی جلد موجود ہے۔ یہ رسالہ کب بند ہوا اس کا حال معلوم نہیں۔ اس واقفیت کے بعد اب اس رسالے کے مندرجات ملاحظہ ہوں۔

اردو رسالوں کے بارے میں پنجاب ہندوستان کے ہر صوبے سے بازی لے گیا ہے۔ اس امر واقعہ سے سب کو اقرار ہے اس لئے یہ معلوم کرنا کہ پنجاب کے اولیں ماہ نامے میں کیا کچھ ہوا کرتا تھا صحافت کے محقق اور خواندہ پبلک کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جلد اوّل کے مندرجات ملاحظہ ہوں:۔

"تمہید
خیالات متعلق زبان اردو
اخلاق
اقوال حکما
لطائف وظرائف
حال طریقہ تعلیم
تواریخ
خیالات نسبت کرۂ ہوائی
احکام سرکلر ڈائجسٹ بھریہ گورنمنٹ مغربی"

اب کہیں کہیں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں

تمہید میں منشی ہرسکھ رائے خورشید پنجاب کی وجہ اشاعت اس طرح لکھتے ہیں:۔

"واجب یہ ہے کہ سب سے پہلے سبب طلوع اور وجہ سیدوع اس خورشید پنجاب کا ظاہر کیا جائے جس سے وقیعہ سنجان حقیقت آگاہ کو واضح ہو کہ شیوع اس خورشید سے کیا مقصود ہے۔ سو گزارش کیا جاتا ہے کہ غرض اصلی اجرائے اس نحوۂ دلپذیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبان اردو کا رواج ابھی اچھی طرح نہیں ہوا ہے اور بسبب اس کے کہ فی زمانہ زبان اردو کو بدرجہ غایت اقتدار ہے دفاتر سرکاری میں بھی اُسی کا ہی رواج ہے سنتے و سمجھتے میں بھی اُس کو لطیف سمجھتے ہیں۔ چال چلن میں بھی اُس کی فصاحت پر توجہ فرماتے ہیں اردو دفاتر سرکاری کے ملازمین بعض بعض ایسے ہیں کہ تنگی معاش کے باعث مکتب سے اٹھتے ہی تلاش نوکری میں مصروف

ہوگئے اور نوکری بہم پہنچا کر تعلیم آئندہ سے محروم ہو رہے ہیں . . .
سو اس میں اکثر ایسے مضامین درج ہوا کریں گے کہ جن سے زبان اردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہوگی اور اس زبان کے شائقوں کو نفع خاطر خواہ آئین ہمیں حاصل ہوگا اور پنجاب کے شرفا طالب علموں کو اس سے مدد کافی ملے گی اور عملگان کچہریوں سرکاری کو اس کے مطالعہ سے ترقی علوم و فنون و ہنر کا سرشتہ ہوگی۔ آئین اور قانون سے واقفیت بہم پہنچے گی اور ان کی طبیعت کو علوم کی طرف توجہ ہوگی یعنی علاوہ کارسرکار کے دے یہ بھی جانیں گے کہ جغرافیہ تواریخ ہیئت ہندسہ حساب وغیرہ کیا شے ہوتی ہے اور اس سے کیا نفع حاصل ہوتا ہے . . . "

آگے چل کر ان موضوعوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو رسالے میں ہوا کریں گے۔ تفصیل اور تشریح کو طوالت کے خوف سے چھوڑ کر محض وہ عنوانات نیچے دیے جاتے ہیں:۔

طریقۂ تعلیم۔ تہذیب اخلاق۔ تہذیب رسم و عادات نیک۔ بحث علمی بحث قانونی۔ علم طبیعی۔ تجارت۔ عمارات و انہار۔ ریاست ریعتی دیسی۔ تاریخ جغرافیہ تواریخ۔ لطائف و ظرائف۔ طلسمات۔ اور اور جو جو مراتب مفید عام ہوں گے بیان کئے جاویں گے۔"

پنڈت رادھا رام صاحب طوطہ منشی مطبع کوہ نور لاہور نے ۲۹ شوال کی ایک فارسی نظم میں اس مصرعہ سے خورشید پنجاب کے شیوع کی تاریخ نکالی:۔

ہماں افروز شد خورشید پنجاب

سنہ ۱۸۵۶ء

اور میاں نظام شاہ صاحب تاجر پشمینہ جنت نظیر خطہ کشمیر نے بھی اس تاریخی موقع پر ایک قطعہ تاریخ لکھا۔ جو مختصر ہونے کی وجہ سے درج کیا جاتا ہے:۔

چند اطبع بیاضی کز صفائے صفحہ اش
مہر انور چوں سہا شد محو در بین السطور
از زلال معنی پاکیزہ نہر جد وش
آب حیواں چشمہ فیض است و ہم دریائے نور
شد بجا خورشید پنجابش لقب چوں یافتند
نکتہ سنجاں مطلعش لاہور و مطبع کوہ نور

انہ پے تاریخ طبعش انجمن آرا شدند
یک بیک اجرام علوی در فلک افگندہ شور
نور سال ہجری از مطبع عطارد جوش زد
جلوۂ خورشید پنجاب آمدہ۔ گفت از سرور

سنہ ۱۲۷۲ھ

پاکشیدہ زہرہ رقصاں گفت از سمت دگر
جلوہ گر خورشید پنجاب از صفائے کوہ نور

سنہ ۱۹ بکرمی

باسر بہجت میان جمع آمد ماہ و گفت
جلوہ گر خورشید پنجاب از سواد کوہ نور

سنہ ۱۸۵۶ء

جو ہندو مسلمان اردو ہندی کے قضیہ کو ملی رنگ میں ڈوب دینا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ انکشاف سبق آموز ہے کہ پنجاب میں اولین اخبار اور رسالہ نکالنے والا ایک ہندو تھا اور تمام دنیا میں پہلا اردو رسالہ نکالنے والا بھی ایک ہندو تھا۔ اس وقت کے بوڑھے ان بزرگوں کی نبیرگی کی حیثیت سے آگے نہیں گئے ہیں اور یہ ملک کا قانون ہے کہ ایک مکسوبہ جائیداد تیسری پشت میں جا کر جدی جائداد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے قابلیت اور اکثریت کے سراب سے بچ کر یہ امر ثابت ہے کہ اردو کی صحافت کے بارے میں ہندوؤں کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی ایک موروثی جائداد سے متعلق مشترکہ خاندان کے ایک فرد کی۔ حال کے افراتفری کے زمانے میں کبھی کبھی کوئی مجھ سے کہہ جاتا ہے کہ ہندوؤں کے جذبات کے زیر اثر اردو کو چھوڑ کر ہندی کو لے رہے ہیں۔ یہ اطلاع کہاں تک واقعی ہے اس کی جانچ کا میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ بہر حال اردو کے رسالوں اور خاص کر ادبی رسالوں کا اور ان میں زمانے کا جہاں تک تعلق ہے اس خبر کی تصدیق نہیں ہوتی منشی پریم چند کا معاملہ اس قضیہ سے جدا ہے۔ بہر حال اس بارے میں خوف کا موقع مجھے تو نظر نہیں آتا۔ یہ سب مانتے ہیں کہ ہندو دور اندیشی اور معاملہ فہمی میں کسی سے کم نہیں۔ پھر اس غیر مطلوبہ ترک کا امکان کیا معنی۔ خیریات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ بہر حال اردو صحافت اور خاص کر ماہانہ صحافت میں دہلی اور پنجاب کا جہاں تک تعلق ہے ہندو اس فن لطیف کے بانی اور پیشرو ہیں وہ روایت پرست اور قدامت پرست ہیں یہ ان کو اور سب کو یاد رکھنا چاہئے۔ اب خورشید پنجاب کی کتھا سنئے۔

سر سپرو اور سر اقبال یہ معلوم کر کے نہایت خوش اور مسرور ہوں گے کہ پنجاب کے اولیں ماہنامہ کا خیر مقدم کرنے والے اُن کے ہم خطہ اور ہم فرقہ تھے اب دیکھیں اس رسالے میں ہے کیا؟

پنجاب میں انگریزی تسلط کو چھ سات ہی برس ہوئے تھے اس کا اور اس سے ماقبل عزل و نصب کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

غرضکہ آسان تر طریق تعلیم ایک قوم کا دوسری قوم سے یہ ہے کہ دونوں قوم آپس میں ملیں۔ اکثر یہ تخیلہ آئی سے حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ تاریخ سے واضح ہے کہ جب خطہ یونان پر رومیہ کبریٰ کی بادشاہت ہوئی تو رومی جہل سے نکل کر یونان کی علم و ہنر سے بہرہ یاب ہوئے۔ اسی طرح جب تک روم کی سلطنت کو فروغ رہا تو جو جو ملک اُس میں شامل ہوتے گئے اُن میں کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی رہی"

طریقۂ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے پرانے مکتب اور نئے مدرسے کے موازنہ میں لکھتے ہیں:-

"فارسی طالب علم نے جب معلم کو دیکھا تو اُس کو ملک الموت سمجھا۔ انگریزی طالب علم کو یہاں استاد نظر پڑا وہ خوش ہو گیا اور ادب اور محبت سے پیش آیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں جبر ہوتا ہے یہاں شوق۔ وہاں اس ترکیب سے تعلیم دی جاتی ہے کہ جس میں لڑکے کی طبیعت گھبرا دے اور اس کو نفرت ہو اور سمجھ میں خاک نہ آوے۔ یہاں اس ڈھنگ سے تربیت ہوتی ہے کہ لڑکے کا دل ایسا خوش ہو کہ اس کو کھیل سے بھی اچھا جانے . . ."

غالباً منشی ہر سکھ رائے کا مطمح نظر یہ ہو گا کہ نئی حکومت نے جو نئے طرز کے مدرسے جاری کئے تھے وہ عام پسند اور ہر دلعزیز ہوں یا خود حکومت نئے سکولوں کو اس طرز پر چلانا چاہتی تھی کہ پرانے مکتب خود ہی مدھم پڑ جائیں یہ کچھ ہی ہو بعد میں وہ کیفیت نہ رہی جس کا راگ اقتباس صدر میں گایا گیا ہے، لاہور کے گورنمنٹ کالج کے دو استادوں کا ذکر اس ضمن میں بے جا نہ ہو گا یعنی پروفیسر محمد حسین آزاد اور پروفیسر بچارام۔ اتفاق سے یہ دونوں بزرگ دہلی کے تھے۔ لیکن دونوں کے کلاس کے برتاؤ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آزاد مرحوم کو جو محبت اپنے شاگردوں سے اور ان کو اپنے شفیق استاد سے تھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات مشہور تھی کہ ڈی۔ ای۔ وی۔ کالج لاہور کے بزرگ پرنسپل ہنسراج کو کالج کے حدود میں کسی نے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں سمجھئے زمانہ بدلتا رہتا ہے۔

تواریخ کے عنوان کے تحت صوبہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد کے تازہ کوائف درج ہیں۔ یہ تذکرہ منشی ہر سکھ رائے کے لئے بالطبع تھا کیونکہ ان کا مکاس مضافات دہلی سے ہوا۔

"خیالات نسبت کرہ ہوائی" ایک سائنٹیفک موضوع ہے۔ اس وقت کی علمی واقفیت کے لحاظ سے یہ مضمون قابل توصیف ہے۔ لکھتے ہیں:-

"یہ جو بخار اور مخ بے انتہا خوبیوں کی ہے یعنی اول تو ہر کب جسم انسان اوسط اندام کے اوپر تخمیناً ۱۵ پونڈ بوجھ ہوا کا پڑتا ہے۔ مگر کیا اُس کی قدرت ہے کہ انسان کو ایک رائی کے برابر بھی یہ بوجھ معلوم نہیں پڑتا . . . اگر خلا ممکن ہو دے تو انسان سے ایک قدم بھی نہ سرکا جاوے۔ اور ایک لمحہ میں رشتہ حیات کا ٹوٹ جاوے . . ."

اس وقت حکومت نئی تھی۔ صوبہ کے قوانین اور ضابطے مرتب نہ ہوئے تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی افسر اور اکثر عمال اضلاع آئین سے (صوبہ مغربی و شمالی جسے آج کل یو۔پی کہتے ہیں) آئے تھے۔ وہ وہیں کا ضابطہ ساتھ لائے۔ اسی وجہ سے وہاں کے سرکلر اور قوانین وغیرہ کا اعلان خورشید پنجاب میں واقفیت عامہ کے لئے ہوا کرتا تھا۔

اس کے ساتھ خورشید پنجاب کا پہلا نمبر یعنی بابت جنوری ۱۸۵۶ء ختم ہوتا ہے۔

فروری ۱۸۵۶ء کے مندرجات حسب ذیل ہیں:- (۱) نوع انسان میں شریف تر کون ہے؟ مرد یا عورت؟ (۲) سراج العلم (۳) کیفیت ڈاک بجلی (۴) تتمہ خیالات متعلق زبان اردو (۵) اخلاق (۶) تاریخ (۷) تتمہ خیالات متعلق کرہ ہوائی (۸) پیدا وار ملک (۹) سوالات قانونی (۱۰) احکام و سرکلر وایکٹ مجریہ گورنمنٹ مغربی۔

آج کل کے صوبہ میں زنانی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور قریباً ہر شہر میں کوئی نہ کوئی عورتوں کی انجمن یا استری سماج قائم ہے۔ عورتیں اپنے حقوق اور مرتبے سے متعلق مردوں سے مساوات کا مطالبہ پیش کرتی ہیں۔ حفظ تولید کا موضوع ہر شخص کی زبان پر ہے۔ جن جماعتوں میں طلاق کا رواج نہیں ان میں طلاق کے اجراء کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ عام کشش ہوتی ہیں کہ ایک قوم کا مستقبل عورت کے ہاتھ میں ہے۔ القصہ اس ماحول میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اب سے اسّی برس پہلے عورت ذات کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات تھے اور اس بارے میں پنجاب کا اولیں رسالہ کیا رائے رکھتا ہے۔ موضوع رکھا ہے "نوع انسان میں شریف تر

کون ہے؟ مرد یا عورت؟

عورت کے متعلق بعض رائیں لکھ کر کہتے ہیں:۔

"لیکن دلائل کے تولنے پر بہتر یہ بات معلوم ہوئی کہ اس معاملہ میں رائے ندی جادے تو بہتر ہوتا کہ نہ تو مردوں کو احتمال اپنی کمتری کے اظہار کا ہوگا اور نہ احتمال مستورات کے خفا کرنے کا ہوگا اور یہ بات مشہور ہے کہ مستورات کا خفا کر دینا آسان ہے اور اُن کا منانا مشکل..."

پھر کہتے ہیں:۔

"کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو کہ مرد کی نسبت عورت میں فائق درجہ پر نہیں پائی جاتی ہے جسم کی خوبیوں میں کہ جن میں سب سے اچھی شے حُسن ہے مرد بالکل مار گئے ہیں اور نفس ناطق کی خوبیوں میں بھی مرد عورتوں پر کچھ فوق نہیں لی جا سکتے... عورتیں مردوں کی نسبت عموماً نیک کام زیادہ کرتی ہیں... یہ بات مانی ہوئی ہے کہ مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ رحیم اور وفادار اور زیادہ خیر کی طرف متوجہ ہیں اور پارسائی اُن میں یہ مرتبہ مردوں سے زیادہ ہے..."

خاتمہ اس مضمون کا اس طرح ہوتا ہے:۔

"... پس مقتضائے عقل یہ ہے کہ حق الوسع عورت کی قدر اور فکر آسائش کرنی چاہئے اور جو شخص اس طرح پر عمل کرے گا یقین ہے کہ وہ خود بھی عورت کی طرف سے خوش رہے گا..."

سراج العلوم والے مضمون کو انہوں نے دو شقوں یعنی (۱) علوم (۲) فنون پر تقسیم کیا ہے۔ علوم میں علم معانی۔ علم بیان۔ علم بدیع۔ علم عروض وقوافی۔ علم طریقت۔ علم طب۔ علم حساب۔ علم ہیئت۔ علم جر ثقیل۔ علم حکمت علم طبیعات۔ علم منطق۔ علم مناظرہ۔ علم کیمیا وغیرہ کو جگہ دی ہے اور فنون میں "فن بلاغت۔ فن ادیباں و اتا یقاں۔ فن کاشتکاران۔ فن بلیع فن ارباب رزم۔ فن مصوراں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ آج کل کے پڑھنے والے کو اس تقسیم کے بہت سے اجزا سے اختلاف ہوگا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ اُس وقت یہ اور اس قسم کی باتیں فارسی میں ہوا کرتی تھیں اردو ان سے محروم تھی۔

"کیفیت ڈاک بجلی" یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ تار برقی یا ٹیلیگراف جسے آج کل "قاہرہ کے تتبع میں تلغراف لکھنا بعض اہل صحافت کا مذہب ہو گیا ہے۔ اُس زمانے میں نئی کیا عجوبہ چیز تھی۔ اس لئے صاحب خورشید پنجاب نے اس موضوع کو اپنے دوسرے نمبر کے لئے انتخاب کیا۔ چونکہ اس میں ایک بجلی کے تار کے ذریعے خبر آتی ہے اس لئے اسے ڈاک بجلی کہا گیا اس مضمون میں تار برقی کے آلات کی کئی تصویریں اور نقشے بھی دیئے ہیں۔

بجلی کی قوت اور خاص کہربائیہ کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ کیمی کو اب تک نہیں معلوم ہوا ہے کہ مادہ بجلی کا کیا شے ہے اور اُس کی اصل ماہیت کیا ہے لیکن حکما یونان اور فرانس اور انگلس نے اُس کی بعض بعض قوتیں اور خاصیتیں اور راہ پیدا کرنے کی راہیں دریافت کر کے اُس سے بہت بہت سے مفید مطلب نکالے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ کہربائی یعنی قوت بجلی ایک سیال نہایت لطیف جمیع اجسام میں بتقادیر مختلفہ پھیلی ہوئی ہے اور اُس کے چند وصف مخصوص ہیں جن کا آگے بیان آوے گا۔ اس کہربائی سے حوادث عجیبہ مہتم بالشان ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اول ہی اول وجود کہربائی کا کسی جسم میں سوا جسم کہربا کے نہیں پایا گیا۔ چنانچہ یہ نام کہربائی بعینہ ترجمہ الیکٹریسیتی انگریزی لغت کا ہے کیونکہ یہ لفظ الیکٹرون سے جس کو کہربا کہتے ہیں بنایا گیا ہے..."

بجلی کے پوزیٹو اور نگیٹو کو رجاجی اور رانجی لکھا ہے اور اس سے نفس معنی اخذ کر کے موجبہ اور سالبہ منطق کی دو اصطلاحوں کا کس خوبی سے اس ضمن میں استعمال کیا ہے۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ آج کل کے سائنس کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والے شعور ادبی کا اس سے بہتر ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ اوپر کے اقتباس میں ایک مرکب مہتم بالشان استعمال ہوا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ اختراع علی گڑھ کے تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کا ہے۔ لیکن یہاں اس کا استعمال اس سے کہیں پہلے ہو چکا ہے جبکہ کوئی سے علی گڑھ بنا

ایک اور سائنٹفک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"تیزاب کی جس کی جہان میں اتنی قدر و قیمت ہے اور کرٹملے کی دونوں کی اصل ایک ہے پانی کے اجزا بکثرت ایسے ہیں کہ جو جلنے کے لائق ہیں۔ جتنے تیزاب ہیں ان کی ماہیت اور کرہ ہوائی کی ماہیت ایک ہے اور ایک خاص تیزاب بالکل اُسی اجزا سے بنا ہوا ہے کہ جن سے وہ ہوا بنی ہے کہ جس کے سبب سے تنفس کا سلسلہ جاری ہے اور وہ تیزاب ایسا ہے کہ اگر سخت سے سخت فولاد پر لگایا جاوے تو اس کو کھا جاتا ہے۔"

یہ وہی تیزاب ہے جس کے ایک ہیلن (سلنڈر) نے پھٹ کر

حال ہی میں مغلپورہ (لاہور) کے ریلوے ورکشاپ میں کئی جانیں لیں اور بیسیوں کو زخمی کیا۔ انگریزی لفظ آکسیجن کے استعمال سے بچ کر نفس مطلب کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ اس زمانے میں سائنس کی اتنی اہم واقفیت اور اس سہل اسلوب اور سلیس زبان میں اس کی شرح اور اشاعت داد سے مستغنی ہے۔ ہم کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

پیداوار ملک کی ذیل میں پھٹکڑی۔ اس کی تیاری کی ترکیب۔ اس کے خواص وغیرہ کا مفصل اور باتصویر ذکر ہے

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ پنجاب میں منشی ہرسکھ رائے کے اس اختراع نے اور صوبوں سے جہاں اردو کا رواج تھا معقول خراج تحسین وصول کیا۔ آگرہ کالج کے مدرس دوم "حضرت مولوی ابوالحسن صاحب" نے یہ خط منشی صاحب موصوف کو لکھا جو خورشید پنجاب مورخہ۔ ماہ مارچ ۱۸۵۶ء رجلد ۱ نمبر ۳ سے نقل کیا جاتا ہے:۔

"صاحب منہم کوہ نور سلامت۔ دیرینہ لاکہ رسالہ خورشید پنجاب باہتمام والاحسن ترتیب یافتہ دوست عزیزے بو دازو بگرفتم و سرپا پائش را بہ نظر اجمال دیدم۔ بے تکلف رسالہ نیکو ترکیب گرفتہ۔ والا ہمتی را آفریں باد کہ باتحمل اینہمہ مشاق کم ارزی را بر خود آسان کردہ اند چناں می نماید کہ در کنز زمانے خطہ ہند را مثل خورشید فرا گیرد . . ."

"الراقم ابوالحسن۔ آگرہ کالج ۲۳ فروری ۱۸۵۶ء"

اس رسالہ کے مارچ ۱۸۵۶ء کے نمبر کے مندرجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ فروری ۱۸۵۶ء کو آگرہ میں رائے بنگل کشور صاحب وکیل صدر کی کوٹھی میں ایک جلسہ ہوا جس میں شہر کے تعلیم یافتہ اور ذی رسوخ اصحاب کی بڑی تعداد شریک تھی۔ اس جلسہ میں قاضی صفدر علی صاحب نے حاضرین کو تحریر تار مخبر کہربائی کا دکھلایا۔ ایک ٹکڑا قاضی صاحب کی تقریر کا یہاں دیا جاتا ہے جو اس امر پر روشنی ڈالے گا کہ قاضی صاحب کو اہم علمی موضوع کی سہل اور سلیس زبان میں تشریح پر منشی ہرسکھ رائے صاحب سے کم قدرت حاصل نہ تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"صاحبو علم دو قسم کے ہیں اول وہ جس کو انسان بدوں مشاہدہ اور استعمال اجسام کے حاصل کر سکتا ہے اوس کو ریاضی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جس کا جاننا بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا کیونکہ فرض کرو ایک شخص پیدا ہوا اور اس نے کچھ بھی گرم و سرد زمانہ کا نہیں دیکھا فقط ایک اندھیرے کمرے میں رہتا ہے تو وہ اپنی عقل سے ریاضی کے اصول دریافت کر سکتا ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں مگر چونکہ اس نے اجسام کے تجربے نہیں کئے اس واسطے وہ نہیں جان سکتا کہ اگر تیزاب کو پانی میں ڈالیں تو اس سے کیا نتیجہ ہوگا اور اگر نمک ڈالیں تو وہ گھلے گا یا نہیں وہ علم جو تجربے پر منحصر ہے اس کی قسموں میں سے ایک قسم علم طبیعی ہے . . ."

اب اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ اب سے اسّی برس پیشتر کی انشا اور املا کی نسبت جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ راقم اپنے بسیط مضمون میں جو قدیم اخبارات سے متعلق ہے اول طبقہ کے اخبارات کی ذیل میں لکھ چکا ہے۔ جس کی اشاعت کا حالہ آگے اسی مضمون میں آچکا ہے۔ یہاں سرسری طور پر یہ کہنا ہے کہ انشا کا اسلوب وہی پرانا تھا۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان واؤ عطف اکثر استعمال ہوتا تھا جو باوجود ہر ہدایت اور تنبیہہ کے بعد میں استعمال ہوتا رہا اور آج کل بھی کم و بیش مستعمل ہے اور جس کی نسبت راقم کی یہ رائے ہے کہ یہ قید اٹھا دینی چاہئے۔ ذیا ذا ہندی کے حروف ربط میں سے ہے۔ یہ اور پھر یہ بات کہ اس سے کسی کا کلام یا احتیاط سے کہئے اکثر و بیشتر کا کلام نہیں بچا اس قید کے اڑا دینے کی دلیل ساطع ہے۔ گڈمڈ ترکیبیں جیسے عملگان گھیریوں سرکاری کو "ترقی علوم و فنون وہم (بھی) کا رسشتہ ہوگی"۔ "دے" جمع "دہ"۔ اور "یے" جمع "یہ"۔ "یہ ہوا محزن اور جمع ہے بے انتہا خوبیوں کی"۔ "کا" کے بدلے۔ اور "مادہ" "بکلی" وغیرہ جیسے کلمے اور فقرے اس ابتدائی ماہنامہ کے مضامین میں اکثر پائے گئے۔ املا کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ پائے معروف ۹۹ فی صدی موقعوں پر گول لکھی گئی ہے یہ طریق امتیازی پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو نے بھی اپنی زندگی کے بہت برس بعد اختیار کیا۔ نواعداد اردو جو ۱۸۷۲ء میں بک ڈپو کے سرکاری مطبع سے شائع ہوئی۔ اس میں ی کا یہ امتیاز غائب ہے۔ اس لئے یہ واقعہ مسلّم ہے کہ املا میں پائے معروف کو امتیازی شکل دینا یعنی گول لکھنا منشی ہرسکھ رائے کی جدت طرازی ہے جس کو اس وقت کل اردو دنیا اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس رسالہ کے نمبروں میں املا سے متعلق ایک بات یہ دیکھی گئی کہ دوچشمی ہ اس کے صفحات سے بالکل غائب ہے۔ استاد ذوق[1] کی ہائے کو ہائے دوچشمی سے کیا لکھتے[2]۔ ہائے خلط التلفظ بھی اس سے محروم رہی۔ پڑھنا کو پڑہنا

---

[1] استاد ذوق کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے۔

لئے رہے حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی ✦ لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

لڑائی کو لڑائی - ہر ایک کے بدلے فارسی کا ہر یک - ہو کی جگہ ہوتے وغیرہ کا استعمال اور اشارہ بعید میں واؤ کی ایزادی مثلاً اوس - اون یہ سب کچھ اُس وقت کے رواج اور دستور کے مطابق ہے جو آج کل اجنبی معلوم ہوگا۔

آخر میں یہ دکھانا پبلک کی واقفیت کے لئے مفید ہوگا کہ پنجاب کے ۵۰ نہ مول یعنی رسالوں میں اردو رسالوں کی کیا حیثیت ہے۔ جنوری ۱۹۳۲ء کے اعداد سے پایا جاتا ہے کہ پنجاب میں ۱۹۳۵ء کے اختتام پر ماہانہ رسالوں کی مجموعی تعداد ۳۴۵ تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

انگریزی - ۵۵

ورنیکولر (اردو - ہندی - گورمکھی) ۲۵۷

دو زبانوں کے	۱۴	۳۳
تین زبانوں کے	۱۲	
تین سے زیادہ زبانوں کے	۷	

اس ۳۳ و ۵۵ سے ہمیں سروکار نہیں - ورنیکولر کے ۲۵۷ ماہنامول میں اردو کے رسالوں کی تعداد ۱۵۳ دکھائی گئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰۴ دوسری ورنیکولر زبانوں کے رسالوں کے مقابلے میں ۱۵۳ ماہنامے اردو کے شائع ہوتے ہیں۔ ان اعداد کی بنا پر جو مستند ہیں پنجاب میں اردو رسالوں کی تعداد باقی ہر قسم کی زبانوں کے رسالوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اردو ماہنامول کی یہ تعداد، اور نیز استعدادی ترقی اسی برس کی مدت میں ہوئی اور جب یہ واقعہ نظر میں رہے کہ اولیں ماہنامہ اردو کا (خورشید پنجاب) تھا تو ماہانہ صحافت کے بارے میں اردو کا یہ کارنامہ مہتم بالشان حیثیت رکھتا ہے اور جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بلا لحاظ زبان کے پنجاب کا پہلا اخبار بھی اردو تھا یعنی کوہ نور جو ۱۸۵۰ء کے شروع سے جاری ہوا تو پنجاب میں اردو کی وقعت قدامت اور نیز عہد حاضر کے اعتبار سے سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہنے کی دلیری کرے کہ اردو پنجاب کے مدارس اور دفاتر سے رخصت کردی جائے یا یہ کہ اردو ایک خاص حصۂ آبادی سے تعلق رکھتی ہے تو ایسے موقع پر ایک ہندی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ہے ڈھٹائی۔

کیفی

ترانۂ عشق

جلوۂ گل بلبل کو بہت ہے — شمع کو گریۂ شام
بادِ بہاری گُل کو بہت ہے — مجھ کو تیرا نام

بجلی چمکے کالی گھٹا میں — جام میں آتشِ سرد
چمکے راکھ جوگی کی جٹا میں — مجھ میں تیرا درد

بل نہ چھٹے کالے بالوں سے — اور نے سے فریاد
پل بھر من نہ چھٹے کالوں سے — مجھ سے تیری یاد

شاخ پہ شعلۂ گل کی لپک ہو — چرخ پہ انجم و ماہ
دنیا پر سورج کی چمک ہو — مجھ پہ تیری نگاہ

فراق

(گورکھپوری)

رباعیات

(۱)

نظارہ بیدار بھی مہمل ٹھہرا
ہے ایک سے بڑھ کے ایک پردہ گہرا
افسانۂ شاہد حقیقت باطل
کہتا گونگا ہے اور سنتا بہرا!

(۲)

فطرت کچھ اور ہے خدا کچھ اور
بالغ نظروں کا منتہا کچھ اور
جس کے دم سے ہے دل کی دنیا روشن
اس جاگتی جوت کے سوا کچھ اور

(۳)

ترسی ہوئی آنکھوں کا تقاضا ہے تو کیا؟
پھولی ہوئی آنکھوں کی تمنا ہے تو کیا؟
اترے گا کبھی نہ جن پہ زنگ کا عکس!
روشن ہے تو کیا؟ آئینہ اندھا ہے تو کیا؟

(۴)

پڑھتا ہے کوئی شعر کوئی سنتا ہے
منہ تکتا ہے کوئی کوئی سر دھنتا ہے
ارباب نگاہ روتے ہیں تو کیا
اندھا نقاد سنکر ہی چنتا ہے!

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

مرزا غالب کی فارسی شاعری

مرزا غالب علیہ الرحمۃ کو عموماً اُن کے معصروں نے پہچانا نہ اُن کے بعد کے لوگوں نے۔ اس زمانے میں اُن کے اداشناس کم اور منکرین کمال بہت زیادہ تھے آج اُن کے مداح بہ کثرت اور مخالف کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے بے شمار مداحوں میں بہت تھوڑے اصحاب کو حقیقی مداح سمجھتے۔ ان کی زندگی میں اُن کی مخالفت محض عوام کی کورانہ ذہنیت اور مقلدانہ روش کا نتیجہ تھی۔ آج اُن کی مدح وستائش کا عنصر غالب بھی رواج اور فیشن کی حد سے زیادہ نہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے کلام میں عروج وقبول کی استعداد نہیں۔ سب کچھ ہے اور اس سے بہت بڑھ کر ہے جتنی ہم اس وقت تصور کر سکتے ہیں۔ میرا مقصود سخن یہ ہے کہ ان کو بنظر تحقیق دیکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور بچشم تقلید نظارہ کرنے والے بے شمار ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے بعض بالغ نظر بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ مرزا کی فارسی سے ان کی اردو کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ہمارے ادارات ادبی وطبقات علمی کے رجحان سے بھی یہی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مرزا خود فرماتے ہیں۔

پارسی ہیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از اردو کہ آں مجموعہ بے رنگ نیست

ور تو ہر حرف غالب چیدہ ام مخانۂ
تا ز دیوانم کہ مست سخن خواہد شدن

کلیات فارسی کے آخر میں لکھتے ہیں۔

گر ذوق سخن بہ ہر زمیں بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ہم کو بغیر کسی معقول دلیل اور تبین وجہ کے مرزا کی اپنی رائے کو ٹھکرانے کا حق ہرگز نہیں پہنچتا۔ وہی بے نظیر دماغ جس کی کاوش کا نتیجہ یہ دونوں مجموعے ہیں بقائمی ہوش وحواس ایک "نقشہائے رنگ رنگ" کا خطاب دیتا ہے اور دوسرے کو "مجموعہ بے رنگ" کہہ کر پکارتا ہے۔ ہم کون ہیں جو اس کا انکار کریں۔

میرے نزدیک ہمارے اہل الرائے کی لغزش کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کے سامنے مجموعہ اردو روزاول ہی سے بصورت انتخاب پیش ہوا۔ اگر نسخہ حمیدیہ سے سابقہ پڑا ہوتا تو یقیناً ہمارے دماغوں میں اور ہمارے لٹریچر میں غالب کی تصویر موجودہ غالب سے بالکل الگ خدوخال کی ہوتی۔ یا اگر اُن کے کلام فارسی سے بھی ہم بشکل انتخاب روشناس کرائے جاتے تو ہماری رائے موجودہ روش سے بالکل مغائر ہوتی۔

جہاں تک کلام غالب سے میری تحقیق ومطالعہ کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی کا رتبہ کئی وجوہ سے اردو سے بلند تر ہے۔ فارسی میں مرزا کی فطرت عمیق کے تمام گوشے روشن نظر آتے ہیں۔ ان کی استعداد بلند کی تمام تجلیاں آشکار ہو جاتی ہیں توحید، تصوف، اخلاق، فلسفہ، رندی، مذہب، مدح، ہجو، مرثیہ، عشق اور مناظر فطرت وغیرہ تمام مضامین کو جدت وندرت اور شدت وقدرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہر صنف کلام مثنوی، قطعہ، قصیدہ، ترجیع بند، ترکیب بند، غزل، رباعی وغیرہ میں مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس تکمیل وتنوع کے ساتھ اردو میں نہیں ضرورت تھی کہ ان میں سے ہر عنوان پر الگ الگ مستقل مضمون متعدد اصحاب ذوق سے لکھوائے جاتے تاکہ دنیائے اردو کو مرزا کی فارسیت کے "نقشہائے رنگ رنگ" کے اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مرزا کی زبان میں خسرو اور سعدی کی حلاوت نہیں۔ اُن کے شعر میں حافظ کی رندی وآزادگی نہیں۔ اُن کی غزل میں نظیری کا سوز اور روحانیت نہیں۔ اُن کے قصائد میں ظہیر کی غدوبت اور فغانی کی طوفان انگیز روانی نہیں۔ ان کی مثنوی میں نظامی کا فلسفہ اور فردوسی کی سادگی نہیں۔ ان کی رباعی میں خیام کی سرمستی اور سحابی کا تصوف نہیں۔ لیکن یہ سب صفات ایک خاص حد تک موجود ہونے کے علاوہ یقیناً ایک ایسی چیز بھی اُن کی ہر صنف سخن میں موجود ہے جو ان کو ممتاز اور الگ کر دیتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مرزا اسی دنیا میں رہتے تھے ان کی تخلیق انہی عناصر سے ہوئی تھی۔ جن سے اُن کے معاصرین اور متقدمین کی، ان کو انہی حالات و واقعات سے سابقہ پڑتا تھا جن کے جادۂ حیات کے ہر راہ رو کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اُن کے پاس اظہار خیال کا ذریعہ وہی الفاظ و محاورات تھے جو زید و عمرو کی متاع نطق ہو سکتے ہیں۔ مگر باوجود ان تمام ہمرنگیوں اور یکسانیوں کے وہ ہر بات میں انوکھے، ممتاز اور ایک حد تک نرالے تھے۔ وہ ناظر کائنات کے تمام عملیات اور معمولی انفعالات کے علاوہ کوئی خاص چیز لے کر کارگاہ ہستی میں وارد ہوئے تھے یعنی ان کی دکان ادب میں اسلوب بیان کی بداعت اور نفس مضمون کا عمق ایسی چیزیں ہیں جن سے سخن کا تمام مینا بازار ایک بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہر بات کو خواہ وہ نثر ہو یا نظم، بیان صحت ہو یا تقریر مرض، دوست کا ذکر ہو یا دشمن کا قصہ اونکے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ نہیں چاہتے کہ کسی امر میں بھی اسلاف و اقران کی بنائی ہوئی راہوں پر چلیں۔ ان کا بس چلے تو کسی نئے ستارے میں اپنی دنیا جا بسائیں جو انسان کے سانس سے ملوث نہ ہو چکا ہو۔ اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس پر متقدمین سے ہمرنگ ہونے کا شبہ ہو سکے تو وہ اس شبہ کو بھی برداشت نہیں کرتے اور اپنے سامعین کو صاف الفاظ میں وہ بات کہہ دیتے ہیں جس سے اُن کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

مبر گمانِ نوارد بقیس شناس کہ دزد
متاع من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است

اور یہ ان کی صاحب نظری کی دلیل ہے۔

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اب میں مختلف عنوانات کے تحت میں ان کا کلام پیش کرتا ہوں میں مخصوص اور منتقدانہ طریق انتخاب سے ان کی تصویر کا صرف ایک ہی جانب توجہ رخ نہیں دکھانا چاہتا بلکہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے اس بیان میں غالب سے صحیح تعارف کا حق ادا کرنے کی امکانی کوشش کروں۔

توحید و تصوف سب سے پہلے مضمون کے شرف و تقدس کے لحاظ سے توحید و تصوف کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ مضمون جتنا عام اور معمولی ہے خواص کے لئے اتنا ہی اہم و مشکل بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مرزا علمی حیثیت سے نہ رومی تھے نہ سنائی انہوں نے جو کچھ کہا اپنی ذہانت اور طباعی سے کہا اگر مجھے صرف اسی ایک بات پر اظہار خیال کی اجازت ہوتی تو میں بتاتا کہ غالب کے فارسی کلام میں تصوف اپنی پوری شان اور اپنے تمام مدارج و مقاصد کے ساتھ کس طرح جلوہ گر ہے۔

مولانا رومی حکیم سنائی، شیخ عطار وغیرہ شعرائے صوفیا اپنے واردات و حالات کو شعر میں ادا کرتے تھے۔ شعر ان کا مقصود نہ تھا۔ صرف آلۂ اظہار مافی الضمیر یا کیفیات باطن کا دھندلا سا عکس کہا جا سکتا ہے لیکن شعرا کے ایک گروہ کثیر نے بجائے عرفان حقیقت کے صرف شعر کو اپنا مطمح نظر بنایا اور محض تصوف کی چاشنی سے شعر کو لذیذ بنانا چاہا۔ مرزا ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک تیسری راہ کے سالک تھے۔ وہ تو نگر سنائی سے بیزار تھے اور اس کو "باد خوانی" سمجھتے تھے۔ غزل سرائی سے پشیمان تھے اور یہ اُن کے نزدیک "ہوا پرستی" سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ مضامین عالیہ کے بیان میں ان کے سامنے فطرت سے ایک ابر مطیر صرف گہر باری ہو جاتا تھا۔ وہ مقامات تصوف کی مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ انہوں نے کسی شیخ وقت کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ وہ ترک و تفرید، مراقبہ و مجاہدہ، ستر و تجلی، صحو و سکر اور قبض و بسط وغیرہ حالات و مقامات کے لذت و الم سے ایک مسترشد طریقت کی طرح آگاہ نہیں تھے۔ لیکن چاہتے تھے کہ لذائذ روحانی کے سمندر میں ڈوب جائیں فقر و فنا کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر لیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

کو فنا تا ہمہ آلائش پندار برد؟ — از صور جلوہ واز آئینہ زنگار برد

اسی غزل کا مقطع ہے۔

میرندوم ز فنا غالب و تسکین نیست — بو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد

قصیدہ اول عرفی کے تتبع میں توحید کے لئے وقف کیا ہے۔ فرماتے ہیں

اے ز دہم غیر غو غا در جہاں انداختہ — گفتۂ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون دوروں ز خویشتن پروانگے — پردۂ ہم پیشش در میاں انداختہ

اس کے بعد عالم کثرت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد وئی — مردہ را از خویش دریا گراں انداختہ

پھر مقام توحید میں عرفا و فلاسفہ کی نارسائی کا ذکر کرتے ہیں۔

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے و زانجا خویش را — پایہ پایہ از فراز نردباں انداختہ

سید الطائفہ جنید نے کہا تھا "وہ حد وانتہا جس پر پہنچ کر توحید کے متعلق عقلمندوں کی عقلیں منتہی ہوتی ہیں حیرت ہے"۔ اُویس کہتے ہیں "توحید یہ ہے

کہ بشریت کے آثار محو ہو جائیں اور الوہیت کا نجر دبھی مٹ جائے"۔ یوسف بن حسین کے نزدیک جو شخص توحید کے سمندروں میں آٹھ اوقات کے ہر گھڑی پر گزرتا ہو از بادہ سے زیادہ تشنہ کام ہونا جائے گا" یہی باتیں ہیں جو توحید و تجسید کے عنوان سے مرزا کے باطن فکر سے سرزد ہوئیں۔

لے بخلا و ملاحوے تو ہنگامہ مزا — باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ما حبرا
آب نہ بخشی بزور خون نمکند رہدو — جاں نہ پذیری بہیچ نقد خضر نارو ا

بزم تراشمع و گل خشتگی بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

گرمی نبض کسے کز تبدل داشت — سوختہ در مغز خاک ایشۂ دارد گیا

ذات باری اپنی کنہ و حقیقت کے لحاظ سے عقول و افہام کی حدود سے بالاتر ہے لیکن اپنے مظاہر صفات اور تجلیات خلق و صنع کی حیثیت سے یکسر ہوالظاہر کا مصداق ہے۔

بر رخ چوں ماہ برقع از کتاں انداختہ — در نہفتن پردہ از رازِ نہاں انداختہ
ہر ذرہ مظہر تجلی خورشید ہے۔ ہر قطرہ بہ نمائے حقیقت بحر ہے۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ ما خبر بہ تو رہ نیست — در طلبت نہاں گزشت باد بیدا بہ رہبری

اس شعر میں "باد بیدا بہ رہبری" پر غور فرمائے کتنی نادر پیمائی ہے۔

آفتاب عالم تر تشنگی ہائے خود یم — میرسد بے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

بعض جگہ کوئی اپنا دنیوی قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے مسائل وجود و نمود و اشیاء وغیرہ اچھل پڑتے ہیں۔ سفر کلکتہ میں ثقیل کے ملاحوں سے بہت دکھ پہنچا۔ اس کا ذکر کرتے ہیں اور تمہید میں درس تصوف شروع ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں

ساقی بزم آگہی روزے — راوقے ریخت در پیالہ من

سرور میں آکر ساقی سے خطاب کرتے ہیں۔

گفتم اے محرم سرائے سرور — از ادب دور نیست پرسیدن
اول از دعوی وجود بگو — گفت کفر است در طریقت من
گفتم آخر نمود اشیا چیست! — گفت ہے ہے نمی تواں گفتن!
گفتم این حب جاہ دنیا چیست! — گفت دام فریب اہرمن

پھر مختلف بلاد و امصار کے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں آخر میں پوچھتے ہیں۔

گفتم اکنوں مرا چہ زیبد، گفت — آستیں بر دو عالم افشاندن

یہی بات اپنے مخصوص رنگ میں دوسری جگہہ کہتے ہیں۔

اگر بدل نخلد ہر چہ از نظر گزرد — خوشا روانی عمریکہ در سفر گزرد

سبحان اللہ اس سے آگے تمنا کا دروازہ بند ہے۔

ایک اور جگہہ ساقی میکدہ ہوش سے یوں ہم کلام ہوتے ہیں۔

گفتمش چیست جہاں گفت سرا پردۂ راز — گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست
گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوئے برمز — گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

انسان کے لئے ادراکِ حقیقت محال ہے لیکن جزدی ادراک سے مایوس ہو بیٹھنا بھی نازیبا ہے کتنی لطیف بات اور سچی رہنمائی ہے۔

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال — گفتمش کوشش من دو طلبش گفت روا است

جامی کی مشہور غزل ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بچشم عاشقاں آں را تماشا کردۂ

اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھتے ہیں اور کتنے پیارے انداز سے لکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قطرہ سمندر کو اپنی گود میں لے لینا چاہتا ہے

برگ گل گلشن کی تمام رنگینی و نظر کو سمیٹ لینے کے لئے بے قرار ہے۔

انسان کی ہیچ میرزروح اور محدود و مجروح دانش اس کو پا لینا چاہتی ہے جس کو نہیں جانتی کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے چھینا چاہتی ہے اور ہیچ نہیں سکتی۔ تڑپنے کے لئے بے تاب ہے لیکن قوی جواب دے دیتے ہیں۔

چوں زبا نہا لال و جا نہا پر زغوغا کردۂ — بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ
اے جمال حقیقت اے شور افگن قلوب!
گر نہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش — جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ

خوشا نصیب ان کے جن کے لئے آج گوشہ نقاب سرکایا گیا۔

مسرت ہمان کو جو زیارت فردا کی امید پر شاہد لیکن سے ہمکنار ہیں۔

صد کشادا زاکہ ہم مو در رخ بنمودۂ — مژدہ بادا زاکہ محو ذوق فردا کردۂ

میں اور تو اے گل!

ذرہ را رو شناس صد بیاباں گفتۂ — قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردۂ

پائے تحقیق کی آخری منزل یہ ہے کہ

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از نیک و بد است — خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

سالکان راہ کے اوصاف و مقامات کا بیان سنئے۔ محبوب کی

طلب میں اپنا پسند ہی۔

رہرواں چوں گہر آبلہ پا بینند　　پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
نستہ ہند اگر ہمرہ مجنوں گردند　　محمل لیلےٰ بینند

فراست خاصۂ اولیا ہے جو دوام مراقبہ، اتباع اوامر اور اجتناب نواہی سے حاصل ہوتا ہے۔

ہر چہ در دیدہ بجا نست نگاہش دارند　　ہر چہ در سینہ نہانست زیما بینند
دور بینان ازل کوری چشم بدبیں　　ہم دریں جا نگر ندآنچہ در آنجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جو کہ لذیذ دوری　　نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی　　جادہ چوں نبض تپاں در تب صحرا بینند

ہونے والے واقعات اُن کی ضمیر منیر پر پہلے ہی منکشف ہو جاتے ہیں۔

شرر سے را کہ نگاہ بدر خواہد جست　　زخمہ کردار ستار رگ خارا بینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست　　صورت آبلہ بر چہرہ دریا بینند

اپنی فطرت صالح کے سبب نظام کائنات میں کوئی نقص نہیں دیکھتے۔

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند　　نقش کج بر ورق شہپر عنقا بینند

آیہ کریمہ ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر ھل تری من فطور" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

تصور حضور و شہود ذات کی بقائی کیفیت میں مستہلک رہتے ہیں۔

ہر چہ در سوختواں یافت ز ہر سو یابند　　ہر چہ در جانتواں دید بہر جا بینند

ننگ و نام کی بھینیں، کفر و اسلام کے امتیازات، دیر و حرم کی تفریقات عارف کے دل پر موثر نہیں ہوتیں۔

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود　　پاک شو پاک کہ ہم کفر تو و دیں تو شود
بایں کہ عاشقم عنان ز ننگ و نام چیست　　در امر خاص حجت دستور عام چیست
مقصود ما ز دیر و حرم جز صبیب نیست　　ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

عشق کے سامنے عوارض و اعتبارات کی کوئی ہستی نہیں۔

خشک و تر سوزی ایں شعلہ نہاں شاد ارد　　عشق یک رنگ کن بندہ و آزاد آمد

کائنات عالم کی کل کا ہر پرزہ ایک ہی منتظم جل ذکرہٗ کے اشارہ ابرو پر گردش کر رہا ہے۔

نشاط معنویاں از شرابخانۂ تست　　فسون بابلیاں فصلے ز دفتر تست
مرا چہ جرم کہ اندیشۂ آسماں پیماست　　نہ تیز گامی تو سن ز تازیانۂ تست

بجام و آئینہ حرف سکندر و جم چیست　　کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست
ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں مارا　　قدم بشیشہ و سر بر آستانۂ تست

جب بات یہ ہے تو شکوہ روزگار و شکایت فلک سے کیا حاصل

از دست دیگریت سفید و سیاہ ما　　بار و ز و شب بعربدہ بودن چہ احتیاج

اس فقیہ کے حسب مراد نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

از تست اگر ساختہ پرداختۂ ما　　کفرے نبود مطلب بے ساختۂ ما

سالک جس مقام کو تھک کر اپنی منزل سمجھ لیتا ہے۔ ذرا سستانے اور ہوش میں آنے کے بعد دیکھتا ہے کہ وہیں سے ایک آغاز جدید رونما ہو جاتا ہے۔

من سراز پا نشناسم بہ سعی و سپہر　　ہر دم انجام مرا جلوۂ آغاز دہد

اخلاق | اخلاق کے متعلق کلام غالب سے ایک بڑا ذخیرہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مرزا کا مرتبہ ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے۔ ان کی تعلیم اخلاق واعظانہ نہیں فلسفیانہ ہے۔ ہر عمل کی علت بیان کرتے ہیں۔ نتائج سے روشناس کراتے ہیں اور سامع کو متاثر کرنے میں عموماً کامیاب رہتے ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے لا تزکوا انفسکم واللہ اعلم بمن اتقیٰ اپنی اپنی بڑائی نہ بیان کرتے پھرو۔ حاضر و موجود خدا کو اہل تقویٰ کا خوب علم ہے یہ نکتہ اساس اخلاق ہے اگر کسی شخص کی گفتار و کردار کا مقصود دریا و نمائش جلب دنیا اور تسمین نفس ہے تو اس کی روح یقیناً مریض ہے۔ اس کا کامل مطلق ذات پر صحیح ایمان نہیں۔ اس کے نزدیک نیک عمل کوئی بالذات چیز نہیں بلکہ حطام دنیا کے حصول کا ذریعہ ہے اگر اس کو یہ چیزیں نمٹنے کے گمراہ کن فلسفے کے مطابق کسی ناروا ذریعے سے حاصل ہو سکیں تو وہ اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہے گا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

آں کن کہ ذر نگاہ کساں محتشم شوی　　بر خویش ہم ز خویش فزودن چہ احتیاج

قرآن مجید ایک اور نکتہ بیان فرماتا ہے لم تقولون ما لا تفعلون۔

تم ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہو جس سے تمہارا عمل مطابقت نہیں رکھتا۔ اس آیت میں کتنا مضبوط کیریکٹر طلب کیا گیا ہے۔ مرزا فرماتے ہیں۔

با مرد گفتم نشان اہل معنی باز گوے　　گفت گفتار یکہ با کردار پیوندش بود

شیراز کے معلم کا ارشاد ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام　　کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مرزا نے اسی محبوب تخیل کو ایک نئے لباس میں پیش کیا ہے۔

آنکہ خواہد در صف مردان لقائے نام خویش خون دشمن سرخ تر از خون فرزندش بود

درد دل کے متعلق کتنی بلند بات کہہ دی ہے۔

بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

مرا بے کہ رشتہ بوریا نہ خوشتر ز رشتے کہ پیرایہ نم ندارد

اولادِ آدم کے اعمال ایک مربوط سلسلہ علت و معلول کی طرح متولد ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے مصائب و محاسن اسلاف کی تقلید و پیروی کا نتیجہ ہیں اور اخلاف کی زشتی و خوبی کا باعث۔

نقش پے فرنگاں جادہ بود در جہاں ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن

درس قناعت و خودداری سنئے۔

کعز ست کہ در پے روزی شتافتن ننگ است ننگ در غم دنیا گریستن

مرزا کی خودداری مشہور ہے۔

تشنہ لب بساحل دریا ز غیرت جاں دہم گر کس ز افتگان چین پیشانی مرا

تواضعے کہ بے تو اضعے غالب بسایہ خم تیغش خمید نم بنگر

مذہب مرزا کے مذہب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ وہ اسلام کے کس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے ان کے کلام سے صاف نظر آرہا ہے کہ وہ باوجود شاعرانہ بذلہ سنجیوں کے نفس مذہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ محققین ادیان و مذاہب کے نزدیک بالعموم تین باتیں مسلّم ہیں توحید، عمل صالح، اور یقین یا داش۔ توحید کے متعلق فرماتے ہیں۔

غالب آزادۂ موحد کیشم بر پاکی خویشتن گواہِ خویشم

شرک اور عمل غیر صالح سے اعتراض۔

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم

بکشتم کسے را بہ ہر بینی نبردم ز کس مایہ در رہزنی

اسی مثنوی کے آخری اشعار ایمان جزا کے متعلق ملاحظہ ہوں۔

بدیں امید در وز امید و بیم گریزم بداں کہ عرش عظیم

شود از تو سیلاب راہ رہ جوئے تو بخشی بداں گریہ ام آبروئے

پھر اعتراف۔ شکر کرتے ہیں اور جناب رسول و رسالت پر ایمان رکھنے کا ذکر کرکے امید نجات کرتے ہیں۔

کہ البتہ ایں رند ناپارسا کج اندیشہ گبر مسلماں نما

پرستار فرخندہ فشور تست ہوادار فرزانہ دشور تست

بہ بند امید استواری درست بہ غالب خط رستگاری درست

خلاصہ یوں تو مرزا کی کوئی بات فلسفہ سے خالی نہیں تاہم ایسے اشعار جن پر خالص فلسفہ کا اطلاق ہو سکے کم نہیں ہیں۔ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

انسان کو اگر کسی تکلیف آئندہ کا پہلے سے علم ہو جائے تو وہ اسی وقت سے مبتلائے تکلیف ہو جاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ ع سنرس از بلائے کہ شب در میان است۔ بلکہ وہ درمیانی شب تمام استقبال بلا کی نذر ہو کر خود ایک مہیب بلا بن جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

بے تکلف در بلا دون بازیم بلاست تغرد یا سلسبیل و روئے دریا آتش ہست

حظ والم کا احساس و اظہار ناگزیر ہے۔ فکر بشری اس ناثر کے لئے مجبور ہے۔ آئنے میں قبول عکس کی استعداد فطری ہے۔ جیسے وہ خود موجد عکس نہیں ویسے ہی ہم حظ والم کے موجد نہیں۔

گر ہمہ وگر کس ہمراز دوست ہمو است اندیشہ جز آئینہ تصویر نما نیست

عالم مادی کا ہر لمحہ تغیر سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہ تیز خرام کرات، یہ متحرک ذرات فضا، یہ متغیر افکار و اعمال اور یہ ابدان میں گردش خون اسی حقیقت کی طرف رہنما ہیں۔

در ہر مژہ بر ہم زدن ایں خلق جدید است نظارہ مگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

اجزائے کائنات بنی آدم کی خدمت میں مصروف عمل ہیں ارشاد وحی ہے۔

سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض۔ یہی نوع مکرم و افضل ہے۔ لقد کرمنا بنی آدم۔ فضلناکم علی کثیر ممن خلقنا۔ ارتقائے مادہ کا آخری مقام آدم ہے۔ اس مضمون کو مرزا یوں ادا کرتے ہیں

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست بگرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار است

فطرت نے انسان میں جو بلند استعدادیں ودیعت کی ہیں۔ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا حال کا انسان جو کچھ کر رہا ہے ماضی کا انسان اس کو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح آیندہ پر قیاس کرلو۔

ز ناگرم است ایں ہنگامہ بیکار شور ہستی را قیامت می دہد از پردہ ہا کے کہ انسان شد

اس لحاظ سے مرتبۂ انسان کتنا عظیم ہو جاتا ہے۔

جزوے ز عالمم از ہمہ عالم بیشم ہمچو موئے کہ بتال از میاں بر خیزد

کسی بزرگ کا ایسا ہی شعر ہے۔

در جہانی و از جہاں بیشی ہمچو معنی کہ در کلام بود

لیکن یہ سب معالی و مراتب عطیہ الٰہی ہیں۔ ہم اپنی ذات میں

کچھ نہیں اگر ادھر سے تائید نہ حاصل ہوتی رہے۔

شوخیٔ اندیشہ خویش است سرتاپائے ما
تار و پو دہستی ما پیچ و تابے بیش نیست

عشق و محبت ایک طوفان انگیز، ہیجان آفریں اور زلزلہ افگن فطری جذبہ ہے۔ علمائے نباتات نے باہم قریب رہنے والے پودوں کو جدا رکھ کر تجربہ کیا ہے۔ ان کی نشو و نما کم ہو جاتی ہے۔ ان کی تازگی و جمال پر افسردگی چھانے لگتی ہے۔ حیوانات میں طبعاً تجاذب و تواصل کی استعداد نباتات سے بدرجہا بڑھ کر ہے وہ اپنے ابناءِ جنس بلکہ بجز جنس تک کی نفرت و انس میں پوری طرح امتیاز کرتے ہیں۔ مانوس اشخاص و اشیا کے قرب و بعد سے بدیہی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ جب نبات و حیوان میں روح کی خفتگی و نیم بیداری اور احساس کے سکون و عدم بلوغ کی حالت میں یہ شراب مرد افگن اثنا تند اثر رکھتی ہے تو فطرت کی مکمل صنعت گری، نشو و نمائے حواس کے مظہر اتم حضرتِ انسان کے بطونِ قلب و دماغ میں گھس کر یہ جذبہ جو بھی قیامت برپا کرے کم ہے۔ بالخصوص شعرا کی لطافت حس و رقتِ وجدان عام بنی آدم سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ یہ لوگ اس سے بدرجہ غائت متاثر و متکیف ہوتے ہیں اور شعرا میں مرزا غالب جن کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خاتم الشعرا کہا جا سکتا ہے۔ جن کی نگاہ حسن کی باریک ترین اداؤں تک پہنچتی تھی جو حسن کو خود حسن سے بہت زیادہ سمجھنے کے لئے طبعاً مجبور تھے کیوں نہ اپنی تمام متاع ہستی لئے ہوئے اس سیلاب بے پناہ میں بہ جاتے۔ وہ عرفی کی طرح معشوق بھی تھے اور عاشق بھی۔ وہ حسن کی زبان تھے اور عشق کے ترجمان۔ وہ عشق سے زیادہ نفسیات حسن کو بیان کرتے ہیں۔ اس خصوص میں ان کے دماغ نے وہ نکتے اخذ کئے جن کو پیشروؤں کی زبان و قلم نے مس نہیں کیا تھا لیکن ان کے وقوع کی عمومیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ شعر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ اس کے مضمون کو کوئی نظم نہ کر سکے اور جب کوئی قادر الکلام نظم کر دے تو سب اُسے اپنے خیال کی ترجمانی سمجھنے لگیں۔

مرزا کی شبہائے شباب جنونِ عشق کے بادہ تند سے سرشار تھیں۔ وہ اس شعلۂ آتشیں کی حدت سے برسوں سلگتے گئے۔ ان کے اس نوع کے اشعار آج بھی ایک ہنگامہ زا خروشِ عشق و تلاطمِ جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ اُن کی عمیق تمناؤں اور لازوال تشنگی کو کبھی سیرابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ معشوق میں فنا ہو جانے کے لئے بے تاب تھے یا اس کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے تھے۔ اُن کی حیاتِ معاشقہ کی گہرائیوں تک کون پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے لباسِ سخن پر جو پھول بکھیرے۔ اُن سے استشمام کرنا فنونِ مکتبہ کے بڑے بڑے فضلا کے بس کی بات نہیں۔ اس مائدہ روح سے لذت اندوز ہونے کے لئے وارداتِ اور فطرتِ سلیمہ کی ضرورت ہے۔ بالغ نظر، ادا فہم، اور نکتہ شناس لوگ اُن کی اعجاز کاریوں سے حیرت کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

متاخرین ہند اور مرزا کے معاصرین کے ہاں غزل ایک بے جان چیز ہو چکی تھی۔ علامہ آزاد بلگرامی، سراج الدین علی خاں آرزو، امام بخش صہبائی وغیرہم کی فضیلت و تبحر اور تحقیق و تدقیق سے کس کو مجال انکار ہے۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان کا تغزل مصرقدیم کی ممی شدہ نعشوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جن کی نوک پلک کی آراستگی میں شبہ نہیں۔ گرانبہا مار زیب گلو ہیں۔ انگلیاں مرصع انگوٹھیوں سے مزین ہیں۔ بناگوش زریں بالیوں میں مستور ہیں تمام اعضا و جوارح اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تیار معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے کارخانہ کمال میں سب کچھ ہے لیکن روح نہیں۔ طرفداری ہو گی۔ اگر میں یہ کہوں کہ مرزا پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

اُن کے کلام میں یقیناً ایسے اشعار بھی موجود ہیں۔ جن کو لفظی صنعت گروں کے کلام سے ملا دیا جائے تو کوئی تمیز نہ ہو سکے۔ لیکن اُن کی روشنیٔ طبع نے ان کو اس اغلاق و پیچیدگی کی تاریکیوں سے نکالنے میں بڑا زور صرف کیا اور حقیقت نگاری کی شاہراہ پر لانے میں مسلسل سعی کی۔ شوخیٔ بیان، نزاکتِ خیال، تزک، تاثراتِ فراق، تمنائے وصل، معاملات فی مابین وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کو پیکرِ غزل کے اعضائے رئیسہ کہا جا سکتا ہے۔ ان سب کے متعلق چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے معانی کی طرف اشارہ کرنے کی بھی مجھ میں تاب نہیں۔ سنئے اور بحر معنی میں غوطہ لگائیے۔

تو در آغوشی و دستت و دلم از کار شد — تشنہ بے دار و رسن بر سر چاہے دریاب

فغانی کا مشہور شعر یاد آ گیا۔

غمِ ناامیدی چن بگر آں زماں بدانی — کہ بروں نباغ آئی و گلے نچیدہ باشی

محاکات کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بخرابم می رسد بند قبا وا کردہ از مستی — ندانم شوق من بر کدام پہلو فشاندہ است اشک

اپنا اور معشوق کا تعلق اور مابہ الامتیاز۔

میرم و دے ہرسم کہ فرط بدگمانی — داند کہ جاں سپردن ز عافیت گزیدست
در بادہ دیرتم آسے ز سخت جانیست — در غمزہ زود بجی آسے ز ناتوانیست
من سنجے او بینم و انداز بے حیاییست — او سوئے من نہ بیند و انم ز شرمگینیست

شوخی بیان ملاحظہ ہو۔

ایں سخن حق بود و گاہی بر زبان ما رفت — چوں تو خود گفتی کہ جہاں اول از خاراست
من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا — فریبش کہ مگر می تواں فریفت مرا

توجیہ عجیب

بے وجہ در رہت نیست از پاشادن من — بر دیدہ می فشانم در ہر قدم قدم را

نزاکت خیال

بے خود بوقت نوحہ طپیدن گناہ من — دانستہ رشتہ تیز نکردن گناہ کیست
شباہتیست مرا آنکہ بر نیامدہ است — دگر نہ موئے بباریکی میان قوئیست
قناعت ہستی من ز تصور کمرش — جو نغمہ کہ ہنوزش وجود در تار است
فریب وعدہ بوس و کنار یعنی چہ — کمر دروغ دروغ و دہن دروغ دروغ

مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔

بمرگ من کہ کس از من بمرگ من ناید — بکوئے خویشتن آں نعش بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد — فغان ز راہد و فریاد بر برہمن یاد آر
بباد و در زبہ جوان و پیر گجب — بکوئے و بر زن از اندہ فروزن یاد آر
بسازنالہ گرے ز اہل دریاب — بہ بند و ترشیہ رحمے ز اہل فن یاد آر
ملال خلق و نشاط رقیب و ہر حال — غزو خویش بہ تحسین تیغ زن یاد آر

ان کا محبوب تصویری کے محبوب کی طرح کسی اور پر عاشق ہو چکا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں۔

چشمش بر آب از نف ہر بے شیست — من در گماں کہ از اثر دو دآہ کیست
ظالم تو و شکایت عشق ایں ہمہ ستم — بارے بمن بگو کہ دلت دادخواہ کیست
نیرنگ عشق شوکت رعنائی تو برد — در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست
گوید عجز چو تو خود ناشناس حیف — یا چوں خودی کہ داد و گیتی گواہ کیست

غالب کنوں کہ قبلۂ او کوئے دلبر ست
کے میرسد بدیں کہ درش سجدہ گاہ کیست

یہی مضمون ایک دوسری غزل میں ملاحظہ فرمائیے۔

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر — دل سینہ سوزن اتش بر خاک سفاکش نگر
برقے کہ جا بہا سوختی دل را بہ ظاہر دوش بیں — شعلہ کہ خونہا ریختی دست از حنا یا کش نگر
آں کو بخلوت با خدا ہرگز نگفت بے ما جفا — نالاں بہ پیش ہر کسے از جور او لاکش نگر

آں سینہ کز چشم جہاں مانند بوے ہاں — اینک بہ پیرہن عیاں از روزن چاکش نگر
بر مقدم صید فگنی گوئے بر آوازش ببیں — در بازگشت تو سنے چشمے بقتر اکش نگر

باخوبی چشم و دلش بارگمی آب و گلش
چشم گہر بارش ببیں آہ شرر ناکش نگر

بزم وصال کی رازداری و احتیاط اور رشاط و استغنا کا نقشہ کھینچتے ہیں

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم — قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
بگوشہ متنعم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — و گر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم — و گر خلیل شود مہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے برہ گزر پاشیم — مے آوریم و قدح در میاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنے کاروان بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم — گہے بہ ہوسہ زباں در دہاں بگردانیم

نہیم سر شرم بیک سوئے و باہم آویزیم
بشوخی کہ رخ اختراں بگردانیم

مجاز سے حقیقت کی طرف سعود کر رہے ہیں۔

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے — گل دیدمے و روئے تو را یاد کردمے
رفت آنکہ قیس را بترگے ستودمے — در جا بکے ستائش فرہاد کردمے
رفت آنکہ جانب رخ و قدرت گفتمے — در جلوہ بحث باگل و گشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاس پیام تو — ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمے

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے

غالب ہوائے کبسہ بر گرفتہ است — رفت آنکہ عزم فتح و نشاط کردمے

اور چند اشعار سنئے جن میں حقیقی تغزل نمایاں ہیں۔

سیرم نتواں کرد ز دیدار نکویاں — نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہائے
نظارہ و دل، شبنم و ریگ کیا نادر تشبیہ ہے۔

ذوقیست دریں مویہ کہ رنش منتش — ہا دلشدہ ہیچ گوئے، ہمہ ہاں ہائے

دوسرا مصرع دیکھئے بولنا، پھر کتنا اور تڑپتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

در خلوت تابوت نرفتست ز یا دم — بر تختۂ در دو خفتہ چشم نگراں ہائے

ہائے کتنی ظالم خلوت ہے۔

معشوق کا تصور، اُسے پالینے کا خیال، عاشق کے نزدیک منتہائے مقصود، کمال مراد یا کامرانی کونین جو کچھ بھی کہو کم ہے۔ فرماتے ہیں۔

مژدۂ غمزۂ دلے خلعتی را مانی — ابدی جنت و فیض ازلی را مانی
بسکہ ہموارہ دلآویزی و شیریں کاست — سائۂ طوبیٰ و جوئے عسلی را مانی
جلوہ فرمائی و جاوید نمائی بہ کسے — سیمیائی و بہشت عملی را مانی
بہ توانائی کوشش نتواں یافت ترا — سر خوشیہائے قبول ازلی را مانی

ایک اور غزل کے چند شعر سنئے۔ حسرت امید اور آرزو کی مکمل نقاشی ہے۔

بیاؤ جوش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم — ندیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیاز مندی حسرت کشاں نمیدانی — نگاہ من شود و زدیدہ دیدنم بنگر
بہار من شود و گل گل شگفتنم دریاب — بخلوتم بر و ساغر کشیدنم بنگر

بداد من رسیدی ز درد جاں دادم
بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر

رشک | رشک ایک طبی ملکہ ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس کا صحیح استعمال بام ترقی و فلاح تک پہنچنے کے لئے ہمزلف زبان ہے۔ صنعت علم تجارت اور حکومت وغیرہ ہر شعبہ عمل میں اس کی شعبدہ کاریاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن معاملات حسن و عشق میں اس کا تسلط بہت بڑھ جاتا ہے جس سے متاثر نہ ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔

خطا معاف نگاہوں کو کھینچ لیتا ہے حسن — خطا معاف یہ آنکھیں نہیں ہیں پتھر کی

لیکن عاشق نہیں چاہتا کہ اس کے معشوق کی پیاری صورت کوئی دیکھے۔ اس کی نازک اور نغمہ خیز آواز کوئی سنے۔ اس کی نرم انگلیوں کو بطور مصافحہ بھی کوئی مس کرے۔ وہ اس کی تمام ہستی و صفات ہستی کو اپنے لئے وقف کر لینا چاہتا ہے۔ اس میں بقدر وہم و گمان بھی کسی دوسرے کا دخل اُسے گوارا نہیں۔ مرزا اس میں بھی گوناگوں مضامین اور رنگ رنگ نکتے پیدا کرتے ہیں۔

رقیب کی یاد اپنے دل میں لانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہی دل یاد دوست کا مسکن ہے۔ اس طرح دشمن کو دوست سے ہمنشینی حاصل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

یاد از عدو نیارم آنہم ز دوربینی است — کاندر دلم گزشتن با دوست ہم نشین است

افراط رشک و رنج ہے۔

بر روئے حاسدان و رو رنج کشودہ رشک — از بہر خویش جنت دلبستہ ایم ما

ماتم امام میں تنہا رونا چاہتے ہیں۔

با غاکیاں بجنگم و ز افلاکیاں بر شک — خواہم بہ آستان تو تنہا گریستن

قاصد کے سامنے محبوب کا نام لینے سے بھی جھجکتے ہیں۔

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را

یہی مضمون اردو میں بھی ادا کیا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر کس سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر میں

رشک آیدم ز روشنی دیدہ ہائے خلق
دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست
با من بخواب ناز و من از رشک بدگماں
تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

خمریات | خمریات سے مرزا کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس زمین میں بھی بہت گل کاری کی اور اپنی ایجاد آفرینی طبیعت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ظلمت کدہ ہستی میں ان کو اگر کبھی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے تو محض برق شراب کی طفیل۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا — ہلا کم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

ان کے درد کی دوا، دل کی قوت اور جان کا نور یہی چیز ہے۔ وہ بطور میراث کوئی دنیوی سامان اس کے سوا اپنے مورث سے نہیں چاہتے

رنجورم و بدہر در ماں بودم — نیروے دل و روشنی جاں بودم
گفتم بہ پدر کہ خوب مے نوشی کن — تا بادہ بمیراث فراواں بودم

لیکن خود اپنے وارث کے لئے ایک دو خم سے بھی باقی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔

اے آنکہ ترا سعی بدرمان من است — منعم مکن از بادہ کہ نقصان من است
حیف است کہ بعد من بمیراث رود — ایں یک دو سہ خم کہ در شبستان من است

جلوۂ ساقی و ساغر سے یکساں گرمی بزم کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

چناں گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری — گداز جوہر نظارہ در جام است مستاں را

عکس جمال دوست سے فروغ بادہ کو دیکھ کر کیا تشبیہ پیدا کی ہے۔

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست — گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

بھرے معشوق کا شغل دیکھئے۔

سوز و ز گریش مے دادہم چناں بہ لہو — ریزم [illegible] شراب را

آب و شراب کا امتیاز ملاحظہ ہو

آبش دہم بیادہ و ادہ مردم از تمیز نوشدے و زجام فرو ریزد آب را

حلت شراب کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے ہیں، واعظ کو مخاطب کرتے ہیں۔

نگفتۂ کہ بتلخی بسازو پند پذیر بروکہ بادۂ تلخ تر ازیں پند است

کبھی شراب کے حرام ہونے کا خیال آجاتا ہے اس کا ترک کرنا بھی گوارا نہیں۔ اپنی تسلی کے لئے خود ہی جواز کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

بہ بادہ گر بودم انس شاعرم نہ فقیہہ سخن چہ سنگ زآرودہ دامنی دارد

بلکہ اگر زاہد لوگ شاعر سے فتویٰ لینے کی تکلیف گوارا کریں تو آئیں اور سنیں کہ ایک حیلہ سے وہ بھی پی پلا کر مغفور ہو سکتے ہیں۔

صبا حلال زاہد شب زندہ دار را اما بشرط آنکہ بہاں صبحدم کشد

مرزا کے نزدیک شباب و زہد اجتماع نقیضین سے کم نہیں۔

شباب و زہد چہ ناقد روائی ہستی است بلا بجان جوانان پارسا ریزد

شکوہ سنجی شکایت زمانہ مرزا کا خاص مضمون ہے اس کو بارہا بیان کیا ہے اور ہر جگہ اسلوب بدیع اور انداز عجیب کے ساتھ۔ غزل، رباعی، قصیدہ، قطعہ، مثنوی غرض کوئی صنف سخن اس سے خالی نہیں لکھتے ہیں

در باغ مراد ما بیداد نگر گ نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ

چوں خانہ خراب است چہ نالیم ز سیل چوں زیست وبال است چہ ترسیم ز مرگ

در بزم نشاط خستگاں را چہ نشاط از مژدہ پائے بستگاں را چہ نشاط

گر از شراب ناب بار دغالب ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

تمام عمر عبث توقعات میں گزر گئی۔

بازی خوردم روزگار بودم ہمہ عمر از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

بے مایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ کوئی کمال کام نہ آیا۔ آخر بڑھاپے میں تمام خواہشیں ترک کر کے صرف مے کو مراد ٹھہرا لیا تھا اس نے بھی وفا نہ کی

اوراق زمانہ در نوشتیم و گزشت در فن سخن بگانہ گشتیم و گزشت

مے بود دوائے ماہ پیری غالب زاں نیز بنا کام گزشتیم و گزشت

آسمان کو کسی کی تابندگی نہیں بھاتی۔

داغم از پرورش چرخ کہ در بزم امید سر شمعے کہ فروزد بدم گاز دہد

مرزا عوام کے خلاف جرمن کے مشہور فلسفی شوپنہار کی طرح کسی کا یقینی پرسور نہیں ہوتے بلکہ فطرت کائنات کے ماہر ہونے کے سبب ایک انوکھی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی مراد بر آئے تو خوش نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ایک دوسری نامرادی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے آسائش کی تلاش ہی فضول ہے۔ ایک الجھن سے نکلو گے دوسری میں پھنس جاؤ گے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

عشوہ حرمت چرخ تحریکیں عیار یوسف از چاہ بر آرد کہ بہ بازار دہد

مجو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی چو خار از پا بر آرد پا ز دامن بر نمی آید

ہستی موجب علائق ہے اور علائق موجب مصائب نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مصائب کی جڑ اقرار ہستی اور تعمیر ہستی یہی ہے۔

تمام زحمت از ہستیم چہ می پرسی ز جسم لاغر خویشتنم بہ پیری خار است

علائق سے نجات چاہتے ہیں لیکن کامیابی کہاں۔

دامن افشاندم بجیبے ماندہ در بند تنم وحشتے کو تا بروں آرد ز عریانی مرا

ہفت آسماں بجوش و ما در دریا زلیم غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

اسی خیال کو اردو میں یوں ادا کیا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اپنے خون میں تڑپنے کی شکایت کرتے ہیں اس ذات کے حضور میں جس کے علم میں پنہاں و آشکار، اور شہود و غیب یکساں ہے۔

حیف کہ من بخون تپم وز تو سخن رود کہ تو اشک بدید و مشمری نالہ بسینہ بنگری

بخت بد کی یہ تاثیر ہے کہ کوثر خشک ہو جائے اور طوبیٰ پر بھی خزاں آجائے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم ز بے نمی طوبیٰ اگر ز من شود ہیمہ کنم ز بے بری

ایک قطعہ میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے غالب زیاں کار جب خدائے رزق عباد اپنے ذمے لے رکھا ہے تو تم کیوں بھوکے مرتے ہو! دراصل بات یہ ہے کہ چند سال سے تمہاری قطع حیات اور اندازہ رزق کا حکم ہو چکا ہے۔ فرشتہ رزق بہت فرمانبردار ہے۔ اس نے فوراً تعمیل ارشاد کی اور رزق بند کر دیا۔ دوسرے فرشتے نے تجھ کو ہلاک کرنے میں دیر نگار کی ہے۔

دوم فرشتہ کہ ایزد بخیر مقرون باد روا نداشت مرا ہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفہ کنم از قول شاعرے قصیں کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبود عدیل

اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہستم ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

انتہائے شکوہ یہ ہے کہ صاحب شکوہ تمام وسائط و وسائل اور اسباب وعلل کو نظر انداز کر کے ایک آخری جرأت سے مسبب حقیقی کی بارگاہِ جلال میں کھڑا ہو کر اپنی داستان اندوہ پیش کر دے اور اپنی ہستی حقیر کو صدورِ افعال کے ناقابل سمجھ کر سب کچھ اسی طرف منسوب کرنے میں باک نہ کرے۔ یہ مضمون سب سے پہلے عہدنامہ قدیم کے صحیفۂ ایوب میں اکمل و اتم طریق پر موجود ہے اس صحیفہ کے تمام ابواب میں ستم رسیدہ ایوب جناب باری میں نہایت کھلے ہوئے شکوہ سنج نظر آتے ہیں جس کو پڑھ کر کوئی صاحب دل کرب و اذیت اور حیرت و استعجاب کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مرزا نے بھی اپنی مثنوی گہربار کے قریباً ۶۰ شعر اس مضمون کے لئے وقف کئے ہیں۔ غالباً علامہ سر اقبال کے شکوے کا ماخذ یہی مثنوی ہے۔ مرزا نے اپنے شکوہ کو لفظ و معنی کے اعتبار سے معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ باز پرس کا دن ہے صالحین اپنی صلاحیت کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہیں اسی ہجوم میں ایک حسرت مند اور شرمگیں جماعت نمودار ہوتی ہے۔ ان میں مرزا غالب دہلوی سینہ کوباں نظر آتے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے داورِ محشر کے حضور اپنی شفاعت و وکالت پر خود ہی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے:۔

"میرے اعمال کو ترازو میں نہ رکھ۔ میرے ہر رنج و درد کا باعث تیری ذات کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ مجھے حساب و پرسش سے معذور رکھ یا مجھے صاف گوئی کی جرأت دے۔ میری گستاخ گفتاری معاف کر۔ اے گفتہ و ناگفتہ سے یکساں واقف۔ مجھ کو کہہ لینے دے جو میرے دل میں ہے۔ میں قتل و غارت اور شرک و کفر کا مجرم نہیں مے خوار ہوں اور وہ بھی برائے نام۔ بہت سی چاندنی راتیں اور بہار کے دن حسرتِ مے نوشی میں گزر گئے۔ دمِ عیش رقصِ بسمل سے زیادہ نہ تھا۔ تو نے مجھے دنیا میں بے برگ و نوا ہی رکھا۔ دنیا کے دکھوں کی یاد مجھے بہشت میں بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میرے گناہوں سے حسرتِ گناہ کا پلہ بھاری ہے۔ بے شک میں رند ناپارسا اور گبر مسلماں نما ہوں لیکن تیری پاک کتاب کا عابد اور تیرے دانا پیامبر کا محب ہوں مجھے نجات سے بہرہ یاب کر۔"

یہ مثنوی تنہا ہی مرزا کی قوتِ ایجاد و مادہ اجتہاد پر ایک برہانِ قاطع ہے۔

مراثی | مرثیہ میں چند قصاید اور متعدد قطعات و ترکیب بند لکھے ہیں۔ جن میں مضمون کی ندرت کے ساتھ ساتھ درد و اثر کی فراوانی ہے۔ غالب کو آج تک مرثیہ گو کی حیثیت سے بالکل خاموش سمجھا گیا ہے۔ لیکن یہ قطعاً ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اندوہ و ماتم کے مضامین کو بیان کرنے پر بھی انہیں کافی قدرت حاصل تھی۔ ملاحظہ فرمائیے شاہزادہ کا مرثیہ لکھتے ہیں۔

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو — اے چشم از تراوشِ دل آبشار شو
اے خاک چرخ گر نتوانی وزجا دراں — اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط — اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روئے بسیلی کبود کن — اے آفتاب داغ دلِ روزگار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ ما راز سر گذشت
تنہا ز سر نگو کہ ز دیوار و در گذشت

اے قوم خویش را بشکیب امتحاں کنید — ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفلست شاہزادۂ دررہ نظر بسیت — منفش زعزم رہروے آسماں کنید
از میوہ و گلِ آنچہ دلش خواہد آں دہید — از جبۂ آنچہ اے شما باشداں کنید
در خور ز فتنش نتوانید باز داشت — بیخود شوید و جامہ دریدو فغاں کنید

اے اہل شہر مرفہ ایں دودماں کجاست
خاکم بفرق خواب گہ خسرواں کجاست

زاں سبز خط کہ بر رخ او نا دمیدہ ماند — گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند
در مدح شاہزادہ سخنہائے دلپذیر — در دا کہ ہمگنفتہ و ہمناشنیدہ ماند
اخلاق شاہزادہ بود دلنشین خلق — بوئے زاں شگفتہ گل نو رسیدہ ماند

آں سرو سایہ دار کہ بارش نبود کو
واں نو گل شگفتہ کہ خارش نبود کو

وسیست اے سپہر ستمگر ترے — بارے برم جور تو پوش کہ دارے!
نیرنگ ساز چرخ کہ بیداد خوئے اوست — با گل کند سموم و با شاخ صرصرے
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد — از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہرے

زیبائی و جوانی و فرخندہ شاہ حیف
آں نونہال سرو قد بکلاہ حیف

شہزادہ سے خطاب کرتے ہیں

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ — ما بے تو در ہیم تو بے ما چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی — با حوریانِ آتشہ سیما چگونۂ
ما بجزہ اں بحلقہ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونۂ
بے مطرب ندیم و غلامان خردسال — بے باغ و نقلہ و آب دریا چگونۂ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے
پروانۂ چراغ مزار تو عالمے

امام حسین علیہ السلام کے مرثیہ میں جو سینہ کوبی و اشک ریزی کی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں تکلف ہے۔ دیکھئے۔

اے فلک سر مزار ستم بر خاندانِ مصطفےٰ
داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ
اے مہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت
از تو ہر چشم و چراغ دودمانِ مصطفےٰ
سایۂ از سروِ روانِ مصطفےٰ افتد بخاک
ہاں چہ بر خاک افگنی سروِ روانِ مصطفےٰ
گر نمی بازار امکان خوطہ ئیل مصطفےٰ است
ہیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ
کینہ خواہی ہیں کہ با اولادِ اجدادش کنی
آنچہ با مکروہ اعجاز بنانِ مصطفےٰ
یا تو دانی مصطفےٰ را فارغ از رنجِ حسین
یا تو خواہی زیں مصیبت ممتحان مصطفےٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفےٰ را اینچنیں
یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفےٰ
آں حسین ست ایں کہ سوئے مصطفےٰ خوش میرود
بوسہ چوں باقی نماند بر دہانِ مصطفےٰ
آں حسین ست اینکہ گفتی مصطفےٰ وحی فداک
چوں گذشتے نام پاکش بر زبانِ مصطفےٰ

اے کج اندیشۂ فلک حرمت دین باستے
علم شاہ نگوں شدہ نہ چنیں باستے
تا چہ افتادہ کہ بر نیزہ سرش گردانند
عزت شاہ شہیداں بہ ازیں باستے
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک
آنکہ جولانگہ او عرش بریں باستے
حیف باشد کہ ز اعدا دم آب طلبد
آنکہ سائل بدرش روح امیں باستے
سخن نیست کہ در راہِ حسینؑ ابن علیؑ
پویہ از روئے عقیدت چہ چنیں باستے
چشم بد دور بہنگام تماشائے حرش
رونما سلطنت روئے زمیں باستے
با اسیران ستم دیدہ پس از قتلِ حسین
دلِ نرم و منش مہر گزیں باستے

پہ ستیزم بقضا ور نہ بگویم غالب
علم شاہ نگوں شدہ چنیں باستے

مناظرِ فطرت انیچرل شاعری کی ایجاد کا سہرا عموماً شعرائے مغرب کے سر سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارا نیچرل شاعر اس اسٹیج پر بھی پوری قدرت و قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے بہت سے قصائد کی تشبیبیں بہار کی تصویر کشی سے آراستہ کی گئی ہیں بعض قطعات و قصائد میں روشنان فلک کا نظارہ پیش کیا ہے۔ اس منزل میں مرزا ایک ماہر فلکیات سے کم نہیں معلوم ہوتے ہیں قصیدہ نمبر ۲۵ کی تشبیب میں گلشن کو خطاب کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

"تیرگا بیست در اطراف تو گوئی کشمیر
روستائیست ز اقصائے تو گوئی شیراز"

قصیدہ نمبر ۲۱ طوطیان زمرد رنگ کی توصیف سے شروع ہوتا ہے۔

خیز تا بنگری بشاخ نہال
طوطیانِ زمردیں تمثال
گاہ مرجاں دانده از منقار
گر زبرجد فشانده از پر و بال

قصیدہ پنجم کی تمہید میں مرزا کی ایجاد طبعیت نے جو کچھ لکھا ہے جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی پیشرو کا شرمندہ تقلید نہیں۔ صبح کا وقت ہے برہمن کے ہاتھ میں کلیدِ سے کدہ متحرک ہے۔

خیز و دستہ دستہ مغان نہ شستہ روئے
در اہتمام چیدن برسم زنار و ن
از شور دیریاں بگمانِ خروش صور
اموات را ز قبر بہ تن بر در کفن
رخشد ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم
بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ سمن
خوابد چراغ کشتۂ چوشخص بریدہ سر
خیزد گل شگفتہ چو رنجور خستہ تن

مثنوی "چراغ دیر" میں بنارس کا نقشہ دکھایا ہے:۔

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز
نگاہِ بر پری زاد انش انداز

بیاں ہا نازک و دلہا توانا
زنادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در دلہا طبیعی ست
دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست
بلطف از موج گوہر نرم رو تر
بنا از خون عاشق گرم رو تر

زنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش
بہار بستر و نور ز آغوش
لسانِ دو عالم گلستاں رنگ
ز تاب رخ چراغانِ لب گنگ

قیامت قامتاں مژگاں درازاں
ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
مگر گوئی بنارس شاہدے ہست
ز گلشن صبح و شام آئینہ در دست

ہجو ہجو سے اگرچہ پرہیز کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں زبان سے کچھ نکل جاتا ہے پھول گرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی سخت دشمن کے متعلق لکھتے ہیں۔

کردہ جہدے کہ در دیر اے کاشانام
چرخ در آرائش ہنگامۂ عالم نکرد
گر بہ بیجت راندہ باشم نکتہ بار خود مپیچ
زانکہ حرفے زانچہ گفتم خاطرم خرم نکرد
بیتے از ماتم دویدم ذوقکے بخشید لیک
ہیچ در تسکیں نیفزود و درد رخشت کم نکرد
ہجو تو نا قلبے در صلب آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیس لعل سجدہ بر آدم نکرد
حاش للہ بود نت در صلب آدم ہمتست
پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ با در ہم نکرد

میرے خیال میں تو اس سے آگے ہجو کا کوئی اور درجہ نہیں اور لطف یہ ہے کہ شغائی و سوزنی کی طرح عریاں الفاظ کا شائبہ تک نہیں۔

ایک بے ہنر شیطان ہیبت و شن کی توضیح ہو رہی ہے۔

ایا بے ہنر دشمن دیوسار چہ نازی بہنگامۂ زور و زر
ز ما باش فارغ کہ ما فارغیم ندارم پروائے ایں شور و شر
ترا شیوہ دزدی و ما بے وفا
تو بد روئے و بد گوئے و ما کور و کر

عورت کی رفاقت سے عمر بھر دل برداشتہ رہے۔ نثر و نظم کے اکثر اجزا اس پر شاہد ہیں۔

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت سپرد ندازرہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم گراں تر آمد از طوق عزازیل

مزاح امرزا کی ہر بات سے ایک سنجیدہ ظرافت اور فلسفیانہ مزاح ٹپکتا ہے۔ اس میں بھی عجیب و غریب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ازدواج و خانہ داری موجب مصائب و آلام ہے۔ اس قید سے آزادی و بے فکری مفید صحت و قوت ہے اس خیال سے کیا نادر نتیجہ نکالتے ہیں۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست زرد نازم بخدا، چرا توانا نبود

اور سنئے کسی تند خرام حاجی کا تیاقہ نگار رہے ہیں

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تندمے خرامی دائم در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

بہشت اور زاہد کا تصور کرتے ہیں۔

گر دیدن زاہداں بجنت گستاخ ویں دست درازی بثمر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ ماند بہ بہایم و علف زار فراخ

شراب چاہتے ہیں مگر مفت اعلیٰ اور بکثرت۔

غالب سخن گرچہ بگفت ہمسر نیست از نشہ ہوش ہیچ اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و لغزد آنگہ بسیار ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

افلاس کے سبب صوم و صلوٰۃ کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ شرع میں ترمیم چاہتے ہیں۔

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

جہالت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال ست در جہل نہ حال شاں بیک منوال ست
کو دن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرق خر عیسیٰ و خر دجال ست

احترام اساتذہ | اکثر غزلوں کے مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا دل اساتذہ کے احترام سے معمور تھا۔ بالخصوص ظہوری سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔

نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را
غالب از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشیم
پارۂ بیش ست از گفتار ما کردار ما

غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جاں در تن ساز بیانش کردہ ام

نظیری، اور صائب کی غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور برابری کا دعوے نہیں کرتے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم
ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است در نمود نقشہائے اعتبار افتادہ ام

عرفی کے تتبع پر بھی نازاں ہیں۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

اپنے متعلق خوب رائے رکھتے ہیں۔

جوہر طبعم درخشاں ست لیک روزم اندر ابر پنہاں میرود
تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست
غالب ز ہند نیست نوائے کہ میکنم گوئی ز اصفہان و سرات و قسم ما
بیاد بدگراں جا بود زباں دانے غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد
از تازگی بدہر کمر نمی شود نقشے کہ کلک غالب خونیں رقم کشد

نظم و نثر شورش انگیزی کہ می باید بخواہ
اے کہ می پرسی کہ غالب در سخن کیتاست ہست

عرشی

حُسن کے دو پہلو

مکرمی۔ تسلیم:۔

عنایت نامہ پہنچا تھا۔ مگر میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ کوئی تازہ نظم وغیرہ بھی سالنامے کے قابل تیار نہ تھی اس لئے جلد جواب نہ دے سکا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو نظم کے لئے موضوع کی تلاش ہوئی۔ کئی روز سوچنے کے بعد یاد آیا کہ میں نے ۱۹۳۴ء میں ایک نظم بطور تریحیت لکھی تھی جس کی ٹیپ کا مصرع تھا "بھاگ بلائے حسن سے بھاگ" اس پر اکثر حسن پرست اصحاب کو مجھ سے میری حُسن کے خلاف اس جسارتِ بے جا کا شکوہ تھا۔ یہ یاد آتا تھا کہ دل نے مشورہ دیا کہ وقت آگیا ہے کہ اب اپنی اُس جسارت بے جا کے ازتلاب کی تلافی کر دی جائے۔ چنانچہ اسی بحر اور قریب قریب اُسی زمین میں خامہ فرسائی شروع کر دی۔ مگر مشکل یہ آپڑی وہ موضوع بالکل نیا اور اچھوتا تھا اور بہت جلد میں اس میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر میں نے جس موضوع پر اقدام اٹھایا تھا وہ بہت کٹھن ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس موضوع پر ہمارے شعرا ہزارہا سال پہلے سے خامہ فرسائی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اس موضوع میں کوئی نئی بات پیدا کرنی ذرا کارے دارد۔ لیکن میں مشکلات سے گھبرایا نہیں اور میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ خدا نے میری کوششوں کو شکر خدا

اب کہ دس گیارہ دن کے بعد میں اس نظم کو تیار کر سکا ہوں۔ آپ کے ارشاد کے موافق "ادبی دنیا" کے سالنامے کے لئے ارسال خدمت کر رہا ہوں انداز بیان نیا ہے، موضوع نیا نہیں تو بھی۔ امید ہے کہ آپ بھی پسند فرمائیں گے۔

ہاں خوب یاد آیا میں نے ۱۹۳۴ء میں جو نظم لکھی تھی، اُس میں حسن کا تاریک پہلو دکھایا گیا تھا اور اب جو نظم میں ارسال خدمت کر رہا ہوں وہ حسن کا روشن پہلو ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ میں وہ سابقہ نظم بھی آپ کی خدمت میں بھیج دوں تاکہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دونوں کو بالمقابل شائع فرما سکیں۔ بہرحال یہی نظم "حسن غارت گر" کے عنوان سے اور تازہ نظم "حسن دل نواز" کی سرخی سے ارسال خدمت ہے۔ ہر چند کہ "حسن غارت گر" نظم پہلے شائع ہو چکی ہے مگر "حسن دل نواز" کے ہمراہ اگر یہ دوبارہ شائع ہو تو زیادہ لطف انگیز صورت ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ حسن کے تاریک اور روشن رُخ دونوں یک جا اور بہ یک وقت پیش نظر آجائیں گے۔ مگر یہ امر آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔

ہاں گذشتہ زمانے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ سخت علیل ہو گئے ہیں۔ مگر اُس زمانے میں میں بہت پریشان تھا۔ مگر دعا گو تھا کہ خداوند عالم جلد آپ کو صحت عطا فرمائے۔ الحمدللہ کہ اس نے میری دعا قبول فرمائی۔ صحت یابی پر ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نیاز مند آزاد انصاری۔

"حُسنِ غارتگر"

حسن کا تاریک پہلو

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ — عشق نہیں ہے آگ ہی آگ
حسن کے گن کیا گاتا ہے — حسن تباہی لاتا ہے
کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ — بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ
حسن گلے کٹواتا ہے — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کے ارماں ٹھیک نہیں جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
دل کو لگا کر کیا لے گا جان کھپا کر کیا لے گا
ٹھیک نہیں، ہاں ٹھیک نہیں بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
زیست گنوا کر کیا لے گا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن پہ جی کیوں کھوتا ہے تخمِ غم کیوں بوتا ہے
لعلِ جادو فن کو نہ چاہ جعد کمند افگن کو نہ چاہ
حسن کسی کا ہوتا ہے؟ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
دشمنِ جاں، دشمن کو نہ چاہ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا دم کیوں بھرتا ہے خونِ دل کیوں کرتا ہے
چشم نہیں ہے، ڈائن ہے زلف نہیں ہے، ناگن ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
عشوہ نہیں ہے، رہزن ہے بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن سے دھوکا کھائے گا رنج و اذیت پائے گا
عالم روئے حسن نہ دیکھ جلوہ سوئے حسن نہ دیکھ
دیکھ۔ بہت پچھتائے گا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
بھول کے سوئے حسن نہ دیکھ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کو پہلے زر دے گا بعد ازاں کل گھر دے گا
حسن بتاں سے بات نہ کر دشمنِ جاں سے بات نہ کر
آخر آخر سر دے گا بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
خصمِ جہاں سے بات نہ کر بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اہلِ ادا سے بچ کر چل — چشمِ قضا سے بچ کر چل
جنتِ حسیں کہلاتے ہیں — دشمنِ دیں کہلاتے ہیں
راہِ خطا سے بچ کر چل — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
دوست نہیں کہلاتے ہیں — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حُسن کی چاہت پر بھی نہ جا — چشمِ عنایت پر بھی نہ جا
دل کو وفا کا اذن نہ دے — ذوقِ جفا کا اذن نہ دے
لطفِ نہایت پر بھی نہ جا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
ایسی خطا کا اذن نہ دے — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ — اس کی صباحت پر بھی ریجھ
دولتِ دین و دل نہ گنوا — بے جا۔ لاحاصل نہ گنوا
ناز و نزاکت پر بھی نہ ریجھ — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
ہوش میں آ۔ غافل! نہ گنوا — بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے — وصل کا سم بھی قاتل ہے
حسن کا ہو کر کیا لے گا — سر سے پا تک کھا لے گا
کم سے کم بھی قاتل ہے — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
بھاگ نہیں تو آ لے گا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

شوق وفا بھی مہلک ہے — ذوقِ جفا بھی مہلک ہے
آزاد! اپنی جان بچا — دین بچا۔ ایمان بچا
کم بھی سوا بھی مہلک ہے — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
ناداں! کہنا مان۔ بچا — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حکیم آزاد انصاری

حُسنِ دل نواز

حُسن کا روشن پہلو

حُسن سے اپنا عہد نباہ حُسنِ سفید و حُسنِ سیاہ حسن سے قربت حاصل کر عشق سے لذت حاصل کر
ایک ہیں پیشِ اہلِ نگاہ چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ چاہ میں شہرت حاصل کر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن حیاتِ عالم ہے جوہر ذاتِ عالم ہے حُسن کے ارماں پیدا کر پیدا۔ پنہاں پیدا کر
وجہ ثباتِ عالم ہے چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ پیدا کر، ہاں پیدا کر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسن خدائے الفت ہے عقدہ کشائے الفت ہے حسن سے اپنی چاہ بڑھا چاہ کے رسم و راہ بڑھا
یعنی برائے الفت ہے چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ چاہ کی عزّ و جاہ بڑھا چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسنِ بتاں سے ربط بڑھا جسم کا جاں سے ربط بڑھا حسن سے نفرت کفر ہے کفر ردِّ نعمت کفر ہے کفر
روحِ جہاں سے ربط بڑھا چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ ایسی حرکت کفر ہے کفر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن کی چاہت فرض سمجھ تا حدِ طاقت فرض سمجھ حسن جہاں ہاتھ آئے، پہنچ عشق جہاں لیجائے، پہنچ
فرض ہے طاعت فرض سمجھ چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ چاہ جہاں پہنچائے، پہنچ چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

جو بھی جہیں کہلاتا ہو زہرہ جبیں کہلاتا ہو حسن پہ مائل ہو کر جی عشق میں کامل ہو کر جی
خواہ کہیں کہلاتا ہو چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ زیست کے قابل ہو کر جی چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

اہل ادا ہو، کوئی ہو ماہ لقا ہو، کوئی ہو حسن سے چاہ بڑھائے جا چاہ کے چرکے کھائے جا
بُت ہو۔ خدا ہو، کوئی ہو چاہ ہر اہل حسن کو چاہ چاہ کی دادیں پائے جا چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسن کا باغی احمق ہے حسن کہیں ہو برحق ہے شکر خدا کر، شکر خدا جس نے جہاں کو حسن دیا
مظہرِ حسنِ مطلق ہے چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ ورنہ تجھے صاحب عشق کیا چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حُسن سے آنکھیں روشن کر حسن سے سینہ گلشن کر اے دلِ بیزار! اب بھی سمجھ چاہ کے اسرار اب بھی سمجھ
حسن جہاں ہو، درشن کر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ اب بھی سمجھ یار! اب بھی سمجھ چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

عقل جہاں تک کھوج لگائے عشق جہاں تک شمع دکھائے الغرض اے آزاد! نہ بھول حسن کی دم بھر یاد نہ بھول
حسن جہاں تک پایا جائے چاہ ہر اہل حسن کو چاہ عشق کا ارشاد نہ بھول چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حکیم آزاد انصاری

مہارانی کا تحفہ

(۱)

اودیپور کو راجپوتوں نے فتح کر لیا تھا۔ مگر اصل فتح اس کی رانی رمتا کی تھی۔ جس نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ وہ رعایا کے کسی ایک فرد کی خاطر اپنی جان تک سے گذر جانا جانتی تھی۔ پہاڑی لوگ جن کے دل میں بغاوت کی خفیف سی جنبش کے وقت اُن کی جنم بھومی ——— پہاڑوں کی ناقابل گذر نشیب و فراز، جنگل اور غاریں کی گود کی مانند کھلے رہتے تھے۔ اب بغاوت کا خیال ہی دل میں کیوں لاتے کہ ان کے لئے ایک اور ماں کی گود کھلی تھی ——— رمتا اُن کی مصیبت و تنگ حالی کو خود دیکھا اور سنا کرتی۔

شام کے وقت سورج کی آخری شعاعیں قلعہ کے محرابوں سے چھن کر مشرق کی طرف یوں پڑ رہی تھیں جیسے پہاڑ کی چوٹی سے سنہری پانی چوکور سی دھاروں میں گر رہا ہو۔ بریلے کے اونچے پہاڑی درخت چٹانوں کے پیچھے سے ایڑیاں اٹھا کر قلعہ سے بندی کا گلہ کرتے ہوئے سورج کی موت کے راگ کو مکمل خاموشی سے سُن رہے تھے۔ مہارانی رمتا نے جھروکے کے پیچھے سے سر اٹھا کر محرابوں کو دیکھا۔ سنہری پانی کے آخری قطرے نظر آ رہے تھے اور چشمے سے اُمڈتی ہوئی سنہری دھاریں بھی اب مختصر ہوتی جاتی تھیں۔ مگر راج پروہت کا جلوس ابھی تک قلعہ کے جھروکے کے نیچے نہیں پہنچا تھا۔

. . . بالآخر جلوس پہنچ ہی گیا۔ طلب و مسرت سے دیوانے لوگ گھنٹیوں کو یوں کوٹ رہے تھے جیسے کوئی نحیف بوڑھا تقاضائے عمر کی وجہ سے کسی ذاتی دشمن سے بدلا لینے کے تخیل میں ہاتھ کی ہتھیلی پر دانت پیستے ہوئے زور زور سے مکے مارتا ہے یا جس طرح سمندر کی غضبناک لہریں چٹانوں سے سر پھوڑ کر ایک دل کو ٹھٹھا دینے والی آواز نکالتی ہیں ——— گاؤں کی مالن کی چاندی تھی۔ لوگ پیسے دے کر بھی پھول بھکاریوں کی مانند مانگ رہے تھے ——— راج پروہت سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ راج پروہت کے والدین نے اُسے روحانی تعلیم دلانے کے لئے بچپن ہی سے ہمالیہ کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگلوں میں بھیج دیا تھا ——— اُسی جگہ پر جہاں برسوں سے اب تک رشی پرانا یام کے ذریعہ سانس چڑھائے پڑے ہیں۔ صرف اُن کے بدن کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں ایک نہایت باریک چمڑے کے نیچے دل کی ایک خفیف سی حرکت اس بات کا یقین دلا رہی ہے کہ ان پنجروں میں کسی مخصوص موقع پر روح اپنے پاک احساس کے ساتھ عود کر آئے گی۔

راج پروہت بیس برس کی کڑی تپسیا کے بعد تیس برس کی عمر میں واپس لوٹ رہے تھے۔ اُن کے بشرہ پر روحانی تجلی عیاں تھی۔ آنکھیں شباب کی آمد آمد کی وجہ سے سُرخ تھیں ——— مہارانی رمتا نے نہایت غور سے راج پروہت کو دیکھا۔ مہاراجہ اور مہارانی دونوں نے پروہت جی کو نمسکار کی اور جلوس آہستہ آہستہ گذر گیا۔

رمتا جھروکے سے اٹھی اور حسب معمول چاندنی میں شہر کا نظارہ کرنے کے لئے قلعے کے محرابوں کے پیچھے کی طرف بڑھی۔ چاند نے رات کی سیاہ چادر پر اپنی چاندنی بچھا کر بچھا دی تھی۔ جس جگہ رانی رمتا کھڑی تھی۔ وہاں پاس ہی ایک دیوان خانہ ہونے کی وجہ سے چاند کی روشنی نہ پہنچی تھی اور اسی لئے اندھیرے میں جاتی ہوئی رمتا کی توجہ دیوانخانے کی روشن قندیلوں نے اپنی طرف کھینچ لی۔ رمتا اس طرف بڑھی۔ باندیاں مورچھل لینے کے لئے دوڑیں ——— رانی کو دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوا اتفاق سے درباری گویّا بھی دیوان خانے میں بیٹھا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر مہارانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چندیر! گاؤ گے نہیں کیا؟"

"گاؤں گا ——— مہارانی جی! کیا گاؤں؟"

"یہ نہیں معلوم ہو۔ کچھ سمے کے متعلق گاؤ۔"

چندیر نے جھک کر دیکھا۔ پاس کھڑی رمتا کی آنکھوں میں اُسے کچھ بے چینی کی لہر سی معلوم ہوئی۔ اس نے چاہا کہ ان ہی بے چینی کی لہروں کو اٹھا کر وہ اپنا راگ اپنے ہنر کے مطابق شروع کرے اور اُسی بے چینی کو بے چین تر بناتا ہوا سکوت کی مملکت میں داخل ہو کر مہارانی سے ایسا خراج وصول کرے کہ دولت جس کے پاؤں میں لوٹتی ہو اور اُس نے سمے کے مطابق گانا شروع کیا۔ اُس کے راگ نے پہلے آہستہ آہستہ

دل کو ہزاروں خیالوں کی طرف سے ہٹا کر یک سو راغب کر دیا۔ پہلے اُس نے گایا ــــ چاند چمک رہا ہے بادشاہ کے محل پر۔ غریب کی جھونپڑی پر۔ شیر کے غار پر ــــ وادیوں پر جنگلوں۔ پہاڑوں اور میدانوں میں ــــ اور مہارانی کا دل اس تصور سے زیادہ بے چین ہو گیا۔ چندیر نے ستار کی آواز کو قدرے بلند کرتے ہوئے کہا . . . اور کھوپری کے ایک ٹکڑے پر جو زمین کی اونچ نیچ یا بارش کی ریزش سے زمین سے باہر آ گئی ہے اور ــــ مہارانی کا دل پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہو گیا۔

چندیر نے اس بات کو دیکھا۔ اچھی طرح دیکھا اور زیادہ سنجیدگی سے گایا ــــ

دھرم گرُو کا مہارانا ــــ ظالم اور عیاش رانا جس کی جلتے وقت شمشان میں کھوپری جلتی نہ تھی۔ بلکہ ثابت رہ گئی تھی اور کسی کے توجہ نہ دینے کی وجہ سے زمین پر پڑی رہ گئی۔ شاید کسی نے دیکھ کر زمین میں دبا دی۔ اُس کے اوپر کی زمین پر گھاس اُگ آئی۔ جسے گائیں اور بھینسیں چرنے لگیں ــــ ایک دن آیا۔ جبکہ اسی طرح چاند اپنی چاندی کو یکساں طور پر بانٹ رہا تھا کہ کسان کے ہل کی نوک نے کھوپری کو باہر نکال دیا اور کسان نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھوپری ایک طرف پھینک دی!

چندیر نے ستار کی آواز کو قدرے اونچا کرتے ہوئے کہا۔ اے انسان! تیرا آغاز کیا ہے اور انجام کیا۔ زندگی کی اصلیت کیا ہے اور ہل کی نوک جس نے کھوپری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اپنی خاموشی کی بولی میں گانے لگی جیو یا بن ساجن کس کام ــــ اور مہارانی رمنا کی آنکھوں سے چندیر کو آنسو ٹپکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ چندیر نے ایک تڑپ اور جلن کے ساتھ اپنی ناچتی ہوئی انگلیوں کو ستار پر سے اٹھا لیا آہ۔ گانے کے تخیل، اشعار کے بعد کی خاموشی کا لطف بھی کم دل افروز نہیں ہوتا۔

مہارانی نے گلے سے ایک قیمتی ہار اتارا اور کہا ــــ چندیر! تمہارے راگ کی ایک بہت کم قیمت ادا کر رہی ہوں اور چندیر نے زائد سنجیدگی سے کہا:۔

"ہاں۔ بوجہ مہارانی جی ــــ ہاں کی میرے راگ کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں۔ لیکن سچ پوچھو۔ مہارانی! میں ہار اور دولت نہیں چاہتا۔ میرے راگ کی سب سے بڑی قیمت وہ آپ کے دو آنسو ہیں جو آپ کے خیال میں بے قیمت ہو کر فرش پر گر گئے ہیں ــــ!"

مہارانی نے سنجیدہ مسکراہٹ سے کہا: بکل موہنگے کا دن ہے چندیر! بیل دیو کے ماتھے پر سیندور لگ جانے کے بعد اور راج پروہت کو کھانا کھلا کر کل پھر اسی جگہ آنا۔ چاندنی رات ہو گی۔

(۲)

سورج دھام رمندا کے گرد اگرد ننگے پاؤں چکر کاٹنے کی وجہ سے راج پروہت جی کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے وہ جنگل کی خاموشیوں سے آئے تھے۔ اُن کے کان صرف گنگا کے دلکش راگ جو ہمیشہ گائے جانے کے باوجود ویسی ہی مٹھاس اور دلکشی رکھتا ہے سننے کے عادی تھے۔ مندر میں آئے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کا شور، ڈھولک اور باجے کی آوازیں ان کے مادی شور سے ناآشنا کانوں کو پریشان کرنے لگیں۔ پربھو راج پروہت ماتھے پر ایک خفیف سا چیور ڈالتے ہوئے اپنی بھاری بھرکم کھڑاؤں کو ایک کونے میں رکھ کر بیل دیو کے پاس آ بیٹھے اُن کے ہاتھوں میں سیندور تھا۔ پجاری کے اشارے پر انھوں نے شیو جی مہاراج کے بت کے پاس دھرے ہوئے سنگ مرمر کے بیل کے ماتھے پر ٹیکا لگایا اور تمام طرف سے مونگ برسنے لگا۔

"ٹھہریئے ٹھہریئے۔ مہارانی جی آتی ہیں۔ انہیں بھی مونگ ڈالنا ہے۔" چندیر جی نے جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ آہستہ سے کہا دور سے مہارانی رمنا سفید اور سادہ کپڑوں میں ملبوس، آنکھوں کے لئے چندن کی سی ٹھنڈک لئے موسم سرما کے بادل کی طرح آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ دُور سے اس کے گلابی پاؤں زمین پر یوں پڑتے تھے جس طرح رحمت ایزدی گنہگاروں پر نازل ہوتی ہے۔ چندیر کے من مندر کے دروازے کھل گئے۔ اس کے دل کی دیوی آہستہ آہستہ بڑھی آ رہی تھی۔

تیزی کے پردں کی جھنجھناہٹ کی سی آواز آنے لگی جو بعد میں جھانجھوں کی موسیقی میں گم ہو گئی۔ چندیر نے اپنی ستار سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ جھانجھوں کی موسیقی چندیر کے ستار پر اس کی انگلیوں کے ناچ کے ساتھ ساتھ رقص کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی اور رقص کے اس وصال کی مثال آئندہ دنیا میں پھر کبھی نہ مل سکے گی۔

جس طرح تالاب کے پرسکون پانی میں کنکر پھینک دیئے جانے پر پانی اپنے عظیم سکون کو کھو دیتا ہے۔ اسی طرح اس نئی قسم کی موسیقی نے راج پروہت کے پرسکون دماغ میں پریشانی سی پیدا کر دی۔ مونگ ڈالتے ڈالتے ہاتھ رک گیا۔ جھکتے وقت کمر اور گردن کے گرد لپٹا ہوا کپڑا گر پڑا۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کو گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ چندیر نے

دیکھا کہ راج پروہت کا منہ کان تک سرخ ہو گیا۔ تھالی میں موتیا، کرنے، اور گلاب کے پھولوں کے ساتھ دھوپ اور دیپک رد دیا، پڑے تھے جھانجروں کی موسیقی میں کھو کر راج پروہت نے کچھ کرنے کے پھول بیل دیوی کی پیٹھ پر مسل دیئے اور چندیر نے محسوس کیا ــــ کہ اس حرکت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

ــــ اور جھانجروں کی آواز خاموشی کے پرلطف راگ میں ختم ہو گئی۔ راج پروہت جی نے محسوس کیا کہ وہ اپنے فرض سے اچھی طرح سبکدوش نہیں ہو رہے۔ انہوں نے دل میں کہا۔ "صرف روحانی تعلیم سے انسان کی ازلی بھوک نہیں مٹ سکتی۔ دنیا میں رہ کر اُس سے سیر ہو کر روحانی بلندیوں کو طے کرنا صحیح معنوں میں اپنے فرائض کا انجام دینا ہے۔"

دیپک کی چاندنی کو شوجی جھا راج کے بت کے پاس سے آرتی کے طور پر گھمانے کے بعد پروہت جی نے تھالی رکھ دی۔ مونگ سب طرف سے برسنے لگا۔ پردے کے پیچھے سے مونگ کی خفیف سی بارش ہوئی۔ جس کو پروہت نے سہوًا راستہ میں آکر روک لیا اور ذرا پیچھے کو ہٹتے ہوئے بولے ــــ

"بھارت سپتری ــــ اپنی پرجا کے لئے جان تک نچھاور کر دینے والی مہالکشمی ــــ نمسکار کرتا ہوں۔ آگے آئیے اور ہاتھوں میں سیندور لیجئے"۔

حسن اور حیا کا ایک مرمریں بُت پردے کے پیچھے سے نکلا۔ دو ڈری ڈری مست، شرابی، نیم وا آنکھوں نے پروہت جی کے چہرے کی طرف دیکھا گلاب کا غنچہ چٹخا اور مہارانی جی نے کچھ کہا ــــ آہستگی سے یقین سے اور بھروسے سے ــــ مگر پروہت جی نے کچھ نہ سمجھا۔ ایک لمحہ بعد مہارانی جی نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

مادیت کی اس زبردست قوت سے انہوں نے ابھی زور نہ آزمایا تھا کہ مہارانی جی پروہت جی کے قریب آگئیں۔ جھانجروں کا راگ اِک دفعہ پھر چھڑ گیا۔

راج پروہت نے دل میں یہی اندازہ لگایا ــــ کہ رمتا ایک عورت ہے۔ گلابی پاؤں والی جس کے حسین پاؤں سے جھانجروں کا راگ بادل کی مانند آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اُس کی وا آنکھیں ــــ شرابی، مست، نیم وا۔ . . جن سے ہر طرف پریم کی پھوار پڑ رہی ہو۔

یہ اندازہ غلط تھا۔ راج پروہت کے خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ دیوی تھی اور وہ کسی ایک فرد کی خاطر اپنی جان سے بھی گذر جانا جانتی تھی۔ وہ محض ایک عورت نہ تھی۔

مہارانی نے عقیدت کے طور پر پروہت جی کے قدموں میں پڑے ہوئے سیندور کا ٹیکا ماتھے پر لگا لیا اور پھول بیل دیو کے بدن پر گرائے۔ ایک دفعہ پھر چاروں طرف سے مونگ برسنے لگا۔ لوگوں نے کہا۔ "تا تارتا کی جے"

یہ سچ تھا کہ وہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان عورت ہونے کے علاوہ ــــ ماتا . . . بھی تھی!

مہارانی جی نے اپنی نیم وا آنکھوں کو ایک دفعہ پھر اوپر اٹھایا ــــ ان میں سے دو آنسو ــــ ڈھلی ہوئی عقیدت پگھلاتے ہوئے پریم کے دو قطرے نیچے آگرے۔

چندیر نے نہایت آہستہ سے گایا۔

"وہ خاموشی کا سماں ــــ جس پر تکلم ہزار جان سے فدا ہو!"

وہ آنکھیں جن میں پریم کے پیازی آنسو گلاب کے رنگ کو شرمائیں!

وہ حیا جو سو ناز و ادا کو پالے ــــ!

وہ موسیقی جو ویرانۂ دل میں کھو جائے ــــ

سب مل کر ہاں سب مل کر مونگے کا دن مناتے ہیں . . ."

ایک دفعہ پھر ایک جلن کے ساتھ چندیر نے اپنی انگلیوں کو ستار سے علیحدہ کیا۔ پروہت راج پروہت نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا ــــ ذرا دائیں طرف منہ پھیر کر پروہت جی نے پجاری جی کو سنکھ بجانے کا اشارہ کیا ــــ سنکھ پورنے کے بعد سب رخصت ہوئے۔

(۳)

صبح کے وقت پروہت راج پروہت شاہی باغ میں گھوم رہے تھے ــــ اُن کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔ اُن کے چہرے کی افسردگی کو دیکھ کر فضا میں بھی افسردگی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمیشہ شرابِ مسرت میں مدہوش چہرے نے اپنے خط و خال کو ایک شاہانہ رعب دار صورت دینی مناسب سمجھی۔ انہوں نے اپنے جسم کے تمام عناصر کو ایک عمیق نظر سے دیکھا اور اُن کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ وہ خوب صورت ہیں اور اُن کے اعضا سانچے میں ڈھلے ہیں۔

مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں وہ گھبرا گئے۔ خلافِ عادت افسردگی کو جھنجھوڑ کر دور کر دینے کی کوشش میں انہوں نے اپنے دل سے کہا۔

"آج باغ کی کلی کلی کیوں خاموش ہو گئی ہے۔ غنچے صبح کی راجکماری کے استقبال کے لئے خندہ پیشانی سے پیش کیوں نہیں آرہے۔ پانی کی اڑتی ہوئی

پھوار میں دھنک پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ کیا پپیہا کوئی مل گیا ہے کہ اب وہ پی کہاں کی رٹ نہیں لگاتا؟"

چندیر نے آہستہ اور سلجھے ہوئے الفاظ میں پوچھا۔

"پربھو — آپ خاموش کیوں ہیں؟"

کیونکہ — سب سرشٹی خاموش ہے۔"

"سرشٹی آپ کی خاموشی کی وجہ سے خاموش ہے۔ ورنہ پھول بھی مسکرا رہے ہیں اور دھنک . . . ."

"نہیں چندیری بھیا ایسا نہیں ہے"

"نہیں پربھو۔ اسی نظر سے دیکھئے — کہ آپ کا پیا کہاں بستا ہے جہاں وہ بسے گا۔ وہاں . . . وہ جگہہ . . ."

راج پروہت جی نے بات کاٹ دی اور گیان کے اس اشارے کو سمجھتے ہوئے بولے —

"ہاں سچ ہے — چندیر! میری خاموشی کی وجہ اور ہے —!"

"کیا ہے پربھو؟" چندیر نے پھولوں کی تھالی سنبھالتے ہوئے کہا۔

راج پروہت نے کچھ تامل کے بعد کہا۔

"چندیر — تم یہ کسی کو بتاؤ گے نہیں نا — وعدہ کرو"

"وعدہ کیا — پتا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا — اگر آپ کی یہی اچھا ہے"

راج پروہت جی نے چاروں طرف دیکھا اور جس طرح ہوا کے زور سے چلنے سے چھوٹے چھوٹے پودے لہراتے ہیں اور ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اسی طرح لرزتے ہوئے انہوں نے چندیر سے کہہ دیا —

"چندیر — میرا تپ ادھورا رہ گیا"

چندیر جی دو قدم پیچھے ہٹ گئے جس طرح گاتے ہوئے اس کا قلب یک سوئی اختیار کر جاتا تھا اسی طرح کی یک سوئی سے آنکھوں کو پروہت جی کے چہرے پر گاڑتے ہوئے چندیر نے پوچھا۔

"ادھورا — تپ ادھورا — وہ کیسے؟"

پروہت جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "وہ بچھل — وہ پوچھا جس نے مجھ کو — جسے اپنی شانتی پر ناز تھا اس طرح اشانت کر دیا جس طرح باد خزاں سوکھے ہوئے پتوں کو دور تک بکھیرنے کے لئے لے جاتی ہے . . . اور پھر بتاؤ — چندیری بھیا! میں کیسے بتاؤں؟"

فوآرے کے پیچھے سے پجاری جی آنکلے — اور کہنے لگے "پربھو چلئے مندر میں — لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سب آپ کے درشنوں کو بے تاب ہیں —"

راج پروہت جی آہستہ سے مندر کی طرف چلنے لگے۔ پھولوں کی تھالی کے ساتھ چندیری بھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چندیر کو افسوس ہوا کہ راج پروہت جی افسردہ خاطر ہیں۔ اس سے زیادہ وہ اس بات کو جاننے کے لئے بے چین تھا کہ راج پروہت جی کا تپ کیسے ادھورا رہ گیا ہے۔ کندن کی طرح دمکنے والا چہرہ گیا اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ ان کا تپ مکمل ہے۔ باقی آدمیوں سے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے راج پروہت جی نے چندیر سے کہا۔

"کاش دنیا کو چھوڑنے سے پہلے میں دنیا سے سیر ہو لیتا تاکہ اچھا کبھی پیدا ہی نہ ہوتی"

"کیسی اچھا۔؟" چندیر نے آہستگی سے پوچھا۔

پروہت جی چندیر کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے بولے "یہ تو تم جانتے ہو۔ چندیری — مہارانی رہتا۔ ہر ایک فرد کی خاطر اپنی جان تک سے بھی گذر جانا جانتی ہیں"

"جی ہاں — اس میں ذرا بھی شک نہیں"

"— اور کسی کو بھی اپنے دروازے سے خالی نہیں لوٹاتیں"

"نہیں — بالکل نہیں — وہ ہر ایک کی منوکامنا پوری کرتی ہیں"

پروہت جی چپ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کر دی پجاری جی بہت آگے نکل چکے تھے۔ نہایت چپکے سے پروہت جی نے چندیر کے کان میں کہا — "آہ چندیر! مونگے کے دن کو رمتا کی دو بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے موہت کر لیا ہے۔ میں اس کے دروازے پر پریم کی بھینٹ . . ."

چندیر کے ہاتھ سے تھالی گر پڑی۔ پھول بکھر گئے۔ پجاری اور اس کے ساتھی بھاگے بھاگے آئے اور پھول زمین پر سے اٹھانے لگے۔ کیونکہ وہ عقیدت کے پھول مہارانی نے اپنے ہاتھ سے پرو کس کر بھیجے تھے۔ مہارانی نے — جو ان کی ماتا بھی تھی —!

پھر راج پروہت کے دو آنسو زمین پر گرے۔ جن پر کسی کی نظر نہ پڑی

(۴)

ویسی ہی چاندنی رات تھی، پکھیرو درختوں پر اپنے گھونسلوں میں اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو لئے سو رہے تھے۔ بہار کی ہوا آہستہ آہستہ چل کر آم کی خوشبو کوئل کے دماغ میں پہنچا رہی تھی اور وہ اپنی نیند سے بیدار ہو کر کبھی کبھار کُو کُو کی ایک آواز لگا کر پھر سو جاتی۔

چندر جی مہارانی جی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ رمتا کو معلوم نہ تھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور متحیر ہو کر کہا۔

"چندیر — تم ہو؟"

"ہاں — ماتا جی۔"

"آج کی چاندنی رات پرسوں کی چاندنی رات سے بھی زیادہ خوبصورت ہے — آج قدرت گا رہی ہے۔"

"ہاں — مہارانی جی۔"

"سدا بہاری کوئل — تم نہ گاؤ گے کیا — تمہاری ستار کہاں ہے۔ دیکھو تمہیں کوئل اُکسا رہی ہے۔"

"ماتا میں گانے نہیں آیا — میں گناہ کرنے آیا ہوں۔"

رانی رمتا ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چندیر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"حیران کیوں ہو گئی ہو ماتا — مجھے راج پروہت جی نے بھیجا ہے — سندیسا دے کر۔"

"راج پروہت جی نے — سندیسا دے کر؟"

"جی ہاں۔"

"کیا سندیسا ہے؟"

"وہ کہتے تھے۔ مہارانی۔ تم کسی کے بھلے کی خاطر اپنی جان تک بھی قربان کرنا جانتی ہو۔"

"مجھ میں یہ طاقت کہاں —"

"پھر بھی —"

"اچھا تو پھر"

"پھر ماتا — انہوں نے کہا تھا کہ سونگے کے دن تمہاری دو بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے موہت کر لیا ہے —" اور چندیر کے آنسو زمین پر ٹپکنے لگے۔ مہارانی نے کچھ افسردہ اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"چندیری بھائی — اس میں تمہارا گناہ کیا ہے۔"

یہی تصور ہے ماتا — کہ اپنے بچن کے بس ہو کر اپنی ماتا کو ایک ایسا سندیسا دے رہا ہوں . . . اپرادھی ہوں۔"

"چندیری — گھبراؤ نہیں — ایشور نے پروہت جی کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ اگر میں ان کے پریم کا جواب پریم میں نہ دے سکی تو ان کا تپ نامکمل رہ جائے گا۔ وہ سب منزلیں طے کر چکے ہیں۔ صرف ایک ہی سبق کی ضرورت ہے — میں اُن کے بھلے کے لئے سب کچھ کر دوں گی —!"

"ماتا — آپ کا پتی برت دھرم نشٹ ہو جائے گا۔"

"میں ہندی استری ہوں۔"

چندیر کے آنسو واپس آنکھوں میں گم ہو گئے۔ کسی امید اور آس میں گھر چکنے کے بعد جوش کو دباتے ہوئے چندیر نے کہا۔

"ماتا — تیری سدا ہی جے!"

(۵)

یہ اگلی شب کا ذکر ہے۔ راج پروہت مسہری پر لیٹے تھے۔ چاند کی چاندنی دریچے سے گذر کر راج پروہت جی کی مسہری پر پڑ رہی تھی۔ زرد رنگ کی بھالر سنہری دکھائی دیتی تھی — اور معلوم ہوتا تھا جیسے پربھو راج پروہت — گزشتہ واقعات پر غور کر رہے ہوں۔

راج پروہت نرم نرم گدگدی مسہری پر بہایت اضطراب کی حالت میں کروٹ پر کروٹ لے رہے تھے۔ مسہری کے پاس پڑی کھڑاؤں کے نزدیک بیٹھے ہوئے چندیر نے کہا

"تو پربھو — آپ کا تپ مکمل ہو جائے گا۔"

"کیا سچ مچ؟"

— اور راج پروہت مسہری پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیادہ توجہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اور کچھ بتاؤ — میرے چندیر — میرے جلے دل پر چندن کا پانی چھڑک دو —"

"ہاں تو — انہوں نے کہا تھا — اپنے منہ سے کہیں پریم کا جواب پریم میں دوں گی — اور کہا تھا کہ اُن کا تپ ادھورا نہیں رہنا چاہئے"

"یعنی — یعنی — وہ بھی مجھ سے پریم کرتی ہیں . . . مجھے بہشت کی رسائی سے زیادہ سکھ ملا۔ چندیر — آخر!"

چندیر کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ گھبراہٹ سے اس نے کہا "اور میں نے دیکھا کہ اُن کی ساڑھی تر بتر ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے گھڑوں پانی

انڈیل دیا ہو"

آنسوؤں سے ـــــ میرے لئے وہ . . . "

" . . . "

کیا یہ سچ ہے یا ایک خواب ہے؟" اور پربھو راج پروہت دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔ چاند کی چاندنی نے ہر ایک چیز کو اپنی روپہری اور آرام دینے والی گود میں لے لیا تھا اور ہوا پنکھا کر کے خاموشی کی لوریاں دے رہی تھی۔

" ـــــ اور پربھو ـــــ انہوں نے بھی پریم سندیسا دیا ہے ـــــ وہ کہتی تھیں کہ یہ ایک ناچیز شے ہے جو آپ کے متبرک قدموں کی بھینٹ کی جا رہی ہے" اور چندیری نے تھال راج پروہت جی کے آگے کر دی ـــــ تھال پر ایک ڈھکنا تھا جو لشتایدکسی رکابی کو ڈھک رہا تھا اور اس کے گرد پھول بکھر رہے تھے اور دھوپ مدھم مدھم جل رہا تھا اور اپنی خوشبو کو چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔

"تم نے دیکھا ـــــ یہ کیا ہے چندیری ـــــ؟" راج پروہت نے حریصانہ انداز سے تھال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں پربھو ـــــ مجھے ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا۔"

اور جس طرح ایک چاندنی رات کو چندیری نے ستار پر سے ایک جلن کے ساتھ اپنی انگلیوں کو اٹھا لیا تھا اور مہارانی کی بے چین آنکھوں سے دو قیمتی موتی ـــــ آنسو تحفہ میں چندیری کو دئے تھے۔ اسی طرح ایک جلن اور تڑپ کے ساتھ راج پروہت جی نے دریچے کو چھوڑا تاکہ کوئی موتی ـــــ کوئی نایاب تحفہ مہارانی رمتا کی طرف سے بھیجا ہوا پا کر اس کا پوجن کیا کریں ـــــ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے راج پروہت جی نے ڈھکنا اٹھایا اور تھال کو ایک قندیل کے نیچے لے گئے ـــــ ایک چیخ سنائی دی۔ چندیری کے ہاتھ سے پھر ایک دفعہ تھال گر پڑا۔ راج پروہت نے زور سے کہا۔

"آہ! آج برسوں کی تپسیا مکمل ہوئی ہے"۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل گئے۔ چندیری ـــــ ما تا رمتا کے پجاری ـــــ بے ہوش ہو گئے۔

چمکتے ہوئے بلوریں فرش پر بہت سے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ جن پر قندیل کی روشنی اور چاند کی چاندنی مل کر پڑ رہی تھیں اور اُن پھولوں کے درمیان پڑی تھیں ـــــ دو موٹی موٹی ـــــ بے رونق آنکھیں!!!

راجندر سنگھ بیدی

غزل

کیا زندگی ہے فخرِ زمانہ — دل عاشقانہ، جی والہانہ،
پوچھو نہ ربطِ حسن و محبت — کچھ سب پہ ظاہر، کچھ غائبانہ
یاد آ رہے ہیں اِک ایک کر کے — پچھلی محبت، اگلا زمانہ،
دیکھو تو دو ہیں، سمجھو تو یکساں — اُن کی کہانی، اپنا فسانہ
دل کو مٹا دے یا حسرتوں کو — سمجھوں گا تو نے بخشا خزانہ
آنکھوں سے دل تک آتا ہے کوئی — گہہ خاص ہو کر، گہہ عاجمانہ
پھر سن رہا ہوں سونی فضا میں — دلچسپ نغمے، دلکش ترانہ
دل ہے کہ مثلِ سیماب لرزاں — اُن کی نظر تھی، یا تازیانہ

کیا بات حرماں تیرے سخن کی[1]
جو بات لکھی، سو شاعرانہ،

حرماں خیرآبادی

[1] وزن تعلی ہو گئی ہے، ورنہ اصلیت سے بعید بھی نہیں ہے۔

نغمۂ خاموش

وہ نغمہ جو فروزاں ہے سحر کے روئے تاباں میں
وہ نغمہ سو رہا ہے جو شبِ ظلمت کے داماں میں

وہ نغمہ جو گلوں سے پھوٹ نکلا رنگ و بو ہو کر
وہ نغمہ جو رگِ ہستی میں رقصاں ہے لہو ہو کر

وہ نغمہ جس کی خاموشی ہے صحرا و بیاباں میں
وہ نغمہ جس کی رنگینی ہے دامانِ گلستاں میں

وہ نغمہ جس کی لے پر رقص میں خورشید و انجم ہیں
وہ نغمہ جس کی سرمستی سے موجوں میں تلاطم ہیں

وہ نغمہ جو تبسم بن گیا ہے لالہ زاروں میں
وہ نغمہ جو سکوں بن کر چھپا ہے کوہساروں میں

وہ نغمہ جو صبا کی مست رفتاری میں رقصاں ہے
وہ نغمہ جو مہِ پُرنور کی کرنوں میں لرزاں ہے

وہ نغمہ جس کو جنگل کی ہوائیں گنگناتی ہیں
وہ نغمہ چاندنی شب کی فضائیں جس کو گاتی ہیں

وہ نغمہ جھولتا رہتا ہے جو خوشبو کے جھولوں میں
وہ نغمہ لے رہا ہے سانس جو مدہوش پھولوں میں

وہ نغمہ جو شفق بن کر عیاں ہے بامِ گردوں پر
وہ نغمہ تیرتا پھرتا ہے جو دریائے میگوں پر

وہ نغمہ گردشِ شام و سحر ہے زیر و بم جس کا
وہ نغمہ سازِ عالم میں ہے سوزِ دمبدم جس کا

وہ نغمہ جو مرے محبوب کی آنکھوں میں خنداں ہے
وہ نغمہ جو مرے محبوب کے چہرے پہ رقصاں ہے

وہ نغمہ وہ سراپا لذّت و شیرینی و مستی
وہ نغمہ، آہ وہ روح و روانِ پیکرِ ہستی

وہ روحِ عشق کی سرمستیوں کا جاوداں نغمہ
بہارِ حُسن کی رنگینیوں کا گلفشاں نغمہ

وہ نغمہ وہ زمین و آسماں کا دلربا نغمہ
وہ نغمہ بربطِ کون و مکاں کا بے صدا نغمہ

مری ہستی پہ بھی چھایا ہوا ہے آرزو بن کر
سمایا ہے وہ میری روح میں بھی ہاؤ ہو بن کر

پلٹ جاتا ہے لیکن آہ! آ آ کر مرے لب تک
رہے گا غرقِ خاموشی یہ نغمہ اے خدا کب تک

مرے لب پر پہنچتے ہی بس اک فریاد ہوتا ہے
یہ نغمہ آ کے میرے شعر میں برباد ہوتا ہے

اثر صہبائی

کمار

(تمثیل کرنے کی اجازت مصنف سے لینی ضروری ہے)

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

ڈرامے کے افراد:—

مہیش —— وملا

راج —— کمار

منظر:—

[دو ملا کمرے کی سجاوٹ میں مشغول ہے۔ سامان کا ایک انبار لگ رہا ہے۔ کونچ، ایک دو کرسیاں، کرسیوں کی گدیاں، کتابیں، تصویریں وغیرہ۔ وملا کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز کو کمرے میں رکھے اور کس چیز کو باہر نکالے۔ داہنی طرف کی دیوار کا دروازہ سیڑھیوں میں کھلتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دو دروازے اندرونی کمرے میں کھلتے ہیں، بائیں دیوار میں دو الماریاں۔ دروازوں کے شیشوں پر سفیدی کے نشان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کمرے میں سفیدی گویا حال ہی میں ہوئی ہے۔ ایک میز پر ریڈیو کا سیٹ داہنی طرف کے دروازے کے بائیں طرف]

وملا۔ [گھڑی دیکھ کر] اُف صرف بیس منٹ اور — اور یہ سامان!

[سیڑھیوں کی طرف جاتی ہے۔ آواز دیتی ہے] مہیش آتے کیوں نہیں؟ [ٹھہر کر] کیا کر رہے ہو؟

[واپس آتی ہے چند کتابوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ گدیوں کو کرسیوں پر رکھتی ہے۔ مہیش شور مچاتا داخل ہوتا ہے وملا ایک گدی اٹھاتی ہے]

وملا۔ [مہیش کی طرف گدی پھینک کر] یہ رہی تمہاری گدی۔ بڑے چل کر آئے تھے کلکتے سے کام کرنے کے لئے۔

مہیش [ہنستا ہے۔ گدی اٹھا کر ایک کرسی پر رکھتا ہے] کلکتے سے کمرہ تو سجانے آیا ہی تھا۔

وملا۔ [کتابوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے] یوں نہیں کہ جھاڑن لے کر کرسیاں صاف کر دے۔

مہیش۔ اور تم۔ صبح سے تم نے کیا ہی کیا ہے!

وملا۔ [چند کتابیں اٹھا کر الماری میں رکھتی ہے] کچھ نہیں جناب۔ گھڑی دیکھی آپ نے!

مہیش۔ بہت وقت ہے ابھی۔

وملا۔ [نقل اتار کر] بہت وقت ہے ابھی۔ اٹھارہ منٹ۔ سنا اور اس کمرے کا سامان!

مہیش۔ پھر سے بناؤ تو ویسا منہ۔ بھئی سچ جانو تم منہ بنا کر بڑی اچھی لگتی ہو۔

[وملا خاموش رہتی ہے]

یہ کتابیں [ہنستا ہے] دو ملا بھی تمہاری داد دے گا۔ کوئی الٹی سیدھی۔ خیال ہی نہیں کہ کیا کر رہی ہو۔

وملا۔ [کتابیں نیچے پھینک کر] خود ہی رکھ لو۔

مہیش۔ چلو جی۔ چھٹی ہوئی اور پھر کہتی ہو کہ اٹھارہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

وملا۔ تم نکل جاؤ اس کمرے سے۔ بکواس کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں۔

مہیش۔ [کرسی پر بیٹھ کر] میں چلا جاؤں گا۔

وملا۔ تو چلے جاؤ دھمکاتے کیسے ہو [اس کے بالوں کو پکڑ کر] کام کرو گے کہ جاؤ گے۔ جلدی بولو جلدی۔

مہیش۔ اوہ۔ چھوڑ دو بھی۔ میں کروں گا۔

وملا۔ کیا؟

مہیش۔ یہی کام۔

وملا۔ کیا کام؟

مہیش۔ ارے بابا کہہ تو دیا کام۔ یہی نہ کتابیں میز پر رکھ دوں گا۔ تصویریں لگا دوں گا۔

وملا۔ اور؟

مہیش۔ اور جو کہو گی۔

وملا۔ [بال چھوڑ کر] ہاں تو اب آئے سیدھے راستے پر۔ اٹھاؤ ان تصویروں کو

مہیش۔ [بال ٹھیک کرتے ہوئے] ایک ہی دیوار میں لگا دوں سب؟

وملا۔ پھر وہی شرارت۔ تصویریں لگانے کا وقت نہیں رہا۔

مہیش۔ تو دولھا کیا دیکھے گا آکر۔ دیواریں تصویروں سے خالی۔ دری میلی سی کوچ کرائے کے۔ کتابیں پرانی۔ شیشیوں پر سفیدی کے نشان۔ لاؤ جھاڑن صاف کر دوں۔

[شیشے صاف کرتا ہے]

وملا۔ کوچ کرائے کے۔ شرم تو نہ آئی ہوگی یہ کہتے۔

مہیش۔ شرم کی ایک ہی کہی۔

وملا۔ بے شرم جو ٹھہرے۔ تم ہی بازار سے لائے نہ ان کو۔ اس سے تو ہمارے کوچ اچھے ہیں۔

مہیش۔ کام کرنے دو مجھے [منہ سے سیٹی بجاتا ہے]

وملا۔ [میز پر کتابیں رکھتے ہوئے] یہ باجا بند کرو جی!

مہیش۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ گرامر کی کتابیں کیوں رکھ رہی ہو۔ آخر ان کو یہاں رکھنے سے کیا حاصل ہوگا۔

وملا۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ گرامر کی کتابیں ہیں یا ناول ہیں۔

مہیش۔ ناول [ہنستا ہے] اگر کہو تو منٹوں میں ایسی کتابوں کا ڈھیر لگا دوں۔ ساری کباڑی کی دکان یہاں لے آؤں۔

وملا۔ آج معلوم ہوتا ہے تم پٹو گے۔

مہیش کلکتے میں آؤ تمہیں وہ وہ کتابیں دکھاؤں کہ بس۔

وملا۔ بہت دیکھیں تمہاری کتابیں۔ nudism-sex بکواس بکواس سارا دن بکواس۔

مہیش۔ کام کرنے دو گی کیوں ہی شور مچاتی رہو گی۔

وملا۔ تمہارا کلکتے میں رہنا فضول ہے۔ یہاں کے کالج بند نہیں ہو گئے۔ تین سو دیدی کو ملتا ہے۔ سکول کا معاملہ ہے کسی دن جواب مل جائے۔ سو تمہیں چلا جاتا ہے۔ گویا یہ سو ضائع کیا جاتا ہے۔ سنا تم نے بالکل فضول۔ بس۔ دیدی کو آنے دو [اور کتابیں اٹھاتی ہے]

مہیش۔ اور تم بہت خوب۔ تمہارا پڑھنا لکھنا بند۔ تھرڈ ایر کافی ہے۔ بی اے بن کر کیا کرو گی۔ دیدی نے تو ایک شہزادہ ڈھونڈھ ہی لیا۔ تم بھی . . .

وملا۔ [مہیش کی طرف کتاب پھینکتی ہے] بدزبان!

مہیش۔ یہ کتابوں کی قدر ہو رہی ہے۔ دیدی کو آنے دو۔

وملا۔ پھر کیا ہوگا؟

مہیش۔ اب ہم ریڈیو بجاتے ہیں۔

وملا۔ خبردار!

مہیش۔ آج کا پروگرام . . .

وملا۔ ہاتھ تو لگاؤ ذرا۔

مہیش۔ مانا کہ تمہیں اسٹریٹیڈ وجلی نے انعام میں دیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سے کہ . . .

وملا۔ میں مطلب وطلب کچھ نہیں جانتی۔

مہیش۔ آج دو دولھا کو ریڈیو سنائیں گے۔

وملا۔ وہ پرنس ہے پرنس جناب! اس کے ہاں سینکڑوں ایسی چیزیں ہونگی

مہیش۔ ہوگا پرنس [وملا کی طرف جاتے ہوئے] آخر دیدی کو کیا سوجھی وملا؟

وملا۔ میں کیا جانوں۔

مہیش۔ [وملا کے ہاتھ سے کتاب چھین کر] یعنی میرا مطلب ہے یہ کارروائی شروع کس طرح ہوئی؟

وملا۔ [ناراضگی سے] مجھے نہیں معلوم [کوچ پر بیٹھ جاتی ہے]

مہیش۔ بس ختم ہو گیا کام۔

وملا۔ [جل کر] جی ہاں۔

مہیش۔ میں تو کتابیں دیکھنے آیا تھا

وملا۔ رکھ تو پھر۔

مہیش۔ اور تم کیا کرو گی۔ دیدی اور ہمارے . . . اور ہمارے . . . وملا سچ یہ تو بتاؤ سمران کو بلایا کیا کریں گے؟

وملا۔ تم تو کلکتے جا کر زیادہ بے وقوف ہو گئے۔

مہیش۔ میرا مطلب ہے جیجا جی یا سرکار۔ آخر شہزادہ جو ٹھہرا۔

وملا۔ [ہنس کر] سرکار۔

مہیش۔ ہاں بہری ننھی اچھی سی بہن اب تو جو ہنس پڑی تو اس کا یہ مطلب ہو کہ تمہاری ناراضگی دور ہو گئی۔ کیوں ہو گئی کہ نہیں؟

وملا۔ نہیں۔

مہیش۔ بڑی ضدی ہو۔

وملا۔ کتابیں رکھو کتابیں ابھی وہ آئے کہ آئے۔

مہیش۔ دیدی سٹیشن پر آدھ گھنٹہ پہلے ہی کیوں چلی گئیں۔

وملا۔ انہی سے پوچھ لینا۔

مہیش۔ ہاں تو دیدی کو بمبئی سے خط آیا کہ ہم تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں ہم دلی میں ہیں اور بمبئی میں اپنے محل میں رہتے ہیں پھر کیا ہوا؟

وملا۔ تمہیں معلوم تو ہے۔

مہیش۔ بہت کم۔ یہی کہ ہم پی ایچ ڈی ہیں۔ ایم اے ہیں۔ بی اے ہیں۔ یہی کچھ۔

وملا۔ ہاں۔

مہیش۔ پھر دیدی کی طرف سے خط گیا اور یوں کارس پانڈنس شروع ہوگئی اور پھر جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ اور اگر کوئی ایسا ویسا نکل آیا تو؟

وملا۔ خاموش رہو۔ زبان درازی کی بھی حد ہوتی ہے۔

مہیش۔ لو اور سنو۔ اچھا وملا کمرہ تو یہ سجنے سے رہا اب . . .

وملا۔ [کوچ سے یک دم اٹھ کر] اومیں آخر کیا کروں۔ تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔

[پھر کمرے کی سجاوٹ میں مشغول ہو جاتی ہے]

مہیش۔ دیکھو میں تمہیں منٹوں میں کمرہ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔

وملا۔ کر چکے ٹھیک۔

مہیش۔ یہ ریڈیو کہاں رکھا جائے گا؟ [سوچ کر] نہیں پہلے کتابوں کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

[سینی بجاتا ہے]

[چند کتابیں ایک طرف کر دیتا ہے۔ جھاڑن لے کر الماری صاف کرتا ہے اور پھر زور سے وملا کی طرف جھاڑن کی گرد اڑاتا ہے۔

وملا ناک پر رومال رکھ لیتی ہے]

وملا۔ بے شرم!

مہیش۔ دیکھا۔ یوں کام ہوا کرتا ہے!

[وملا ایک اور جھاڑن لے کر ریڈیو صاف کرتی ہے]

مہیش۔ [الماری میں کتابیں رکھتے ہوئے] وملا میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارے جیجا جی کی شکل کیسی ہوگی۔

وملا۔ تم سے اچھی ہی ہوگی

مہیش۔ ہاں مجھے اس سے کب انکار ہے مگر ہوگی کیسی؟

وملا۔ ابھی دیکھ لینا۔

مہیش۔ اوہو۔ تم تو سمجھتی ہی نہیں۔

وملا۔ [جیسے کہ سخت ناراض ہے] اچھی طرح سمجھاؤ نا۔

مہیش۔ قیاس لگانے میں کیا ہرج ہے؟

وملا۔ سچی جو ٹھہرے۔

مہیش۔ ناک تو ضرور چپٹی ہوگی۔

وملا۔ اور قد؟

مہیش۔ چھوٹا۔

وملا۔ اور . . .

مہیش۔ قد کی تو یہ بات ہے کہ دیدی کا قد اور سرکار کا قد ایک برابر ہوگا۔

وملا۔ دیدی اگر یہ باتیں سن لے!

مہیش۔ پھر کیا ہوگا؟

وملا۔ مرمت!

مہیش۔ مجھے فوراً کلکتے بھیج دیا جائے گا۔ وہ دیکھنا اس اخبار میں ریڈیو کا پروگرام ہے؟

[وملا فرش پر گرے ہوئے اخبار کو اٹھا کر پروگرام دیکھتی ہے]

مہیش۔ اور رنگ وملا!

وملا۔ دہلی اور بمبئی دونوں کا پروگرام اچھا ہے۔ دہلی سے اُس ۹۶ میٹر کا دوسرا حصہ براڈ کاسٹ ہو رہا ہے۔

مہیش۔ سچ! کتنے بجے؟

وملا۔ تم نے ابھی کیا پوچھا تھا۔

مہیش۔ سرکار کا رنگ۔

وملا۔ کام کی بات کرو گے کہ یونہی بکواس کرتے جاؤ گے۔ ہو گیا مذاق بدبدا...

مہیش۔ سن لیا جناب۔ سن لیا۔

وملا۔ فوٹو کیوں نہیں دیکھ لیتے۔

مہیش۔ فوٹو! جلدی دکھاؤ۔ کہاں ہے؟

وملا۔ دیدی کے پاس۔

مہیش۔ کس میں ہوگا!

وملا۔ اور اس میں تالا لگا ہوا ہے۔

مہیش۔ تو تم خوش قسمت رہیں۔

وملا۔ وہ کیونکر؟

مہیش۔ فوٹو جو دیکھ لیا۔

وملا۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔

[مہیش کے ہاتھ سے ایک کتاب نیچے گر جاتی ہے کتاب میں سے ایک لفافہ نکل کر باہر آجاتا ہے]

مہیش۔ [لفافہ اٹھا کر] یہ خط۔

وملا۔ دیدی کا ہوگا۔ غلطی سے کتاب میں پڑا رہ گیا ہوگا۔

مہیش [مہر دیکھ کر] بمبئی ـــ خوب!

وملا۔ خبردار جو پڑھا۔

مہیش اتنا ہی پرائیویٹ خط تھا تو یوں کیوں پھینکا۔

وملا۔ بھئی خیال نہیں رہا ہوگا۔

مہیش اس خیال کے نہ رہنے کا معاوضہ۔

وملا یعنی؟

مہیش۔ یعنی یہ کہ ـــ کہ . . .

وملا [خط چھیننے کی کوشش کرتی ہے] تمہارا کیا حق ہے کہ اس خط کو چھو

مہیش میں پڑھنے کب لگا تھا؟

وملا۔ کوشش تو یہی کر رہے تھے۔

مہیش۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ سرکار نے اخبار کا اخبار ہی لکھ مارا۔ [لفافہ میں سے خط نکالتا ہے۔ ایک چھوٹا سا فوٹو نیچے گر پڑتا ہے]

مہیش [خوش ہو کر] فوٹو [وملا آگے بڑھ کر جلدی سے فوٹو اٹھا لیتی ہے]

وملا۔ کیوں جی اب بولو!

مہیش۔ ذرا دکھاؤ نا۔

[دونوں کوچ پر بیٹھ جاتے ہیں]

وملا۔ ناک چپٹی!

مہیش۔ دیکھا میرا بجوم!

وملا اور رنگ کالا!

مہیش۔ تم تو ٹھہریں بے وقوف!

وملا [اٹھتے ہوئے] اور جناب . . .

مہیش کبھی فوٹو سے بھی رنگ کا پتہ لگا ہے۔

وملا۔ یہ میرا بجوم ہے۔

مہیش۔ ہاں تو یوں کہو نا۔

[ایک تانگے کے گزرنے کی آواز آتی ہے۔ وملا اور مہیش دونوں چونک اٹھتے ہیں]

وملا۔ آگئے!

مہیش۔ وملا جلدی کرو۔

[کمرے میں گویا ایک سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ چند تصویروں اور کتابوں کو کوچ کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ دری کو ٹھیک کیا جاتا ہے مہیش دیوار میں تصویر لٹکانے کی کوشش کرتا ہے کیل اڑ جاتی ہے اور تصویر نیچے گر جاتی ہے شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے]

وملا۔ [غصے میں] توڑ دیا نا بے وقوف!

مہیش۔ تانگہ شاید آگے نکل گیا [شیشے کے ٹکڑے اٹھاتا ہے]

وملا۔ کمرہ تو ٹھیک ہو گیا۔

مہیش۔ خاک ٹھیک ہوا۔ جان ہی تو نکل گئی تھی۔

وملا۔ کہتی نہ تھی ان تصویروں کو رہنے دو۔

مہیش۔ خیر [ٹکڑے اٹھا کر] انہیں رکھوں؟

وملا۔ [کوچ پر بیٹھ کر] رکھ دو کوچ کے نیچے۔

مہیش۔ [میز پر رکھ کر] ہاں وہ فوٹو [کتاب میں لفافہ رکھتا ہے اور کتاب الماری میں رکھ دیتا ہے]

وملا۔ [جمائی لے کر] تھک گئے!

مہیش۔ جی ہاں بہت کام کیا جو تھک گئے۔

وملا۔ صفائی کس نے کی؟

[ایک تانگے کے رکنے کی آواز آتی ہے]

وملا۔ [کوچ سے اچھل کر شیشے کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتی ہے] ان کو تو اٹھاؤ۔

مہیش۔ میز کی طرف بڑھتے ہوئے] رکھوں کہاں؟

وملا۔ [چلا کر] رکھوں کہاں رکھوں کہاں۔ یہ بھی رکھنے کی چیز ہے؟

[وملا جلدی سے ٹکڑے اٹھا کر الماری میں رکھ دیتی ہے۔ مہیش دروازے کی طرف بڑھتا ہوا پھر واپس لوٹ آتا ہے]

مہیش۔ اب تو واقعی آگئے۔

وملا۔ [دروازے کے ایک شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر بال ٹھیک کرتی

ہوئی] دیدی اکیلی ہی آئیں یا . . .

[راج اور کمار داخل ہوتے ہیں۔ راج کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ کوئی بہت مغموم اور پریشان ہو مگر ظاہر نہ ہونے دے نقش اچھے۔ آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے۔ جب کمرے میں داخل ہوتی ہے توچہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ۔ جیسے کوئی زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کمار کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس۔ رنگ کا اسا۔ ناک چپٹی۔ سب ذرا موٹے۔ ہاتھ چوڑا۔ قد درمیانہ۔ کپڑے بہت اچھے نہیں مگر باوجود ان باتوں کے کچھ عجیب کیریکٹر کا انسان معلوم ہوتا ہے دوران گفتگو میں اپنا ہونٹ سر پر پھیرتا رہتا ہے۔ پھر وہی ہاتھ ٹائی کی ناٹ Knot پر جا پڑتا ہے۔ مہیش اور وملا کمار کو دیکھ کر کچھ حیران کچھ مایوس گویا عجیب حالت میں نظر آتے ہیں]

راج۔ وملا!

وملا۔ اوہ دیدی۔ آگئیں [کمار کو دیکھ کر مہیش کی طرف دیکھتی ہے]

کمار۔ ہوں۔ [کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر] یہ مکان جلد بدلنا ہوگا [سوٹ کیس نیچے رکھ کر] دیواریں [پھر وملا کی طرف بڑھتا ہے] آپ۔ خوب [ہنستا ہے]

راج۔ وملا میری چھوٹی بہن: اور مہیش میرا چھوٹا بھائی!

کمار۔ بہت خوب بہت خوب [ہاتھ ٹائی کی Knot پر جاتا ہے] تم مہیش اور تم [وملا کا بازو پکڑ کر] وملا اور آپ۔ ہاں مگر یہ مکان بدلنا ہوگا

مہیش [بے رخی سے] او۔ آپ [راج مہیش کی طرف گھور کر دیکھتی ہے]

راج۔ ان دونوں میں کوئی ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ دن بھر لڑتے رہتے ہیں

مہیش۔ ہم تو نہیں لڑتے دیدی۔ سرکار دیکھیے . . . .

کمار۔ سرکار۔ ہم پنی Sir ہیں اس وقت [راج سے] آپ نے شاید . . .

راج۔ [مسکرا کر] انہیں معلوم ہے۔

وملا۔ [بازو چھڑا کر] آپ بیٹھیے تو سہی۔

کمار [اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر] تم بہت اچھی ہو۔ کس کلاس میں پڑھتی ہو: ہم تمہیں ولایت بھیج دیں گے۔ کیوں راج جی آخر ہرج ہی کیا ہے؟

راج۔ [مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے] کیا ہرج ہے۔

مہیش۔ [کمار کے لباس کی طرف دیکھ کر] آپ لباس تبدیل کیجئے گا۔

سفر کی . . .

کمار۔ ہاں۔ لباس۔ ضرور۔ ہاں راج جی میں راستے میں کیا کہہ رہا تھا یہی نا لباس کے متعلق۔ کچھ لایا ہی نہیں ساتھ۔ آخر لاتا بھی کس طرح!

مہیش۔ تو تو آپ . . .

کمار۔ تم جانو Uncle اس بات سے ناراض ہیں کہ میری شادی ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی ہے جو Princess نہیں۔ چپکے سے چلا آیا اور Uncle کی جائیداد کا مالک میں تمہارا راج سے تو میرا تعلق ہی نہیں۔ بالکل۔ مجھے ریاست کی ضرورت نہیں۔ سنا۔

مہیش [دبی زبان میں] جی!

کمار۔ کیا کہا تم نے؟ ہاں تم کیا کرتے ہو؟

راج۔ کلکتے میں پڑھتا ہے۔

وملا۔ بی اے کا امتحان دے گا۔

کمار۔ مگر کلکتہ کیوں؟

مہیش۔ Scholarship جو ملتا ہے۔

کمار۔ جب میں نے لندن میں ایم اے کا امتحان دیا تو فرسٹ نکلا۔ مجھے پچاس پونڈ کا انعام ملا۔ مگر مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ آخر اتنا روپیہ لے کر کیا کروں۔ یہ پچاس پونڈ تو ہسپتال میں دے دیجئے۔

مہیش۔ بہت اچھا کیا آپ نے۔

کمار۔ تم تو بی اے کے بعد جرمنی جا سکتے ہو۔ بھیج دوں گا کیوں راج جی؟

[راج خاموش رہتی ہے]

مہیش۔ جرمنی!

کمار۔ جرمنی اور کیا Hitler کو میں جانتا ہوں۔ سنا ہے Hitler کو Paper Machete تمہارے لئے بہت موزوں رہے گی۔

راج۔ [ہنس کر] آپ نے تو ابھی سے ساری سکیم سوچ لی۔

کمار۔ Uncle سے یہی تو جھگڑا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں سکیم سوچنے سے پہلے ان سے ذکر ہو جایا کرے۔ مجھ سے یہ ہو نہیں سکتا اور ہو بھی کیونکر Uncle پرانے خیالات کے آدمی ٹھہرے۔ میں دنیا کا ہر گوشہ دیکھ چکا ہوں۔

مہیش۔ [شرارتاً] افغانستان گئے آپ؟ [راج پھر مہیش کی طرف گھور کر دیکھتی ہے]

کمار۔ [ہنس کر] دو دفعہ۔ اور میرا ان اللہ کے پاس ہی ٹھیرا۔

راج آپ تھکے ہوئے ہیں، باقی باتیں پھر کریں گے۔ کچھ . . .

کمار۔ [مہیش کی طرف بڑھتے ہوئے] وہاں سے ایک ہتھیار لایا جو آج سے سو سال پہلے کسی لڑائی میں استعمال کیا گیا تھا۔

وملا۔ گرم پانی بھی تیار ہے دیدی!

مہیش ہتھیار کا نام؟

کمار۔ یہی ہتھیار [سر پر ہاتھ پھیر کر] یہی — آخر کچھ نام ہوگا ہی نا۔ ہمیں نام سے کیا مطلب۔ دیکھ ہی لوگے۔ میرے محل میں وہ وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

مہیش۔ [جیسے کہ کمار کی باتیں بہت شوق سے سن رہا ہے] مثلاً؟

کمار۔ ایک ایک تصویر دس دس بیس بیس ہزار کی اور یہ دیواریں [راج سے] آپ کو تصویروں کا شوق نہیں۔ ہو جائے گا [مہیش سے] اور تمہیں! [پھر وملا سے] اور تمہیں! اوہ . . . !

مہیش مجھے تو ہے۔

وملا۔ [راج کی طرف دیکھ کر۔ کمار سے] غسل کیجئے گا۔

کمار۔ غسل [ہنستا ہے] راج جی آپ خاموش کیوں ہیں۔ میری باتیں شاید پسند نہیں۔

راج۔ [زبردستی ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی] پسند کیوں نہیں۔ مگر آپ پہلے غسل کیجئے۔ منہ ہاتھ ہی دھو لیجئے۔ کچھ کھائیے۔ پھر باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔

کمار ٹھیک کہتی ہیں آپ [ریڈیو دیکھ کر] آہا ریڈیو!

مہیش۔ آج کا پروگرام بڑا اچھا ہے۔ سنئے گا؟

کمار۔ میرے ہاں چار ریڈیو سیٹ ہوں گے۔

راج آئیے [دروازے کی طرف جاتی ہے]

کمار۔ تو آپ سب موسیقی کا شوق رکھتے ہیں [راج اور کمار دونوں اندرونی کمرے کے دروازے سے جاتے ہیں]

[مہیش دروازے کی طرف جاتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ برابر کے کمرے میں نہیں، وملا کے قریب آجاتا ہے]

مہیش۔ وملا!

وملا۔ [آہستہ سے] مہیش!

مہیش یہ دیدی نے کیا کیا!

وملا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟

مہیش۔ ہوگا معمولی سی ریاست کا پرنس گرنسکل . . .

وملا۔ شکل سے تو نظر نہیں آتا۔

مہیش۔ دیدی نے کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔

وملا۔ ہمارا ہے ہی کون۔ کس سے پوچھتیں!

مہیش۔ خود بمبئی چلی جاتیں۔ مجھے ہی بھیج دیتیں۔

وملا۔ آخر دیدی نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔

مہیش۔ فضول باتیں نہ کیا کرو۔ اس میں سوچنے کی بات ہی کیا تھی!

وملا۔ اچھا ذرا آہستہ بولو۔ دیدی نے سن لیا تو خیر نہیں۔

مہیش۔ سن لیں پھر۔

وملا۔ اوہو۔ آج تو بڑے دلیر بن بیٹھے۔

مہیش۔ خیر ان باتوں کو جانے دو۔ باتیں تو خوب کرتا ہے۔

وملا۔ تمہیں جرمنی جو بھیجے گا۔

مہیش۔ اور تم انگلینڈ جو جاؤ گی۔ مگر کرو گی کیا؟

وملا۔ کپڑے تک نہیں لایا۔

مہیش۔ ہاں دیکھو نہ کپڑے تک نہیں لایا۔

وملا۔ مگر اس نے بتا تو دیا کہ چپکے سے چلا آیا۔

مہیش۔ اس سے نہ آنا اچھا۔

وملا۔ اب جب تک اور کپڑے نہ بنیں وہ باہر جا بھی نہیں سکتے۔

مہیش۔ اور پھر شادی۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ دیدی نے کیا کیا اور اب کیا کرے گی۔

وملا۔ کپڑے جو پہن رکھے ہیں وہ بھی تو کچھ عجیب ہی سے ہیں۔

مہیش۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا۔ مگر اس سوٹ کیس میں کیا ہے!

وملا۔ چھوٹا سا تو ہے۔ کپڑے تو ہوں گے نہیں اس میں۔

مہیش۔ کپڑے کہاں سے آئیں گے۔ کھول کر دیکھیں!

وملا۔ اور اگر کمار آگیا!

مہیش۔ آجانے دو۔ ہم کہیں گے اٹھانے لگے تھے کھل گیا۔

وملا۔ اور اگر دیدی آگئیں!

مہیش۔ تو تم اس کمرے سے چلی جاؤ۔ میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

وملا۔ اور اگر اس میں تالا لگا ہو پھر؟

مہیش۔ پھر کوئی اور چابی لگا کر دیکھیں گے۔

وملا۔ تو کھولو۔ میں دروازے کے پاس کھڑی رہتی ہوں۔ آواز سن کر تمہیں اشارہ کر دوں گی۔

[وملا دروازے کے قریب کھڑی ہو جاتی ہے۔ سوٹ کیس میں شاید تالا نہیں لگا تھا جو دبانے سے ہی کھل گیا]

مہیش۔ وملا ذرا آنا۔ یہاں کی بھی چیزیں دیکھ لو۔

[وملا اب سوٹ کیس کے قریب بیٹھ جاتی ہے]

مہیش۔ [ایک تولیا نکال کر] ایک تو رہا یہ تولیا۔

وملا۔ مہیش اسے بند ہی کر دو۔ شاید انہیں تولیے کی ضرورت ہو۔ مگر یہ کتابیں کیسی ہیں؟

مہیش۔ سب کچھ دکھا دیتا ہوں۔

[مہیش کتابیں نکال رہا ہے کہ راج داخل ہوتی ہے۔ وملا سہم سی جاتی ہے۔ مہیش کتابیں دکھ دیتا ہے]

راج۔ مہیش یہ کیا کر رہے ہو؟

مہیش۔ [سوٹ کیس بند کرتے ہوئے] کچھ نہیں۔ ایسے ہی [خاموش ہو جاتا ہے]

راج۔ ایسے ہی کیا! شرم تو نہ آئی ہوگی یہ کہتے۔ وملا!

وملا۔ [راج سے لپٹ کر] دیدی!

مہیش۔ دیدی، آپ اتنی اداس کیوں ہیں؟

راج۔ اداس! میں کیوں اداس ہوں گی؟

مہیش۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں دیدی۔ آپ نے کیا، آپ نے کیا سوچا دیدی

[راج خاموش سر نیچا کئے سوٹ کیس لے کر جاتی ہے۔ مہیش ریڈیو کی طرف جاتا ہے۔ وملا الماری کھول کر کتاب دیکھتی ہے۔ مہیش ریڈیو ٹیون (Tune) کرتا ہے۔ گھوں گھوں اور اس قسم کی مختلف آوازیں آتی ہیں]

وملا۔ [مہیش کی طرف مڑ کر] مہیش!

مہیش۔ [ریڈیو بند کر کے] دیکھا تم نے۔ دیدی کتنی اداس ہیں!

وملا۔ رنگ ہی بدل گیا ہے۔

مہیش۔ اب کیا کریں گی!

وملا۔ شادی۔

مہیش۔ Civil marriage

وملا۔ مگر کب!

مہیش۔ یہ تو دیدی ہی بتا سکیں گی۔

وملا۔ دیکھا جب تم نے سرکار کہا تو انہیں غصہ آگیا۔

مہیش۔ اونہہ [ریڈیو ٹیون (Tune) کرتا ہے] غصہ آگیا۔ بابا!

[ریڈیو سے گانے کی آواز آتی ہے۔ پھر گھوں گھوں]

وملا۔ بند کر دو!

مہیش۔ کیوں؟

[کمار داخل ہوتا ہے۔ چہرے میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ شاید منہ دھونے یا نہانے کا اثر ہو]

مہیش۔ آپ بڑی جلدی نہا لیتے ہیں۔

کمار۔ [ہنس کر۔ سر پر ہاتھ پھیرتا ہے] نہایا کہاں۔ اس طرح نہانے کی عادت ہی نہیں۔ میرا غسل خانہ دیکھو تو تمہیں معلوم ہو۔

مہیش۔ کہئے تو کل سے کچھ اور انتظام کر دیں۔

کمار۔ ہاں ہاں ہو جائے گا۔ یہ مکان تو بدلنا ہی ہوگا [میز سے اخبار اٹھاتے ہوئے] اگر یہ معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں بیسیوں لوگ ملنے آجائیں گے اور میں ملنے سے کتراتا ہوں۔ سنا۔ کسی سے کہہ نہ دینا۔

مہیش۔ جی نہیں۔

وملا۔ [ریڈیو کی طرف جاتے ہوئے] مگر کبھی نہ کبھی تو معلوم ہو ہی جائے گا۔

کمار۔ [بے پروائی سے] ہونے دو۔ ہاں تو آج کا پروگرام۔

مہیش۔ جی ہاں بہت اچھا ہے۔

[راج داخل ہوتی ہے]

راج۔ [مسکرا کر] ریڈیو

وملا۔ دیدی وہ جو چند دن ہوئے ایک ڈراما Broadcast ہوا تھا نا۔ اس کا دوسرا حصہ آج ہوگا۔

راج۔ وہ تو بڑی اچھی چیز تھی۔ مگر میں کچھ بھول سا گئی ہوں۔

مہیش۔ [ریڈیو ٹیون (Tune) کرتے ہوئے] واہ اتنی جلدی بھول بھی گئیں!

وملا۔ دیدی میں بتاؤں کیا تھا!

راج۔ [کمار سے] آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟

کمار۔ پروگرام ہی دیکھ رہا تھا [توقف] ہاں ابھی میں مہیش سے کہہ رہا تھا اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں سینکڑوں لوگ مجھ سے ملنے آجائیں گے۔

راج۔ [مہیش کی طرف دیکھ کر] نہیں جی مہیش کیوں کہے گا۔ گر

کمار۔ [اخبار میز پر پٹک کر اور راج کی طرف عجیب طرح دیکھ کر] کیا؟

راج۔ [کچھ سہم کر] سٹیشن پر بھی دو آدمی . . .

کمار۔ [جلدی سے] دو آدمی کیا؟

راج۔ آپ سے شاید ملنا چاہتے تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں؟

کمار۔ میں نہیں جانتا کون تھے۔

راج۔ آپ کو یاد نہیں ایک تانگہ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ وہ مکان کے آگے سے نکل گیا۔

کمار۔ [گھبرا کر۔ مگر گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے] مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیسے دو آدمی؟ کون تھے وہ؟ کیا پہن رکھا تھا انہوں نے؟ شکلیں کیسی تھیں؟

[کمرے میں چکر لگاتا ہے۔ پھر ٹھہر کر اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر]

اب لوگ چاہتے ہیں۔ میں برقع پہن کر نکلا کروں۔ واہیات۔ بالکل واہیات۔ سمجھتے نہیں ہیں کتنا مصروف آدمی ہوں۔

راج۔ [اس افسوس میں کہ اس نے یہ بات شروع ہی کیوں کی۔ بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے] ہاں وملا وہ ڈراما! کیا تھا؟

کمار۔ ڈراما! کیسا ڈراما! مجھے اس وقت ریڈیو کی ضرورت نہیں۔

راج۔ اس سے شاید آپ کی گھبراہٹ . . .

کمار۔ گھبراہٹ! آپ کے خیال میں میں گھبرا گیا تھا [ہنس کر] بمبئی میں سینکڑوں آدمی مجھ سے ملنے کے لئے گھنٹوں میرا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ میں پھر بھی نہیں گھبراتا۔ سمجھیں آپ [مہیش سے] ہاں جی ریڈیو!

[مہیش پھر ریڈیو on کرتا ہے]

مہیش۔ وملا اخبار دیکھنا۔ کتنا وقت باقی ہے؟

وملا۔ [اخبار اٹھاتے ہوئے] ڈرامے کا وقت۔

کمار۔ ڈراما ہے کیا؟ لکھا کس نے؟

وملا۔ کوئی پراشر ہے۔ مہیش ابھی دو منٹ باقی ہیں۔

[اس وقت ریڈیو سے کچھ گلنے کی آواز آتی ہے]

کمار۔ [گھبرا کر] پراشر! پراشر میرا . . .

راج۔ آپ کا دوست ہے۔

کمار۔ دوست ہاں۔ نہیں جی میرا نوکر تھا۔ سو روپے لیا کرتا تھا۔ نکال دیا اس کو۔ ممکن ہے یہ کوئی اور ہو مگر [پھر سوچ کر] اس نے لکھا کیا ہوگا۔

وملا۔ پہلا حصہ تو یوں تھا کہ ایک آدمی جو خود کو بہت امیر ظاہر کرتا ہے ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ وہ لڑکی اس خیال سے شادی کر لیتی ہے کہ وہ یوں اپنے غریب والدین کا سہارا ہو جائے گی مگر بعد میں . . .

کمار۔ مگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ وہ آدمی غریب تھا اور شاید بدمعاش بھی۔

وملا۔ جی۔

کمار۔ [زور سے قہقہہ لگا کر] کبھی ایسا بھی ہوا۔ ناممکن۔ خیر۔

وملا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی وہ تین شادیاں پہلے بھی کر چکا ہے اور پولیس اس کے پیچھے ہو جاتی ہے۔

کمار۔ [پھر قہقہہ لگا کر] پولیس! بھلا پولیس اس بات میں کیوں دخل دیگی۔ وہ تین شادیاں تو کیا دس شادیاں کر سکتا تھا۔ یہ پراشر کوئی اور ہوگا۔ میرا نوکر تو . . .

راج۔ جی ہاں کوئی اور ہوگا۔

[ریڈیو سے Dephi capp کی آواز آتی ہے پھر گھوں گھوں اور پھر ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے بادل گرج رہے ہوں]

مہیش۔ وملا لیمپ بجھا دو۔

راج۔ وہ کیوں؟

مہیش۔ ویدی ریڈیو سننے کا مزا ہی یوں آتا ہے۔ بتی بجھی ہو اور گانا ہو رہا ہو۔

راج۔ کوئی ضرورت نہیں لیمپ بجھانے کی۔

مہیش۔ [التجا آمیز لہجے میں] ویدی!

کمار۔ کیا ہرج ہے۔

[وملا یہ اشارہ پا کر لیمپ بجھا دیتی ہے۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی۔ مگر ریڈیو سے ویسی ہی آوازیں آتی ہیں اور پھر پستول چلنے کی آواز اور دو تین چیخیں]

کمار۔ اوہ!

راج۔ یہ کیا ہوا؟

وملا۔ اوہ ویدی!

مہیش۔ خاموش رہئے۔ سنئے۔

ایک لڑکی کی آواز [ریڈیو سے] بدمعاش تم سمجھتے تھے مجھے مار کر میرا زیور لے بھاگو گے اور پھر میری بہن . . .

آدمی کی آواز۔ تو تم سمجھتی ہو تمہاری چھوٹی بہن نے تمہیں بچا دیا۔ تم بچ کر نکل جاؤ گی۔ اونہہ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا۔

پہلی آواز۔ میں شور مچا دوں گی اور تم پکڑے جاؤ گے۔

دوسری آواز۔ شور مچا دوں گی۔ میں گلا نہ گھونٹ دوں گا۔ پہلے بھی تو شور مچانے لگی تھیں۔

کمار۔ اوہ میرا دل!

راج۔ آپ۔ مہیش بند کرو۔ وملا! [ریڈیو بند کر دیا جاتا ہے]

کمار۔ میرا دل!

راج۔ وملا۔ لیمپ کیوں نہیں جلاتی۔ جلدی کر۔

مہیش۔ کیا ہو جی؟

کمار۔ آہ میرا دل!

[وملا لیمپ جلاتی ہے۔ کمار اپنا سر کرسی کے نیچے لٹکائے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دبائے نظر آتا ہے۔ راج۔ کمار کی طرف دوڑتی ہے۔ مہیش اور وملا قریب آجاتے ہیں]

راج۔ [کمار کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر] مہیش ڈاکٹر۔

کمار۔ نہیں۔ ضرورت نہیں۔

وملا۔ آخر ہوا کیا؟

کمار۔ [کچھ سنبھل کر] کچھ نہیں ایسے ہی کبھی کبھی دل میں درد سا شروع ہو جاتا ہے۔

راج۔ [فکرمندی سے] کبھی پہلے بھی ہوا؟

کمار۔ ہو جایا کرتا ہے۔ مگر آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔

مہیش۔ اب کیا حال ہے؟

کمار۔ [اٹھ کر] اچھا ہوں [سر پر ہاتھ پھیر کر] اندھیرے میں ذرا گھبرا جاتا ہوں۔

راج۔ کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔

کمار۔ ایک ڈاکٹر بیسیوں ڈاکٹروں سے پوچھ چکا ہوں۔ انگلینڈ گیا تو وہاں پوچھا۔ جرمنی، فرانس، ویانا کوئی جگہ چھوڑی ہی نہیں۔

راج۔ اور کوئی علاج نہیں کر سکا؟

کمار۔ مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ درد صرف چند لمحے ہی رہتا ہے۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔

مہیش۔ [ریڈیو کی طرف جاتے ہوئے] شروع کروں!

کمار۔ کیا واہیات سی چیزیں بیٹھے ہو۔

وملا۔ آپ کو شاید پسند نہیں؟

کمار۔ گانا ہو تو بات بھی ہے۔

وملا۔ [کچھ مایوس ہو کر] آپ کو شاید گانے سننے کا زیادہ شوق ہے۔

کمار۔ [ہنس کر] میں خود بھی گا سکتا ہوں یعنی میرا مطلب ہے گانا اور پھر لفظوں کا مطلب اشاروں سے ادا کرنا۔

راج۔ پھر تو ہم ضرور سنیں گے۔

وملا۔ اور ہم بھی۔

کمار۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

[مہیش ریڈیو کے قریب ہی کھڑا رہتا ہے کمار فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور گاتا ہے:۔

بلما لال چنریا رنگائے دے

اور پھر زور سے۔ بلما لال چنریا رنگائے دے

اور اب آہستہ۔ الجھا آمیز لہجہ میں:۔ لال چنریا رنگائے دے بلما رنگیلا بلما رنگائے دے]

راج۔ بہت اچھا [خوش ہو کر] آپ تو کمال کرتے ہیں۔

وملا۔ تعجب ہے آپ یہ سیکھ کس طرح گئے۔

کمار۔ [اٹھ کر] اسی لئے تو کہتا ہوں۔ سینکڑوں آدمی ملنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کوئی سائنس پر بحث کرنا چاہتا ہے۔ کوئی موسیقی پر کوئی کچھ کوئی کچھ۔ میں تنگ آگیا ہوں۔

مہیش۔ لیجئے اب میں ریڈیو شروع کرنے لگا ہوں۔

راج۔ کیا فائدہ۔ نہ معلوم اب کیا سین ہوگا

مہیش۔ دیکھیں تو ہی کیا ہو رہا ہے۔

راج۔ بڑے ضدی ہو۔

مہیش۔ دیدی!

[مہیش ریڈیو ۲۲ کرتا ہے اور وملا پھر لیمپ بجھا دیتی ہے]

راج۔ [زور سے] یہ کیوں بجھا دیا وملا؟

وملا۔ ابھی ابھی جلا دوں گی۔ صرف ایک منٹ۔

راج۔ جلدی جلاؤ۔

وملا۔ دیدی چپ

[ریڈیو سے]

دوسری آواز۔ تین شرطیں تین۔ صرف تین

پہلی آواز۔ میں کوئی شرط سننے کے لئے تیار نہیں میں کافی ذلیل ہو چکی ہوں۔ والدین کے سامنے۔ دوستوں کے سامنے۔

دوسری آواز۔ ذلیل ہو چکی ہوں! ابھی ذلیل ہوگی۔ تم لڑکیاں امیر آدمی چاہتی ہو۔ امیری۔ e. وہوی. e و ولابت ہو آیا ہو۔ انسان نہیں دیکھتیں۔

پہلی آواز۔ شیلا تو اس کمرے سے چلی جا۔ میں دیکھوں گی . . .

دوسری آواز۔ آخر جائے گی کہاں۔ ابھی نہیں۔ پہلے میری تین شرطیں پہلی یہ کہ تمہارے سب زیور۔ دوسری تمہاری بہن شیلا۔ اور تیسری تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط کہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ سنا۔ تین شرطیں۔ صرف تین اور پھر . . .

پہلی آواز۔ ایک بھی . . .

کمار۔ لیمپ جلاؤ لیمپ۔ میرا دل! آہ میرا دل!! [ریڈیو پھر بند کر دیا جاتا ہے]

راج۔ [گھبرا کر] وملا!

[وملا لیمپ جلاتی ہے۔ کمار ایک کونے میں سر جھکائے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دبائے کھڑا ہے]

راج۔ [کمار کو پکڑ کر] پھر وہی درد؟

کمار۔ [غصے میں] توڑ دو اس ریڈیو کو۔ لیمپ کیوں بجھایا تھا؟

راج۔ وملا کیوں لیمپ بجھایا تھا؟ بولتی کیوں نہیں؟ مہیش!

[کمار کمرے میں ٹہلتا ہے۔ دروازے پر کھٹکھٹاہٹ]

مہیش۔ کوئی آیا ہے۔

[وملا باہر جاتی ہے]

کمار۔ [ٹھہر کر] کون!

راج۔ کوئی ہوگا۔

کمار۔ [کچھ گھبرایا ہوا نظر آتا ہے] اس وقت کون آسکتا ہے؟

[پھر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے]

راج۔ مہیش تم جاؤ۔ دیکھو کون ہے۔

[وملا گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے]

راج۔ وملا!

وملا۔ دیدی پولیس!

کمار۔ [ٹھہر کر] کیا؟

وملا آپ کو پوچھتے ہیں۔

راج۔ وملا؟

کمار۔ [گھبرا کر] مجھے؟

وملا۔ جی!

کمار۔ کیوں بتایا تم نے

[جوش

میں

غزل

منصور بجائی کو سلام

چھ ماہ علالت اور حادثات کی نذر ہوئے، دہنے ہاتھ کا انگوٹھا بیکار ہو گیا۔ اعصاب خواب ہو گئے ہیں۔ عشق تو فراموش ہو چکا ہے۔ عبرت کا جوش باقی ہے۔ آپ کے سالنامے کے لئے کیا عرض کروں۔ نادم ہوں۔ شعر و شاعری دل ٹھکانے ہو تو ہو سکے۔ گزشتہ مئی میں ریاست ٹونک کے علم پرور سخن سنج فرمانروا کے محل میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت بھی شہریار ٹونک نے خود ہی فرمائی۔ مجھے بھی شریک ہونے کا شرف بخشا گیا تھا۔ ملک کے ممتاز اساتذہ بھی موجود تھے۔ ڈرتے ڈرتے دل میں نے بھی پڑھی تھی وہ حاضر ہے۔ ابھی تک رسائل کی دست برد سے محفوظ ہے۔ پسند ہو تو چھاپ لیجئے۔

حفیظ

اس کے شائع کرنے میں ہمارے لئے مسرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس پر حضرت حفیظ کو دربار ٹونک سے ملک الشعراء احسان الملک بہادر کا خطاب

صورا احمد

سخن کو سخن کی تاب نہیں — سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں
تمہارا شباب نہیں — تو حشر میرے لئے وجہِ اضطراب نہیں
نگاہِ میری — یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں
اسے — یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے۔ جواب نہیں
پردہ — وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں
ئے — میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں
خدا کا شکر ہے نیّت مری خراب نہیں
تو کیوں کہوں کہ میں ذرّہ ہوں آفتاب نہیں

ہیئے جناب حفیظ

ں خطاب نہیں — حفیظ جالندھری

کیفِ امروز

(ساحل راس کماری کی ایک موج کے نام)

وہ جانِ آرزو مرا مہماں ہے آج کل
فردوسِ حُسن کلبۂ احزاں ہے آج کل

قشقہ کی جوت، طُور بداماں ہے آج کل
جو ذرہ ہے وہ مہرِ درخشاں ہے آج کل

ہنستا ہوا شباب غزل خواں ہے آج کل
باہیں گلے میں ڈال کے رقصاں ہے آج کل

ہاتھوں میں اُن کا دستِ گل افشاں ہے آج کل
مٹھی میں میرے عالمِ امکاں ہے آج کل

سرشار ذوق و جذبۂ عصیاں ہے آج کل
ایماں سے کفر دست و گریباں ہے آج کل

دامانِ یار ہے مرے ہاتھوں میں ان دنوں
اور دستِ یار میں مرا داماں ہے آج کل

کوکب فشاں ہیں موجِ تبسم کی بجلیاں
ہر ذرہ ایک شمعِ فروزاں ہے آج کل

صد التفات ساقیٔ رنگیں ہے ان دنوں
دورِ پیالہ گردشِ دوراں ہے آج کل

وہ اپسرا ہے زینتِ فردوسِ آرزو
قدرت بھی جس کو دیکھ کے حیراں ہے آج کل

قامت میں بجلیوں کا تشکل لئے ہوئے
اک مستِ حسن سروِ چراغاں ہے آج کل

ماتھے پہ آفتاب، نگاہوں میں ماہتاب
گیتی پہ اک سپہرِ درخشاں ہے آج کل

جس پر نثار کوکب و انجم کی کائنات
آغوش میں وہ روحِ شبستاں ہے آج کل

سامانِ دورِ ساغر و مے دوش پر لئے
گلشن میں ایک ابرِ خراماں ہے آج کل

رادھا کے روپ میں ہے کنہیا نظر فروز
جمنا بہ شکلِ کاکلِ پیماں ہے آج کل

یہ مصحفِ ملیح، یہ لب ہائے نغمہ ریز
گیتا لبوں پہ آنکھ میں قرآں ہے آج کل

ہر صبح ایک شامِ محبت ہے ان دنوں
ہر رات ایک صبحِ بہاراں ہے آج کل

بربط بغیر لمسِ ترنم سے مست ہے
مطرب بغیر عزمِ غزل خواں ہے آج کل

سرشاریٔ شباب و محبت ہے ان دنوں
جو شے ہے میرے سامنے قرباں ہے آج کل

مُردہ پڑی ہوئی ہیں تحسّر کی ناگنیں
شانوں پہ زلفِ عیش پریشاں ہے آج کل

ہے مفت دل گرفتگیٔ حُسن ان دنوں
اور حسنِ دل گرفتگی ارزاں ہے آج کل

پائی تھی جس نے دل کے حجابوں میں پرورش
وہ رازِ حقیقت عریاں ہے آج کل

دل کا رقیب میں ہوں تو میرا رقیبِ دل
اللہ رے کیا کشاکشِ پنہاں ہے آج کل

تاریکِ لامکاں کی فضا ہو تو ہو، مگر
حدِّ نظر تلک تو چراغاں ہے آج کل

سادہ مزاجِ عشق کا عالم نہ پوچھئے
دل التفاتِ حُسن پہ نازاں ہے آج کل

فردا کی بے کسی کے لئے کچھ تو بچ رہے
وہ جنسِ التفات کہ ارزاں ہے آج کل

ساغر نظامی

مسلمان اور ہندی زبان

جب سے مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں، تب ہی سے ان کا ہندی زبان سے خاصہ پریم رہا ہے۔ بادشاہ بھی اور رعیت بھی، غریب بھی اور امیر بھی، مرد بھی اور عورت بھی سبھی کو ہندوستان کی اس زبان سے اُنس رہا ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں ان سب کا ذکر یا اشارہ بھی کرنا ناممکن امر ہے، پھر بھی کوشش یہی کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے کوئی نامور شاعر یا مصنف رہ نہ جائے اور اُن کی موٹی موٹی باتوں سے ناظرین واقف ہو جائیں۔

ہندی اور مسلمان بادشاہ

پرانی تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے ہندوستانی دفتروں میں سب کام ہندی ہی میں ہوتا تھا۔ حسن گنگو برہمنی نے اپنا سب قرضی کام گنگو براہمن کے حوالے کر رکھا تھا اور وہ ہندی ہی میں ہوتا تھا۔

بادشاہ اکبر ہندی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے دربار میں ہندی کے کئی مشہور پنڈت شاعر اور موسیقی کے ماہر رہتے تھے۔ بادشاہ خود بھی ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ہم ان کا کہا ہوا ایک دوہا نیچے درج کرتے ہیں جس یا شہرت کے بارے میں کہا ہے:۔

جا کو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہ
تا کو جیون سپھل ہے کہت اکبر ساہ

معنی "اکبر بادشاہ کہتے ہیں کہ جو دنیا میں باعزت زندگی بسر کرتا ہے اور لوگ جس کی تعریف کرتے ہیں اُسی کی زندگی کامیاب کہی جا سکتی ہے۔"

بادشاہ جہانگیر نے بھی ہندی پڑھی تھی۔ خسرو ابھی چھ ہی برس کا تھا کہ جب اس کے دادا بادشاہ اکبر نے اسے پنڈت بھودت بھٹاچاریہ کے حوالے کیا تاکہ وہ ہندی کی تعلیم بخوبی حاصل کر سکے۔ بادشاہ شاہجہاں تو ہندی اتنی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اُس میں اپنی مادری زبان کے مانند ہی گفتگو کر سکتے تھے۔ اُن کا بیٹا دارا شکوہ تو ان سے بھی بڑھا چڑھا نکلا۔ وہ ہندی اور سنسکرت کا اتنا عالم ہو گیا کہ اُس نے اُپنشدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان مغلیہ بادشاہوں کے درباروں میں کئی شعرا رہتے تھے اور ان کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ بادشاہ اورنگ زیب کا رجحان اگرچہ ہندوؤں کی طرف بہت زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی ہندی سے اُسے کچھ کم الفت نہ تھی۔

ایک دفعہ شہزادہ محمد اعظم نے اورنگ زیب کے پاس دو آم اس غرض سے بھیجے کہ بادشاہ اُن کا مناسب نام تجویز کریں۔ چنانچہ اورنگ زیب نے انہیں "سدھارس" اور "رسنا دلاس" ناموں سے موسوم کیا۔ سولھویں صدی میں بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ تھے۔ وہ "نورس" نامی ہندی کی کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ گولکنڈا کے حکمران بھی ہندی شاعری میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔

مسلم شعرا

یوں تو مسلمان آٹھویں صدی ہی سے سندھ پر قابض تھے۔ مگر شمالی ہندوستان میں اُن کا قبضہ بارھویں صدی سے ہونا شروع ہوا اور جائے تعجب ہے کہ انہیں دنوں میں اُن کو ہندی سے اُنس ہو گیا بارھویں صدی کے شروع میں ہی مسعود، قطب علی اور اکرم ضعیف نام کے تین شاعروں نے ہندی میں شاعری کی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل اُن کا کلام نایاب ہے۔

امیر خسرو کے نام سے کبھی اردو خوانہ لوگ بخوبی واقف ہیں۔ یہ عربی فارسی، ترکی اور ہندی کے پورے پنڈت تھے۔ سنسکرت بھاشا سے بھی ان کی اچھی آشنائی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے نظم میں ننانوے کتابیں لکھی ہیں جو کئی لاکھ شعروں پر مشتمل ہیں۔ یہ ۱۲۵۵ء سے ۱۳۲۵ء تک زندہ رہے۔ انہوں نے خالق باری، نام کی ایک لغات لکھی جس میں عربی فارسی ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ اُس پر بھی طرہ یہ ہے کہ ساری کتاب نظم میں ہے۔ یقیناً ان کی کتاب سے ہندی [illegible] کا ایک

دوسرے کی زبان کو سمجھنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔ آپ کی دلچسپی کے لئے ہم دو ایک شعر خالق باری سے اخذ کرتے ہیں:۔

مشک کافور است کستوری کپور
ہندوی آنند شادی و سرور
موش چوہا گربہ بلی مار ناگ۔ سوزن درشتہ ہندی سوئی تاگ

اس کے علاوہ خسرو نے ہندی میں بہت سی پہیلیاں مکرنیاں، دوسخنے، ڈھکوسلے، گیت اور دوہے وغیرہ لکھے۔ نمونے کے لئے چند ایک درج کئے جاتے ہیں:۔

بالا تھا جب سب کو بھایا۔ بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں۔ ارتھ کرو نہیں چھوڑو گاؤں (چراغ)

اس پہیلی کا حل دیا ہے جو پہیلی میں ہی بتا دیا گیا ہے۔ لیکن ایسی بھی پہیلیاں انہوں نے کہی ہیں جن کا حل بیچ میں نہیں بتایا گیا۔ ہاتھوں کی چوڑیوں پر کیا مزیدار پہیلی بنائی ہے:۔

چٹاخ پٹاخ کب سے۔ ہاتھ پکڑا جب سے
آہ آوے کب سے۔ آدھا گیا جب سے
چپ چاپ کب سے۔ سارا گیا جب سے

اُن کی مکرنیاں بھی بہت مزیدار ہیں۔ ذرا دیکھئے ڈھول پر کیا دلپسند مکرنی کہی ہے:۔

وہ آوے تب شادی ہوئے۔ اُس بن دوجا ہو نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول۔ اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول

دوسخنے بھی اِن کے بہت دلپذیر ہوتے ہیں فرماتے ہیں:۔

پنڈت کیوں پیاسا؟ گدھا کیوں اُداسا؟ — لوٹا نہ تھا
سوداگر را چہ مے باند۔ بوچے کو کیا چاہئے! دوکان

خسرو بہت حاضر جواب شاعر تھے۔ ایک بار پیاس سے ستائے ہوئے ایک کنویں پر پہنچے جہاں چار کہاریں پانی بھر رہی تھیں۔ اتفاق سے وہ انہیں پہچانتی تھیں۔ انہوں نے باری باری سے کہا کہ ہمیں کھیر، کتا، چرخا اور ڈھول ان چاروں پر شعر سناؤ تب پانی پلائیں گی۔ خسرو نے فی البدیہہ ایک ہی شعر میں سب کی خواہش پوری کر دی بولے:۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا

ان کے بعد پندرھویں صدی کے خاتمے پر ایک صوفی شاعر ہوئے جن کا نام تلسی تھا۔ آپ شیخ برہان کے شاگرد تھے اور شیر شاہ کے والد حسین شاہ کے یہاں رہتے تھے۔ انہوں نے نظم میں ایک پریم کہانی لکھی جس کا نام "مرگاوتی" ہے۔ اس میں چندر نگر کے راجکمار اور کانچن نگر کی راجکماری مرگاوتی کی محبت کا نہایت نفیس نقشہ اتارا ہے۔ کئی جگہ تو پڑھتے پڑھتے آدمی کا دل مالک کی محبت میں مگن ہو جاتا ہے۔ ان کے بعد منجھن نے مدھومالتی، نام کی ایک اعلیٰ پریم کتھا لکھی۔

محبت کے قصے لکھنے والوں میں ملک محمد جائسی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بریلی ضلع کے جائس نام کے قصبے میں آکر رہنے لگے تھے۔ انہوں نے سادھو سنتوں کا کافی سنگ کیا تھا اور ویدانت اور یوگ سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے دو کتابیں لکھی۔ "پدماوت" اور "اکھراوٹ" "پدماوت" میں چتوڑ کے رانا کا پدماوتی سے بیاہ اور پھر علاؤالدین کے حملے وغیرہ کا ذکر ہے۔ "اکھراوٹ" میں ہندی کے حرفوں میں سے ایک ایک کو لے کر خدا کی تعریف اور دنیا کی بے ثباتی پر بہت عمدہ شاعری کی ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود جگہ جگہ پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی مناسب تعریف کر کے انہوں نے اپنی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے۔

"پدماوت" میں راجپوتوں کے جنگ میں چلے جانے پر اور راجپوتنیوں کے جوہر سے جل مرنے پر کہتے ہیں:۔

جوہر بھئی سب استری۔ برش بھئے سنگرام
بادشاہ گڑھ چور دیا۔ چتوڑ بھا اسلام

اِن کے خیال میں وہی زبان اعلیٰ ہے جو پریم کا مارگ بتاتی ہے فرماتے ہیں۔

ترکی عربی ہندوی بھاشا جیتی آہے
جا میں مارگ پریم کا سبے سراہے تاہے

"اکھراوٹ" میں ایشور کی مہما کا بیان ویدانت کی طرز پر اس طرح سے کیا ہے:۔

ٹھا، ٹھاکر بڑ آپ گوسائیں۔ جیئی سہر جاگ اپنی نائیں
سبے جگت درپن کے لیکھا۔ آپ ہی درپن آپ ہی دیکھا

معنی — وہ ایشور خود سب سے بڑا ہے جس نے جہان کو اپنے ہی جیسا بنایا۔ ساری کائنات آئینہ کی مانند ہے وہ خود ہی آئینہ ہے اور خود ہی اس میں دیکھنے والا۔

اِسی زمانے میں شاہ محمد اور ان کی زوجہ چمپا نے اور عالم نام کے

شاعر نے بھی ہندی میں شاعری کی۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جسے ہندی ادب کے اتہاس کا سنہری یگ کہتے ہیں جس میں تلسی داس، سور داس وغیرہ کئی نامور شاعر ہوئے۔ اسی زمانے میں کئی مسلمان شعرائے ہندی میں اعلیٰ پائے کا کلام کہا ان میں چند مشہور ہستیاں یہ ہیں۔ رس خاں، رحیم، قادر بخش، مبارک، عثمان، طاہر اور شیخ نبی۔

رس خاں دہلی کے پٹھان تھے اور شری کرشن کے شیدائی۔ پہلے ان کے اطوار اچھے نہ تھے۔ یہ ایک بنئے کے لڑکے پر بے طرح لٹو تھے۔ ایک بار انہوں نے کچھ اجنبیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انسان کو اللہ سے ایسا پیار ہونا چاہئے جیسا رس خاں کا بنئے کے بیٹے سے ہے۔ یہ بات ان کے دل کو لگ گئی اور یہ بالکل بدل گئے۔ بعد میں یہ سری کرشن کے نہایت عقیدتمند بھگت بن گئے۔ ان کی بنائی ہوئی دوکتابیں پریم واٹکا، اور "نجان رس خان" بہت مشہور ہیں۔ پریم واٹکا میں محبت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

اتی سوچھم کومل اتی ۔ اتی پتروانی دور
پریم کٹھن سب تے سدا ۔ نت اک رس بھرپور

معنی۔ جو محبت بہت ہی باریک۔ ملائم، پتلی دور کی اور ہمیشہ ایک سی بھرپور رہتی ہے وہ بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔

سری کرشن میں ان کی کتنی عقیدت تھی وہ مندرجہ ذیل چھند سے ظاہر ہوتا ہے:۔

یا لکٹی اور کامریا پر راج ہتوں پر کاتج ڈاروں۔
آٹھ ہوں سدھی نو ندھی کو سکھ نند کی گائے چرائے بسارو۔
رس خاں کیوں ان آنکھن سوں برج کے بن باغ تڑاگ نہارو۔
کوٹن ہو کل ڈھوت کے دھام کریر کے کنجن اوپر وارو۔

معنی۔ میں سری کرشن کی چھڑی اور کمبل پر تینوں جہانوں کی حکومت تیاگ دوں۔ نند کی گائیں (کرشن کے ساتھ) چراتے ہوئے آٹھ سیدھی اور نو ندھی کا سکھ بھول جاؤں۔ اے رس خاں! اگر میں ان آنکھوں سے برج بھومی کے جنگل، باغ اور تالاب دیکھ پاؤں تو کریر کے کنجوں پر سونے کے بنے ہوئے لاکھوں محل قربان کر دوں۔

رحیم، جن کا پورا نام عبدالرحیم خان خاناں ہے۔ بادشاہ اکبر کے سپہ سالار اعظم تھے، وزیر تھے اور نورتنوں میں سے ایک تھے۔ یہ عربی۔ فارسی، سنسکرت اور ہندی کے اچھے عالم تھے۔ سری کرشن کی بھگتی اور سخاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفیں مشہور ہیں:۔

رحیم ست سئی، بروے ناپکا بھید، داس پنچا دھیائی، شنگار سورٹھ، مدن اشٹک، دیوان فارسی اور واقعات بابری کا فارسی ترجمہ۔ کھیٹ کوتک جاتک۔

دیکھئے۔ سری کرشن چندر کی بھگتی میں کیسے مست ہیں:۔

جہی رحیم چت آپنو ۔ کینو چتر چکور
رنشی واسر لاگو رہے ۔ کرشن چندر کی اور

معنی۔ رحیم نے اپنے چت کو چکور کی طرح عقیدتمند بنا دیا ہے جو دن رات کرشن چندر کو چاند کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔

یہ بہت تجربہ کار شخص تھے۔ دنیا انہوں نے خوب اچھی طرح دیکھی بھالی تھی، اپنے تجربوں کو انہوں نے شاعری میں نہایت کمال سے بیان کیا ہے۔ مصیبت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

رحمن دیکھ اتو بھلی ۔ جو تھوڑے دن ہوئے
ہت ان ہت یا جگت میں ۔ جان پرت سب کوئے

معنی۔ اے مصیبت! اگر تو تھوڑی دیر کے لئے آئے تو یقیناً اچھی ہے۔ اس سے دنیا میں ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون اس بات کا پتہ بخوبی لگ جاتا ہے۔

کون جانے، کس کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھ کر یہ غضب کا دوہا کہا ہے:۔

امی ہلاہل مد بھرے ۔ شویت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت ۔ جہی چتونت اک بار

معنی۔ یہ سفید سیاہ اور سرخ آنکھیں، امرت زہر اور شراب سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ جس کو ہی دیکھ لیتی ہیں وہ جی جاتا ہے، مرجاتا ہے اور مدہوشوں کی مانند جھک جھک کر چلنے لگتا ہے۔

آنکھوں کی سفیدی، سیاہی اور سرخی کی امرت زہر اور نشے سے تشبیہہ دینے میں اور پھر ان چیزوں کے تاثر سے لوگوں کی جو کیفیت ہوتی ہے اُسے کیا خوبی سے کہا ہے!

اکبر کے اس عالم سے اٹھ جانے کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ جہانگیر نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ بڑی مشکل سے کسی طرح باہر آئے۔ دھن دولت پہلے ہی ضبط کر لی گئی تھی۔ غریبی و ناداری کی حالت

میں چتر کوٹ ریاست میں چلے گئے۔ یہ سخی تو پرلے درجے کے تھے ہی غریبوں اور مفلسوں نے یہاں بھی پنڈ نہ چھوڑا۔ انہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ رحیم کی حالت پہلے کی سی نہیں ہے لیکن وہ کب ماننے والے تھے تنگ آکر رحیم نے مندرجہ ذیل دوہا لکھ کر چتر کوٹ کے راجہ کے پاس پہنچا دیا۔

چتر کوٹ میں دم رہے ۔ رحمن او دھ نریش
جا پر ویدا پرت ہے ۔ سو آوت یہی دیش

معنی۔ رحیم کہتے ہیں کہ شری رام چندر بھی چتر کوٹ میں بن باس کے دنوں میں آئے تھے۔ ٹھیک ہے جس پر بلا نازل ہوتی ہے وہ اسی میں پناہ لیتا ہے۔

راجا نے یہ دوہا پڑھ کر سب معاملہ بھانپ لیا۔ انہوں نے رحیم کی مدد کے لئے ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ لیکن رحیم نے سب رقم انہیں بھک منگوں کو دے دی۔ اپنے لئے ایک اوھیلا بھی نہیں رکھا۔

عثمان۔ غازی پور کے باشندے تھے۔ انہوں نے چترا ولی نام کا عشقیہ قصہ دوہا اور چوپائی میں لکھا ہے۔ اس میں چترا ولی کے باغیچے کا اُس کے مختلف عضو کا، ہجر کا، چھ موسموں کا اور بارہ مہینوں کا بیان پڑھنے کے لائق ہے۔ اس فانی جسم کے متعلق کہتے ہیں۔

کون بھروسہ دیہہ کا چھاڈو جتن اپائے ۔ کاگد کی جس پوٹری پانی پیے گھل جائے

معنی۔ بہت تدبیریں اور طریقے رہنے دو۔ اس تن کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ تو کاغذ کی پتلی کی مانند ناپائدار ہے جو کہ پانی پڑنے سے گل جاتی ہے۔ بنگالیوں کی خوراک کے بارے میں بڑے مزے کی بات کہی ہے۔

سب کے امرت پانچ ہیں۔ بنگالی کے سات
کیلا۔ کانجی، پان، رس، ساگ، ماچھری، بھات

مبارک کا سن ولادت ۱۵۸۳ء ہے انہیں عربی، فارسی اور سنسکرت سے اچھی واقفیت تھی۔ ان کی دو تصنیفیں "الک شتک" اور "تل شتک" بہت عمدہ ہیں۔ اول الذکر میں زلف پر ایک سو دوہے کہے ہیں اور دوسرے میں تل یا خال پر یک صد دوہے ہیں۔ زلف کے بارے میں ایک دوہا دیکھئے۔

الک مبارک رتیہ و دن ۔ لٹک پری یوں صاف
خوشنویس منشی مدن ۔ لکھیو کانچ پر قاف

معنی۔ عورت کے چہرے پر زلف اس صفائی سے لٹک رہی ہے مانو خوشنویس۔ منشی کامدیو محبت کا دیوتا نے کانچ پر ق لکھ دیا ہو۔

اِن کا تل پر لکھا ہوا مندرجہ ذیل دوہا پڑھ کر دل پھڑک اُٹھتا ہے:۔

سب جگ پیرت تلن کو۔ تھکیہ چت یہ ہیر
تو کپول کو ایک تل ۔ سب جگ ڈاریو پیر

معنی۔ دل یہ دیکھ دیکھ کر تنگ پڑ گیا ہے کہ ساری دنیا تلوں کو پیلتی رہتی ہے لیکن تیرے گال کے اس ایک تل نے سب سنسار کو پیل ڈالا ہے۔

اسی زمانے میں قادر بخش، طاہر اور شیخ نبی نے ہندی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ قادر بخش کا کلام کافی اچھا ہے۔ ان کا ایک شعر تو کہاوت ہی بن گیا ہے: "گن نہ ہرا تو گن گاہک ہرا تو ہے" یعنی ہنر یا خوبیاں تا حال موجود ہیں لیکن اُن کے قدر دان مفقود ہو گئے ہیں۔ طاہر نے "کوک سار" نام کی ایک کتاب لکھی۔ انہیں دنوں میں کچھ اور بھی مسلم اصحاب ایسے تھے جنہوں نے ہندی میں شعر کہے لیکن وہ بہت باکمال نہ تھے درمیانی درجے کے تھے۔

سترھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں تاج نام کی ایک مسلم خاتون کا ہندی سے بہت پریم تھا۔ اِن کی سری کرشن چندر سے بہت شردھا اور عقیدت تھی۔ کہتی ہیں۔

سنو دل جانی! میرے دل کی کہانی تم دست ہی بجانی بدنامی ہی سہوں گی، میں دیو پوجا ٹھانی، میں نواز ہوں نمجلانی سنگھ کلمہ قرآن سارے گنن گہوں گی میں سیا ملا سلونا سرتاج سر کنگھے دئے تیرے نیہ راگ میں نداگ ہو دھوں گی میں نند کے کمار اِقربان تا منڈی صورت پہ تا نڈ نال پیارے ہندواتی ہو رہوں گی میں۔

معنی۔ اے میرے دل و جان! میرے دل کا حال یہ ہے کہ میں تمہارے ہاتھ بک چکی ہوں۔ ہر بدنامی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ میں کلمہ و نماز بھلا کر تمہارے گنوں کو اپناؤں گی اور تمہاری پوجا کروں گی۔ اے کمٹ دھاری خوب صورت سنبھام! تمہاری محبت کے داغ کے سوا اپنے سب داغ دھو ڈالوں گی۔ اے نند کے دلارے سری کرشن! میں تیری صورت پر قربان ہوں میں تو تمہارے لئے ہندو ہونے کو تیار ہوں۔

سچ مچ اُن دنوں کرشن بھگتی کا وہ دور دورہ تھا کہ ایک مسلمان دیوی بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمانوں کا رجحان اردو کی طرف زیادہ ہو گیا اور وہ فارسی شاعری کے ڈھنگ پر لکھنے لگے۔ خود

بادشاہ کو بھی شاعری کا خاص شوق نہ تھا۔ تاہم ان کے ماتحت افسروں میں سے دانش مند اور رحمت اللہ نے ہندی میں کچھ شعر کہے۔ ان کے علاوہ زین دین محمد اور بیر وستم بھی ہندی کے شاعر تھے)

عالم جنم کے برہمن تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان ہو گئے اور اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ معظم کے یہاں رہنے لگے۔ ان کے تبدیلیٔ مذہب کی داستان بھی حد درجے کی دلچسپ ہے۔ انہوں نے ایک بار آدھا دوہا بنا کر کاغذ کے پرزے پر لکھ کر پگڑی میں باندھ لیا کہ کبھی اسے مکمل کر لیں گے۔ اتفاق سے وہ اس بات کو بھول گئے اور پگڑی رنگنے کے لئے شیخ نام کی رنگریزن کے پاس پہنچ گئی۔ شیخ نے کھول کر پڑھا تو آدھا دوہا لکھا تھا۔ شیخ نے پورا کر کے پھر باندھ دیا۔

وہ دوہا یہ ہے:

کنک چھڑی سی کامنی ۔ کاہے کو کٹی چھین (عالم)
کٹی کو کا پن کاٹ دھی ۔ کچن مدھ دھر دین (شیخ)

معنی۔ باقی تو یہ عورت سونے کی چھڑی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی کمر پتلی کیوں ہے؟ ٹھیک ہے کمر پر کا سونا کاٹ کر پہانے چھاپتوں میں دھر دیا ہے۔

شیخ کے تخیل کے پرواز کو دیکھ کر عالم دنگ رہ گئے۔ انہوں نے ایک آتشہ زنگائی، ایک ہزار روپیہ انعام شیخ کے حوالے کر دیا۔ دونوں میں محبت مرتے دم تک رہی اور انہوں نے آپس میں شادی کر لی۔ ان دونوں کا کلام محبت سے سرشار ہے۔ شیخ کو بھی سری کرشن چندر سے بہت عقیدت تھی۔ "عالم کیتی" اور "مادھو انل۔ کام کندلا" نام کی دو کتابیں انہیں کی تصنیف کردہ کہی جاتی ہیں۔ عالم نے سری کرشن کے سانولے پن پر کیا خوب کہا ہے!

کارو کانہہ کہت گنواری ایسی لاگت ہے
موہی واکی بیام تائی لاگتی اُجیاری ہے

معنی۔ کرشن کو کالا کہنے والی مجھے تو گنواری سی لگتی ہے۔ مجھے تو اُس کا سانولا پن بھی اجالا نظر آتا ہے۔

رس لین اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہوئے۔ یہ ضلع ہردوئی سے بلگرام گاؤں کے رہنے والے تھے۔ عربی۔ فارسی اور ہندی کے فاضل تھے "سانگ درپن" اور "رس پربودھ" نامی کتابیں انہیں نے لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ پاؤں کے تلووں کی نزاکت کا بیان بڑا باکمال کیا ہے۔

تو پگ تل مرتا پتے ۔ کوئی برنت سکچا ہیں
من میں آوت جیبھ لوں ۔ مت چھالے پر جا ہیں

معنی تیرے پاؤں کے تلووں کی نزاکت سفر ادل میں تو سمجھ سکتے ہیں لیکن زبان سے بیان کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ دل میں یہی آتا ہے کہ زبان جیسی سخت چیز کے ساتھ لگنے سے اُن پر آبلے نہ پڑ جائیں۔

کسی نازنین کی پتلی کمر کو دیکھ کر آنکھ میں بال پڑ جانا شاید ان کے سوا آج تک کسی کو نہیں سوجھا۔ فرماتے ہیں:۔

سوچھم کٹی وا بال کی ۔ کہوں کون پر کا ر
جا کے اور چتوت ہی ۔ پرت درگن میں بار

معنی۔ اس نازنین کی پتلی کمر کو میں کیسے کہوں؟ جس کی طرف دیکھتے ہی آنکھوں میں بال پڑ جاتا ہے۔

رس رنگ پہلے مسلمان تھے بعد میں ویشنو بن گئے۔ انہوں نے بانی نام کی کتاب برج بھاشا اور کھڑی بولی میں لکھی۔ عہد الرحمان ہندی کے اچھے عالم تھے ان کی ہندی مشکل تو ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں چٹکارہ خوب ہوتا تھا۔ ان کی دو کتابیں ملتی ہیں۔ یک نشتک، اور "نکھ شکھ" محبوب کا کلام بھی بڑا دلپذیر ہوتا تھا۔ وہ ایک ہی حرف کا کئی بار بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے تھے۔

دکشن، پریتم اور یعقوب خاں کے نام بھی قابل یادداشت ہیں دکشن تخلص تھا۔ اصلی نام احمد اللہ تھا۔ ان کا تصنیف شدہ "دکشن ولاس" نامی گرنتھ ملتا ہے جس میں مختلف رُسوں کا بیان وضاحت سے کیا ہے۔ پریتم جن کا حقیقی نام علی محب خاں تھا بڑی مذاقِ طبیعت کے مالک تھے انہوں نے کھٹملوں کے بارے میں برج بھاشا میں ایک چھوٹی سی کتاب "کھٹمل بائیسی" لکھی ہے۔ اُسے پڑھتے پڑھتے انسان مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتب پُرانوں کے مطابق شو جی دیوتا کیلاش پربت پر، وشنو دیوتا دودھ کے سمندر میں اور برہما دیوتا کمل میں آرام کرتے ہیں لیکن پریتم کہتے ہیں کہ یہ سبھی کھٹملوں سے ستائے ہوئے ہی کھاٹ پر نہیں سوتے کیا خوب کہا ہے۔

ودھی ہری ہر اور ان تے نہ کو وتے اُو
کھاٹ پہ نہ سوویں کھٹمل کو ڈر کے

یعقوب خاں نے ہندی کے مشہور شاعر کیشو داس کی رسک پریا کتاب کی تفسیر لکھی اور انکا کے مضمون پر رس بھوشن نام کی کتاب بنائی۔

دہلی کے ایک شاعر اعظم خاں ہوئے ہیں۔ انہوں نے "شرنگار درپن" لکھا۔ نور محمد نے دوہا اور چوپائی چھندوں میں آندراوتی، نام کی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اودھی زبان میں ہے لیکن گاہے بگاہے فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ گرنتھ بہت اچھا بنا ہے اور اس کا مقابلہ جائسی پدماوت سے ہو سکتا ہے۔

یوسف خاں ایک مفسر ہوئے ہیں۔ طالب شاہ کی زبان میں کھڑی بولی بھی ملی ہوئی ہے۔

انیسویں صدی میں ایک مفسر عیسوی خاں ہوئے جنہوں نے کہ "بہاری ست سئی" پر ایک تفسیر لکھی۔ قاسم شاہ اس زمانے کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا دوہا اور چوپائی میں لکھا ہوا "ہنس جواہر" نام کا گرنتھ بہت مشہور ہے۔ یہ بھی ایک لمبی پریم کی کہانی ہے۔ ہندی ادب میں ایسی بڑی بڑی اور اچھی پریم کہانیاں لکھی گئی ہی ہیں۔

سید امیر علی میر زمانۂ حال کے مشہور ہیں زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کو ہندوستان سے۔ سودیشی اشیا سے اور گائے سے بہت پریم ہے۔ ہندی شاعری میں کافی دسترس رکھنے کے سبب یہ کئی ڈگریاں اور تمغے حاصل کر چکے ہیں۔ بھرت ہند کے بارے میں کہتے ہیں:۔

ہند ساگر تم ہمارے گاڑھتے۔ ہائے کی تم نے تمرکبی دغا!
جب گھسا تھا شترو چھاتی چیر کر۔ ٹانگ دھر پاتال کو دیتے بھگا۔

اپنی غلامی کے بارے میں ایشور سے یوں پرارتھنا کرتے ہیں:۔

(دنیا کے محافظ) وشور کشک! کیا نہیں ہم وشو ہیں؟ کیوں نہیں دیتے ہمیں ہوم سوراج؟
غیر ہیں آزاد گھر میں ہم غلام۔ کیا یہی انصاف ہے بندہ نواز؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ گزشتہ آٹھ صدیوں میں مسلمانوں نے ہندی بھاشا کی ترقی میں کئی طرح سے کافی مدد دی ہے۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ رشتہ محبت بدستور قائم رہے گا یا پہلے سے بھی زیادہ پکا ہو جائے گا۔

رام سروپ شاستری

اس مضمون کے لکھنے میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔ راقم ان سے استفادہ کا تہ دل سے ممنون ہے:۔

(۱) ہندی کویتا کو مدی (۲) ہندی ساہتیہ کا سنکشپت اتہاس (۳) ہندی ساہتیہ کا ودھن اتہاس۔

اگر . . . ؟

اگر سبز پتیاں اور نازک ڈالیاں ہی جان بہار ہیں تو مجھے پھوٹتی ہوئی کونپلیں اور نکلتے ہوئے شگوفے کیوں زیادہ مرغوب ہیں!

زمانۂ شباب میں ہر مرد، عہد جوانی میں بھی عورتیں —— حسن و خواب کا مجموعہ بن جاتی ہیں تو مجھے ایک بھولا اور معصوم بچہ ان سب سے کیوں زیادہ پیارا اور محبت آفریں معلوم ہوتا ہے!

قدرت کے رنگین مناظر اور مصور کے حسین شاہکار روز روشن میں ہی دلکش اور جاذب نظر ہوتے ہیں تو پھر انہیں صبح کے دھندلکوں اور مہتاب کی چھاؤں میں دیکھنے کا شوق کیوں چرائے رہتا ہے!

کھلے ہوئے پھولوں کی دلفریبی قابل سوال نہیں تو آخر بند کلیاں میرے جذبات میں کیوں ہلچل ڈال دیتی ہیں!

—— مقررین کی خطابت سحر اثر ہوتی ہے تو ایک بے کس اور نادار کے منہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے فقرات جب گونگے کے اشارات و کنایات مطلب براری کرتے ہیں، مجھے کیوں زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

—— وہ ادبی جواہر پارے، جن میں ہر خیال کامل، ہر بات جامع، ہر مسئلہ واضح اور روشن ہو، زیادہ بلند اور ارفع سمجھے جاتے ہیں تو مجھے وہ پارہائے ادب جن میں کچھ سمجھایا، کچھ سمجھا یا گیا ہو۔ کچھ کہا، کچھ حذف کیا گیا ہو۔ کیوں، کیوں بے خود اور مجبور رکھتے ہیں؟

—— بدر منیر کی نورانی ٹکیہ اپنی نقرئی چاندنی کی بدولت، لاجوردی آسمان کا گہنا اور خوبصورتی تصور کی جاتی ہے تو مجھے ہلال نو سے کیوں زیادہ عقیدت ہے! مجھے اس کی آمد کیوں انتظار ہے!

شاید یہ اس لئے
کہ میں خود نامکمل ہوں اور مجھے ہر نامکمل شے سے اُنس ہے۔

خورشید بی ایس سی

صدائے درویش

اِس رنج کی دنیا میں جامِ طرب افزا دے — اس میکدۂ لا میں اِک ساغرِ الا دے
اے فضل و کرم والے! محتاج کو دِلوا دے — امید کے بندے کو محروم نہ پلٹا دے
دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

اِس اپنے بھکاری پر، اے شاہ کرم فرما — آیا ہے ترے در پر گمراہ، کرم فرما
مایوسی کی حالت میں ناگاہ، کرم فرما — اللہ! کرم فرما للہ، کرم فرما
دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

دُوری سے تری تھک کر، جی اپنا نہ ہاروں گا — افلاک کی چوٹی سے تاروں کو اُتاروں گا
بگڑی ہوئی قسمت کو رو رو کے سنواروں گا — سَو مرتبہ چیخوں گا، سَو بار پُکاروں گا
دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

اِس جسم کے جوہر کو عُریانی سے زینت دے — دستِ دلِ سائل میں، دامانِ محبّت دے
کچھ غم کی مسرت دے، کچھ درد کی لذّت دے — ایمان کی عزّت دے، توحید کی دولت دے
دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

کب تک تری صُورت کو یہ دیدۂ تر، ترسے — دیکھیں مری کھیتی میں کب ابرِ کرم برسے
امید بہت کچھ ہے امجد کو ترے در سے — دامانِ ہوس بھر دے مقصود کے گوہر سے
دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

احمد حسین امجد

پھر مانگ پھر مانگ

اے سائل آ آ پھر مانگ پھر مانگ
جو چاہے لے جا، پھر مانگ، پھر مانگ
ہر دم ہمارے فضل و کرم کا
جاری ہے دریا، پھر مانگ پھر مانگ

خوش ہوتے ہیں ہم تیری صدا سے
ہاں پھر صدائے، دلکش ادا سے
کیوں رُوٹھتا ہے اپنے خدا سے
آ آ آ آ پھر مانگ پھر مانگ

ہم اپنی شانِ رحمت دکھائیں
سب آرزوئیں تیری بر آئیں
تو مانگتا جا، ہم دیتے جائیں
ہاں چپ نہ ہو جا، پھر مانگ پھر مانگ

وجہ سکوں ہے یہ بے قراری
زور اور زر سے بہتر ہے زاری
چھائی ہے تجھ پر رحمت ہماری،
لے چاہے جتنا، پھر مانگ پھر مانگ

تو ہے بھکاری، اور ہم ہیں داتا
لے بھر لے امجد! کاسہ ہوس کا
ہم بھی تو دیکھیں ہے ظرف کتنا
لے ہاتھ پھیلا، پھر مانگ پھر مانگ

احمد حسین امجد

نینا

اُس پر نقب زنی کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ عدالت میں اس شخص کے طرزِ عمل اور ان حالات کی وجہ سے جو مقدمے کی سماعت کے دوران میں ظاہر ہوئے مجھے اس شخص سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں نے قیدی سے ملنے کے لئے اجازت حاصل کرلی۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ گفتگو تک کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن آخرکار اپنی داستانِ حیات یوں سنائی:۔

"آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ میں نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں اور ہمیشہ ایک بدبخت آوارہ گرد کی طرح گلیوں میں ٹھوکریں اور سڑکوں پر سونا میری قسمت میں نہیں تھا۔ میں نے اچھی تعلیم پائی ہے۔ میں ایک انجینئر تھا۔ جوانی میں میرے پاس کچھ دولت بھی تھی اور میں اپنے ایامِ عیش و عشرت میں بسر کیا کرتا تھا۔ ہر رات میں رقص و سرود کے جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور شراب سے مدہوش ہو کر لوٹا کرتا تھا۔ مجھے وہ زندگی اچھی طرح یاد ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات کے گہرے نقوش میرے دل پر موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں ایک خلا ہے، اور اسے بھرنے کے لئے میں اپنی باقی ماندہ زندگی قربان کرنے کو تیار ہوں . . . سب کچھ دے ڈالنے کو تیار ہوں، صرف ان واقعات کی یاد کے لئے جن کا ذرا سا تعلق بھی نینا کی ذات سے ہے۔

"اُس کا نام نینا تھا، ہاں، نینا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ اس کا خاوند ریلوے کے محکمے میں کسی معمولی سی اسامی پر مامور تھا۔ وہ غریب تھے۔ لیکن وہ کتنی سلیقہ شعار تھی کہ اس مفلسی اور ناداری میں بھی اپنے ماحول میں لطافت اور حُسن پیدا کر دیتی تھی۔ وہ کھانا خود پکاتی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے ہاتھ بدنما نہ ہوتے تھے، شاید خدا نے نہایت توجہ اور محنت سے انہیں ڈھالا تھا۔ اس کا غریبانہ لباس ایک نشاط آور خواب کی طرح ہوتا تھا اور دنیا کا وہ حصہ جس کا اس کے ساتھ تعلق ہو جاتا تھا، اس کی کایا ہی پلٹ جاتی تھی۔ خود میں، اس کے ساتھ مل کر اور کا اور ہو گیا اس طرح جیسے بارش سے بھیگ کر کوئی شخص اپنے آپ کو نچوڑنے میں نے زندگی کی تمام کثافتیں اپنے جسم سے پٹک دیں۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، خدا اُس کے اِس گناہ کو معاف کرے۔ اس کا ماحول اتنا کرخت تھا کہ اس کے پاس مجھ سے محبت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ میں جوان اور خوبصورت تھا۔ شعروں کے دفتر کے دفتر مجھے ازبر تھے۔ لیکن میری اس سے واقفیت کب اور کس طرح ہوئی! . . . یہ بات مجھے اب بالکل یاد نہیں۔ اس کے تصور سے میرے دل کی اتھاہ تاریکیوں میں الگ الگ تصویریں روشن ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم تھیٹر میں ہیں۔ وہ مسرت و انبساط میں ڈوبی ہوئی (لیکن ایسے مواقع بہت شاذ ہوتے تھے) کیمل کے ہر لفظ کو ایک پیاسے آدمی کی طرح پیتی چلی جاتی ہے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے . . . مجھے اس کی مسکراہٹ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں کسی اور جگہ چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنا سر مجھ پر جھکا دیتی تھی اور کہتی تھی میں جانتی ہوں کہ مسرت کا یہ لمحہ بہت لمبا نہیں ہے، لیکن کچھ پروا نہیں، میں اس لمحے میں ایک زندگی گزار چکوں گی۔" مجھے یہ لفظ یاد ہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد کیا ہوا؟ اور کیا یہ واقعی درست ہے کہ یہ سب کچھ ابھی زمانے میں ہوا جب میں نینا کے ساتھ تھا، میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ قطع تعلق کے وقت میں نے ہی پہل کی اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ بالکل قدرتی بات معلوم ہوتی تھی۔ میرے تمام ساتھی اسی طرح کرتے تھے۔ کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ کچھ روز معاشقہ کرتے اور پھر اسے دھتکار دیتے تھے۔ میں نے بھی دوسروں کی تقلید کی اور یہ خیال میرے دل میں پیدا ہی نہیں ہوا کہ میں کوئی نازیبا حرکت کر رہا ہوں۔ کسی کا روپیہ چرانا، اپنا قرض ادا نہ کرنا، چغلخور بننا . . . یہ باتیں واقعی بری تھیں لیکن کسی عورت سے محبت کر کے اسے چھوڑ دینا تمام دنیا کا دستور تھا۔ میرے سامنے ایک درخشاں مستقبل تھا اور اس کے مقابلے میں ایک عورت کی محبت کے لئے اپنے آپ کو پابند کر لینا کتنا احمقانہ فعل تھا۔ یہ واقعہ یقیناً دردناک تھا۔ بہت ہی تکلیف دہ، لیکن میں نے اپنے آپ پر فتح

پالی۔

میں نے سنا کہ اس کے بعد نینا اپنے خاوند کے ساتھ کسی جنوبی علاقے میں چلی گئی اور پھر جلد ہی مر گئی۔ لیکن اس زمانے میں نینا کی یاد مجھے اتنا دکھ پہنچاتی کہ میں اس کے متعلق کوئی خبر بھی سننے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو اور اس کا خیال تک میرے دل میں پیدا نہ ہو۔ میں نے اس کی کوئی تصویر اپنے پاس نہ رکھی تھی۔ میں نے اس کے تمام خطوط واپس کر دئے تھے، ہمارے کوئی مشترک دوست نہ تھے اور اس طرح آہستہ آہستہ میرے دل پر سے نینا کے نقوش مٹتے گئے مٹتے گئے اور مٹ گئے۔ آپ سمجھ گئے نا؟ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں نینا کو بھولتا گیا۔ حتیٰ کہ بالکل بھول گیا۔ اس کا نام، اور اس کی تمام محبت۔ ایسے، جیسے میری زندگی میں نینا کا کوئی وجود ہی نہیں تھا . . . آہ، انسان کی اس بھول جانے کی قدرت میں ایک چیز کتنی شرمناک موجود ہے۔

برسوں گزر گئے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی کامرانیوں کا حال نہ سناؤں گا اور نینا کے بغیر زندگی کی ظاہری کامیابیوں کے سوائے اور ہو کیا سکتا تھا۔ ہاں، دولت اور شہرت کی فراوانیاں تھیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی حد تک پہنچ گیا۔ میں اس وقت لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ میں نے شادی کی۔ خدا نے مجھے بچوں کی نعمت سے مالا مال کیا۔ اس کے بعد قسمت نے دوسری طرف کروٹ بدلی . . . مجھے ہر چیز میں نقصان ہونے لگا، میرے کام ناپسند کئے جانے لگے، میری بیوی مر گئی، میں نے بچوں کو دوسرے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا۔ اور اب خدا مجھے معاف کرے، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ننھے لڑکے زندہ ہیں یا مر گئے۔ ہاں آپ کا خیال صحیح ہے میں نے شراب پینا اور جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا . . . میں نے دلال کا کاروبار شروع کیا۔ لیکن اس میں میری رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو گئی۔ میں نے جوئے کے ذریعے اپنی حالت سدھارنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا اور جیل جانے سے بال بال بچ گیا . . . ہاں، یہ اتفاد بھی بلا وجہ نہ تھی۔ میرے دوست میرے دشمن ہو گئے اور میں انتہائی پستی کی طرف گرنا شروع ہو گیا۔

آہستہ آہستہ میں ذلت کے اس درجے کو پہنچا جہاں اب آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ذہنی ترقیوں کے اس آسمان سے جہاں بہت کم لوگ پہنچتے ہیں میں اس تحت الثریٰ میں آ گرا جہاں میں راستے کی کسی منزل پر رک نہ سکا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، اور میں عموماً دن رات شراب کے نشے میں چور رہتا تھا۔ گزشتہ چند سال میں میں نے مہینوں مختلف کارخانوں میں مزدوروں کا کام کیا ہے لیکن صرف اتنے دن جتنے میں شراب کے بغیر گذار سکتا تھا اور جب کبھی شراب کا بھوت آن دباتا تھا تو میں چوروں اور اچکوں کے مسکنوں میں جا پناہ لیتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے دلی نفرت تھی اور ہر وقت یہی خواب دیکھتا تھا کہ میری قسمت یکایک پلٹا کھائے گی اور میں پھر امیر کبیر ہو جاؤں گا۔ کسی رشتہ دار سے ورثے میں جائداد ملنے کی موہوم امید اور اسی قسم کی اور امیدیں میرے دل میں جاگزیں تھیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ ایسی کوئی امید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

ہاں، ایک دن سردی سے ٹھٹھرتا ہوا اور بھوک سے مرتا ہوا میں کسی کے صحن میں جا نکلا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ یکایک باورچن نے آواز دی "او لڑکے۔ تم قفل ساز تو نہیں ہو؟" "ہاں میں قفل ساز ہوں" میں نے جواب دیا۔ انہیں اپنی لکھنے کی میز کا قفل مرمت کرانا تھا۔ وہ مجھے ایک آراستہ کتب خانہ میں لے گئی جہاں سونا ہی سونا پڑا تھا اور تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے کام شروع کر دیا اور قفل بنا دیا۔ گھر کی مالکہ نے مجھے ایک روبل دیا۔ میں نے رقم لے لی۔ لیکن اچانک میری نظر سنگ مرمر کے ایک مجسمے پر پڑی جو ایک چھوٹی سی خوب صورت تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ مجھے معلوم نہیں کیوں میں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا: نینا!

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں نینا کو بالکل بھول چکا تھا اور خاص طور پر اس وقت مجھے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ میں اسے بھول چکا ہوں۔ یا کم از کم بھلا چکا ہوں۔ یکایک اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ تاثرات خیالات اور خوابوں کی ایک کائنات جو میری روح میں مدفون تھی جاگی، اٹھی اور پھر وجود میں آ گئی . . . میں نے مرمر کے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ میرا تمام جسم لرز اٹھا اور میں نے کہا "خاتون اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ مجسمہ کس کا ہے؟" "اوہ، یہ مجسمہ؟ یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس کو بنے پانچ سو سال ہوئے ہیں۔ یہ پندرھویں صدی میں بنایا گیا تھا" اس نے مجھے مجسمہ ساز کا نام بھی بتایا لیکن میں نے نہ سنا اور اس نے بتایا کہ اس کا خاوند اس مجسمے کو اٹلی سے لایا تھا اور اس کی وجہ سے روسن اور اٹلی کی سفارتوں کے درمیان بڑی زبردست خط و کتابت ہوئی۔ "لیکن" خاتون نے مجھ سے کہا "تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ مجسمہ تمہیں پسند آیا ہے؟ تمہارا اعیار حسن بلند معلوم ہوتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس کے کان اصلی جگہ پر نہیں ہیں۔ کتنا ناہموار ہے . . . ؟" اور یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

"میں مکان سے باہر بھاگ آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یہ شناہت نہیں تھی بلکہ حقیقت میں اسی کا مجسمہ تھا۔ نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ . . . ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس مجسمے کے ذریعہ اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔ مجھے بتاؤ، وہ کون سی فوق العادت طاقت تھی جس کے ذریعہ پندرھویں صدی کے ایک فن کار نے وہی چھوٹے چھوٹے کان، جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں وہی آنکھیں جو ذرا سی ٹیڑھی تھیں، وہی ناہموار ناک اور وہی بلند پیشانی بنا دی اور ان اعضا سے خلاف توقع کس طرح اس عورت کا حسین ترین اور ساحرانہ چہرہ بنا لیا؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ دو عورتیں ایک ہی شکل و صورت کی پیدا ہوئیں . . . ایک پندرھویں صدی میں اور دوسری ہمارے زمانے میں اور وہ جس کی شبیہ مجسمہ ساز نے بنائی نہ صرف شکل و صورت میں نینا کے مشابہ تھی بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے عادات و اطوار اور روحیں بھی ایک سی تھیں۔

اس دن میری تمام زندگی کا رُخ بدل گیا۔ اس دن نہ صرف مجھے اپنی گزشتہ زندگی کی کمینہ حرکات کا احساس ہوا بلکہ میں اپنی موجودہ ذلت کی گہرائی کو پا گیا۔ نینا واقعی ایک فرشتہ تھی جسے قدرت نے میرے پاس بھیجا لیکن میں نے اسے نہ پہچانا۔ ماضی کو واپس لانا ناممکن بات ہے۔ لیکن میں اُس سے متعلق تمام واقعات کو یاد کرنا چاہتا تھا جیسے کوئی ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکڑے جوڑتا ہے۔ آہ۔ یہ ٹکڑے کس قدر چھوٹے اور غیر مربوط تھے۔ لیکن مجھے کتنی مسرت ہوتی تھی جب مجھے کوئی نئی بات یاد آجاتی تھی۔ میں ان باتوں کو یاد کرنے میں گھنٹوں گزار دیا کرتا تھا، لوگ مجھ پر ہنستے تھے لیکن میں خوش تھا۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور اب میرا زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لیکن اب بھی میں اپنی روح کو ذلیل خیالات سے پاک کر سکتا تھا اپنے دل سے ہم جنسوں کی نفرت کو دور کر سکتا تھا اور اپنے خالق کے خلاف اپنے شکوہ و شکایت کو بند کر سکتا تھا۔ نینا کی یاد میں مجھے یہ تمام پاکیزہ باتیں سوجھتی تھیں۔

"میں مجسمے کو ایک دفعہ اور دیکھنے کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں شاموں کو اس گھر کے گرد منڈلاتا رہتا اور اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ کھڑکی سے بہت دور تھا۔ میں تمام تمام رات گھر کے سامنے کھڑا رہتا۔ میں گھر کے تمام آدمیوں کو پہچاننے لگ گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کون کس کمرے میں رہتا ہے۔ آخر میں نے ایک ملازم سے دوستی گانٹھ لی۔ گرمیوں کے دنوں میں مالکہ اپنی جاگیر پر چلی گئی۔ اب مجھ میں صبر کی تاب نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں مر[illegible]نا کو ایک نظر اور دیکھ لوں گا تو مجھے تمام واقعات یاد آجائیں گے اور یہ میری انتہائی مسرت کا باعث ہوگا۔ اس طرح آخر کار میں اس بات کے لئے تیار ہو گیا جس کی پاداش میں مجھے قید کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھوں نے مجھے بڑے کمرے ہی سے گرفتار کر لیا اور مقدمے کے دوران میں یہ کہا گیا کہ میں قفل سازی کے بہانے سے مکان میں داخل ہوا تھا اور یہ کہ میں اکثر گھر کے نزدیک دیکھا گیا ہوں . . . میں ایک نفیر ہوں اور میں نے ان کے تالے توڑ ڈالے تھے . . . بہر حال اب یہ قصہ ختم ہو چکا ہے"۔

میں نے کہا "لیکن ہم تمہارے لئے اپیل دائر کریں گے اور عدالت تمہیں رہا کر دے گی"۔

بڈھے قیدی نے اعتراض کیا "لیکن کیوں؟ میری گرفتاری پر افسوس کرنے والا کون ہے اور میری ضمانت کون دے گا اور کیا یہ میرے لئے یکساں بات نہیں کہ میں نینا کو کسی سرائے میں یا دکروں یا قید خانے میں"؟

مجھے اس بات کا کوئی جواب نہ سوجھا لیکن بڈھے نے یکایک نظریں اٹھائیں اور اپنی عجیب اور دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

"صرف ایک بات مجھے دکھ دے رہی ہے۔ ممکن ہے نینا کبھی پیدا ہی نہ ہوئی ہو اور اس کی ہستی میرے کمزور اور شراب سے برباد شدہ دل کی اپنی تخلیق ہو اور محبت کا یہ تمام قصہ صرف اس مجسمہ کو دیکھ کر میرے دل نے گھڑ لیا ہو۔

"روسی"

مظفر احمد

میں پا کے اُس سے عقوبا پروانہ چھُٹ گیا
اہلِ خرد دھرے گئے دیوانہ چھُٹ گیا

نظم طباطبائی

یادِ فراموشی

دل سے بھلا چکا ہوں میں تیری نگاہِ ناز کو
چشمِ سیاہ مست کو، نرگسِ نیم باز کو
نائرۂ جمال کو، ولولۂ شباب کو
عارضِ نور پاش کو، زلفِ سیاہ تاب کو

دل سے بھلا چکا ہوں میں دلبریٔ خرام کو
تیرے لب و عذار پر موجۂ ابتسام کو
تیری ادائے دلربا، تیری نگاہِ شرمگیں
حسنِ لطافت انتما، جسمِ نزاکت آفریں

میں نے بھلا دیا ترے قلبِ وفا شعار کو
اور تری بزمِ حسن کی صحبتِ جلوہ بار کو
بیخودیٔ وصال کی بارگہِ نظارہ کو
چشمِ ستارہ ریز کو، چہرۂ ماہ پارہ کو

میرے دماغ میں نہیں تیری ادائے دلفریب
تیری نگاہِ جانستاں، غمزۂ آفتِ شکیب
جس نے پڑھا دیا مجھے درسِ حیاتِ عاشقی
جس کے اثر سے قلب میں تھے جذباتِ عاشقی

ایک مسرتِ نہاں ہے میرے دل میں موجزن
بزمِ خیال ہے مری عیشِ جہاں کی انجمن
خوش ہوں کہ میں مٹا سکا سوز و گدازِ عشق کو
خوش ہوں کہ میں بھلا سکا رازِ و نیازِ عشق کو

عرشی امرت

دُلھا دلھن کی ڈائری

(ہم اپنی ڈائری کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں لیکن اُن اصحاب سے معذرت خواہ ہیں جنھیں اپنی ترقی کے خلاف ان اندراجات میں رومانی عنصر کا نقدان نظر آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کے دیگر معاشرتی مسائل اس قدر اہم تھے کہ ان کے علاوہ، ورکسی طرف ہماری توجہ منعطف نہ ہو سکی۔ لیکن دو نوجوان روحوں کی نئی زندگی کے ابتدائی مراحل کے تجربات کا بیان شاید حیاتِ معاشقہ کے کوائف سے کم دلچسپ ثابت نہ ہو۔ دُولھا دلہن)

دُولھا

۲۹ر جنوری ۱۹۳۶ء کل شادی ہے۔ میری! میں نے والد سے بہتیرا کہا کہ ابھی مجھے شادی کرنے کی خواہش نہیں۔ لیکن انہیں تو اس کی کچھ ایسی دُھن سمائی ہے کہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ کبھی مذہب، کبھی رسم و رواج، کبھی فرائض پدری، اور کبھی خدا جانے کیا کیا چیزیں انہیں مجبور کر دیتی ہیں کہ میری شادی کر دیں۔ اُن کے نزدیک میرا تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازم ہو جانا شادی کی تشکیل کو کامیاب کرنے کے لئے بہت اچھا پس منظر ہے۔ وہ یہ تو نہیں سمجھتے کہ زمانۂ حال میں تنہا نوجوان کس قدر کم خرچ پر گزارہ کر سکتا ہے اور شادی ہونے کے بعد بیوی کے اخراجات کس قدر بڑھ جاتے ہیں اور پھر بچے تو آفتِ جاں ہو جاتے ہیں۔ اب تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہم اپنی تنہائی کے خلا کو پُر کرنے کے لئے یہ کرتے ہیں کہ کبھی سینما چلے جاتے ہیں، کبھی شام کو ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں، کبھی گھوڑ دوڑ اور کبھی شہر میں سرکس آ جائے تو وہاں احباب کے ساتھ حاضری ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ زندگی کچھ اتنی گراں نہیں۔ عورت کے لئے فی الحال اپنی آمدنی سے جو خرچ اوا کرنا پڑتا ہے وہ صرف وہی ہے جو کبھی کبھی گانا سننے کے لئے دینا پڑتا ہے اور بس۔ لیکن شادی کے بعد تو سب کچھ شاید شہنگا رمیز کی آرائش کے لئے بھی کافی نہ ہو سکے۔ ان بھلے لوگوں سے پوچھئے کہ ہم آپ کا کیا بگاڑ رہے ہیں جو ہماری آزادی آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

طرہ اس پر یہ ہے کہ ہم ابھی تک ہونے والی بیگم سے ہی آشنا

دُلہن

۲۹ر جنوری ۱۹۳۶ء آخر مجھے اس قدر تعلیم دلوانے اور میرے ارادوں کو بلند کرنے کا کیا مقصد تھا۔ جو ناگہاں مجھے حیوانوں کی طرح کسی مرد سے کس کر باندھ دینا تھا۔ خدا جانے ابا کو کیا ہو گیا ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موسیقی اور مطالعہ کے سوا دنیا میں مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیکن پھر بھی والدہ کے اصرار پر فوراً اپنا فیصلہ دینے کے لئے تیار ہو گئے کہ میری شادی ہونی چاہئے اور ضرور ہونی چاہئے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی ہوں کہ ایک رقعے میں اپنے جذبات قلمبند کر کے ابا کی میز پر رکھ دوں۔ مگر باجی میری جان کھا گئی ہیں۔ میں نے جب سے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہے۔ وہ پند و نصائح کے دریا بہاتی رہتی ہیں اور میری ہمت کو پست کرتی رہتی ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ تو بے فائدگی نہیں کہ لڑکی سے پوچھے بغیر اس کا بیاہ رچا دیا جائے لیکن اُن کے نزدیک یہ بے حیائی ضرور ہے کہ لڑکی شادی کرنے سے انکار کر دے۔ لڑکا لاکھ تعلیم یافتہ سہی، آزاد خیال سہی، ہر طرح سے معقول انسان سہی لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ میرے لئے موزوں خاوند کیسے بن سکتا ہے! ابا کو کیا معلوم کہ آج کل کے نوجوان کن کن غلط خیالوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اپنی دانش، اپنے علم اور اپنے تدبر کے سامنے وہ تمام حکما کی زبر کی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ وہ شعر پڑھ لئے تو لقا و بن گئے۔ سینما میں ایک دو گانے سنے تو زنان تھیٹر پر آوازے کسنے لگے۔ ایم اے کی ڈگری لے لی تو یہ سمجھ لیا کہ اپنے مضمون میں وہ اُستادِ زمانہ ہیں۔ ذہنی سلیم تو فطرت نے مردوں کو ودیعت ہی

نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کالج کی ابتدائی جماعتوں تک تعلیم پا چکی ہیں۔ ہوگا! ہم نے تو انہیں شہر میں رہتے ہوئے کبھی کسی مباحثے کسی تجویز یا کسی سماجی اجتماع پر آتے نہیں دیکھا۔ اگر آئی بھی ہوں گی تو نقاب اوڑھے ہوئے۔ میں تو یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ وہ میرے ساتھ عوام کے سامنے نقاب پہن کر چلیں۔ کوئی اُن کی زیبائش کو اچک کر بھر اُڑا لے جائے گا۔ لوگ گھورتے ہیں تو گھورنے دو۔ خود بخود گھورنا چھوڑ دیں گے۔ ہمیں تو ایک رفیقِ حیات کی ضرورت ہے اس لئے ہم تو انہیں ہر تقریب، ہر اجتماع اور زندگی کی ہر دلچسپی میں مساوی شرکت کے لئے مجبور کریں گے۔

۳۱ر جنوری سنہ ۳۰ء۔ لو دہی ہوا نا! والد نے گھوڑے کو بیل کے ساتھ کس کر باندھ دیا ہے کہ نہ چلے اور نہ چلنے دے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شادی سے قبل بیگم کے والدین نے اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ہمیں اپنی بیگم سے ملاقات کا موقع نہیں دیا تو نہ سہی شادی ہونے پر یہ حسرت اچھی طرح سے نکال لی جائے گی۔ اُن کے ساتھ سینما پر جایا جائے گا۔ اُن کے ساتھ کھانا کھایا جائے گا وہ موسیقی کی ماہر ہیں اُن سے گانا سُنا جائے گا۔ کچھ شعر و سخن پر گفتگو ہوگی اور اگر ہو سکا تو شام کے لمحوں پر بھی اُن کی معیت سے بہتر نشست حاصل کی جائے گی۔ لیکن یہ سب توقعات موہوم تھیں۔ بیگم تو ہمارے گھر آنے پر کچھ اِس قدر خاموش ہیں اور ہر ایک ہنگامے سے اس قدر بیزار ہیں کہ ہمیں بھی گوشہ گیر ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ نہ سینما جاتی ہیں نہ لکچر سنتی ہیں نہ اور کسی موضوع پر گفتگو کرتی ہیں۔ کل شام باجہ سامنے لا کر رکھا۔ کئی ایک عزیزوں نے منت خوشامد کی کہ کچھ سنائے مگر انہیں تو ایسی چُپ لگی ہے کہ یا زبان ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تنہا کوئی کتاب لے کر بیٹھ رہتی ہیں اور اگر کوئی آ جائے تو وہ بھی ایک طرف پھینک کر کرسی پر سمٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ حیران ہوں کہ اچھے پڑھے لکھے بُت سے پالا پڑا ہے۔ میں نے تو تنگ آ کر اُن سے یہی کہہ دیا ہے کہ اگر آپ اسی طرح خاموش رہیں گی تو میری طبیعت بہت مکدر ہو جائے گی۔ اُن پر نہ التجا کا اثر ہے نہ فہمائش کا۔ بس اپنا سر پیٹیا اور چپکے ہو رہو میں نہ کہتا تھا کہ پردہ کرنے والی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اچھی بیویاں نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ [illegible] ستی اِن کی گھٹی میں داخل ہوتی ہے اور یہ ہر موقعہ پر اپنی اِس قبیح فطرت [illegible] کے پردے میں مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔

نہیں کیا۔ زندگی کے لطیف رُخ سے محظوظ ہونے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

سنتی ہوں کہ میرے ہونے والے خاوند نہایت آزاد خیال ہیں پردے کے بھی حامی نہیں۔ لیکن یہ لوگ کیا جانیں کہ مرد آزاد خیال ہونے کے باوجود کس قدر غلام پسند ہوتا ہے، وہ اپنے لئے تو ہر ایک طرح کی آزادی پسند کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کو تو بے مہار رو راہوار کی طرح پورا کرتا ہے۔ لیکن جب صنفِ نازک اور خصوصاً اپنی بیوی کے حقوق اور اُس کی آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کا رویہ مایوس کن حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۳۱ر جنوری سنہ ۳۰ء۔ خدا جانے یہ مرد اس قدر بے باک کیوں ہوتے ہیں! دو اور دو چار گھنٹے شادی کو نہیں ہوئے اور ہم سے تقاضا شروع ہو گیا کہ گانا سناؤ۔ ابھی مہمان بھی رخصت نہیں ہوئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ سینما پر چلنا چاہئے۔ نہ پہلے کی جان نہ پہچان اور یہ استفسار کر دیا جانا ہے کہ شیلے اور کیٹس میں سے مجھے کون سا شاعر زیادہ مرغوب ہے؟ آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ ایک اجنبی اور وہ بھی مشرقی عورت سے کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ایک دن میں وہ آپ سے اس قدر کھل جائے گی کہ شیلے اور کیٹس پر بحث کرنے لگے گی۔ تمام عزیز و اقارب کے سامنے گانا گائے گی اور شام کو آپ کے ساتھ سینما پر بھی چلی جائے گی؟ ہمارا گھر مشرقی گھر ہے۔ اُس میں ساس بھی ہے، خسر بھی ہے، دیور بھی ہیں، نند بھی ہے۔ بھلا اِن سب کی موجودگی میں میں یہ رویہ کس طرح رکھوں کہ چونکہ ہم نے شادی کی ہے اس لئے اب صرف ہمیں ہی اس گھر میں رہنا ہے اور جس طرح ہمارا جی چاہے ویسے ہی رہنا ہے۔ حظِ مراتب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ تفصیلِ مسرت کا مفہوم یہی ہے کہ ہم اپنی لذت کے لئے حیا کو بالائے طاق رکھ دیں۔ میں ابھی نامانوس فضا سے آشنا بھی نہیں ہوئی اور اُن کی طرف سے یہ شکائت بھی شروع ہو گئی ہے کہ میں نہایت ہی اَن سوشل (Unsocial) ہوں۔ کیا سوشل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ میں پردہ اٹھا کر اُن کے ساتھ بھاگتی پھروں۔ ذرا دم لیں۔ یہ حسرت بھی نکل جائے گی۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ ہمارے مرد اپنی عورتوں کا سوشل ہونا کس قدر پسند کرتے ہیں۔ رشیدہ کے خاوند کو ہی لو۔ شادی کا سلسلہ تو کلب کی ملاقات سے شروع ہوا اور اب شادی ہو گئی۔ تو بے چاری کو اتنی اجازت بھی نہیں کہ بے پردہ سہیلیوں کو اپنے گھر پر ہم دعوت دے سکے۔ اب اس کے شوہر کے مسلمان ہمسائے اس پر معترض ہوتے ہیں۔

۴ر فروری سنہ ء سینما پر دوستوں اور بیوی کے ساتھ

جانے میں بہت فرق ہے۔ دوست ہنسی کا موقع نہ بھی ہو تو ہنستے ہیں، بیوی ہنسی کا موقع ہو تو بھی نہیں ہنستی۔ رات میں نے بہتیری کوشش کی کہ بیگم پاس بیٹھی ہوئی ہندو یا انگریز عورت کی طرح فلم سے محظوظ ہوں، لیکن خدا جانے وہ اس قدر متین کیوں ہیں کہ تبسم ہونے کے سوا نہ انہوں نے کوئی ریمارک دیا اور نہ قہقہہ لگایا۔ اسی طرح تو ہماری عورتوں کی زندگی ملول ہو جاتی ہے۔

باہر نکلنے پر میں نے کہا "بیگم پیدل چلو گی؟" اس طرح سیر ہو جائے گی۔ بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے بازو میں بازو دے کر چلنا چاہا تو بیگم نے جھجلا کر اپنا بازو الگ کر لیا، اور کہنے لگیں "آپ تنہا چلیں میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گی، میں کچھ دیر تک تو چلتا رہا پھر مجھے اپنی حرکت مضحکہ خیز نظر آنے لگی۔ مجبوراً میں نے تانگہ لے لیا اور ہم تانگے پر واپس آئے۔ راستے میں فلم پر تنقید کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے بیگم سے یہ کہا کہ وہ اپنی رائے دیں لیکن انہوں نے کہنی سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے نہایت دھیمی آواز سے کہا۔ "بھلا تانگے میں بیٹھ کر تانگے والے کے سامنے بھی کوئی بات کرتا ہے۔ اس وقت خاموش رہنا بہتر ہے" میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور راستہ بھر اس منطق اور اس فلسفۂ اخلاق پر غور کرتا رہا جس کی رو سے ہماری بیگم نے بیک جنبش زبان تانگے میں بیٹھ کر گفتگو کرنے کو حدود اخلاق سے تجاوز کرنے کے مترادف قرار دیا تھا۔

۱۵ر فروری سنہ بیگم کل شام گاتی رہیں۔ کچھ سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ میں تو سیر پر گیا ہوا تھا۔ واپس آنے پر والدہ نے اس کا ذکر کیا اور اس انداز میں جیسے وہ اس فعل کو نہایت برا سمجھتی ہیں۔ نہ جانے کیوں! کہہ رہی تھیں پڑوسن کہہ رہی تھی "نئی بہو تو نا چنا گانا خوب جانتی ہے۔ ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ ڈھولکی کے ساتھ ہر طرح کے اچھے برے گیت گانے تو جائز ہیں لیکن ہارمونیم یا گنگھرو ؤں کے ساتھ گانا مذموم ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا ہم تو خوش ہیں کہ بیگم نے بسم اللہ کی ہے۔ اب کبھی ہمیں بھی گانا سننے کا موقع مل جائے گا۔ مجھ سے ذکر ہوا تھا۔ ابھی دیر تو نہیں کرتیں لیکن شاید اصرار سے کام بن جائے۔

۲۲ر فروری سنہ ء رات شام کے کھانے کے بعد غالب کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ بیگم کو غالب کا فلسفۂ حیات نہایت ناپسند ہے۔ کہنے لگیں نہایت لاحاصل شاعر تھا۔ شاعری اس کا ہی نام نہیں کہ نہیں

۴ر فروری سنہ ء رات سینما پر ہی گئے۔ میں نے بہتیرا انکار کیا لیکن ان کے اصرار کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔ تصویر مزاحیہ تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر سٹال میں ایک انگریز اپنی میم کو لئے بیٹھا تھا اور ان سے پرے ایک ہندو خاتون ساری پہنے ہوئے اپنے پتی کا پہلو سنبھالے ہوئے تھیں آپ نے مجھ سے تقاضا کیا کہ میں ہم رقع اتار دوں۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا ہاں روشنی بند ہونے پر میں نے نقاب اٹھا دیا تاکہ تصویر صاف نظر آئے کھیل کے دوران میں سب لوگ ہنستے رہے لیکن ہم تو اس قدر بے محابانہ قہقہے لگاتی کہ اس کی جنہیں تمام ہال میں سنائی دیتیں ہندو خاتون کا بھی کوئی کوئی قہقہہ بلند ہوتا لیکن شاذ و نادر میں صرف متبسم ہونے پر قانع تھی۔ اس کی وجہ کچھ عادت اور کچھ مجبوری لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھے میرے تبسم کو قہقہوں میں تبدیل کرنے کے لئے انہوں نے بارہا مجھے گدگدایا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

وقفہ میں نیچے کے ہم مردوں نے سٹال کی طرف دھکا مارنا شروع کر دیا۔ تھرڈ کلاس میں جن لوگوں کو بیٹھے بیٹھے ہم نظر نہ آتے تھے وہ کھڑے ہو کر بلکہ اڑ یوں پر کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ میں نے تو گھبرا کر نقاب چہرے پر پھینک دیا وہ کہتے رہے کہ کوئی کچھ اپاک کے نظر آئے گا۔ وہ دیکھو دوسری عورتیں بھی تو ننگے منہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ لیکن مجھ سے تو عوام کی نگاہوں کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ خدا جانے کیوں جب ہم باہر نکلنے لگے تو ہمارے دیر سے باہر آنے کے باوجود دروازے پر دو دو دیکھی مرد کھڑے ہوئے تھے جو باہر نکلنے والی ہر عورت کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے تو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔

۱۵ر فروری سنہ ء کل شام بلقیس، اوشا، اور رشیدہ مجھے ملنے آئیں۔ کالج کے ایام کی سہیلیاں ہیں۔ کول کمرے میں بیٹھے ہوئے انہوں نے چائے کے بعد مجھے مجبور کر دیا کہ میں گانا سناؤں۔ پاؤں سے گھنگرو بجانا میرا مرغوب ساز ہے۔ گانے اور ہارمونیم کے ساتھ گنگھرو بھی بجتے رہے۔ بلقیس کی داد بہت بلند آہنگ تھی۔ خوش دامن کچھ اس داد سے متاثر ہو کر اور کچھ خس کی خاطر ننگے پاؤں میری پشت پر آ کر کھڑی ہو گئیں سہیلیاں کچھ عرصہ تک شرارت کرنے کے خیال سے خاموش رہیں، پھر جب ان کے قہقہے لگانے پر میں نے مڑ کر دیکھا تو خوش دامن کی پیشانی پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ میں محجوب سی ہو گئی اور گانا بند کر دیا۔

۲۲ر فروری سنہ ء

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بھلا جو شخص اس قدر یاس انگیز شعر کہے وہ اچھا شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔ سارا

زندگی میں مایوسی کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ اقبال کو دیکھیے کس قدر عملی زندگی کی تلقین کرتا ہے اور میں کے علی الرغم غالب کو زندگی کی کشمکش سے مغلوب ہونے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ میں نے نتیجہ یہ کیا کہ غالب شاعری کا بادشاہ ہے۔ جدت طرازی اور خیالات کی بلند پروازی اس کے ہی حصے میں آئی تھی اور زندگی کے گھناؤنے رُخ کو واضح کرنے میں اُس نے کون سا قصور کیا ہے۔ آخر زندگی ایک المیہ نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن میرے دلائل کسی کام نہ آئے۔ آخر تنگ آ کر میں سونے کے ٹوائلٹ گیا۔ عورتیں اور بالخصوص اپنی بیویاں مردوں کا بہائت ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ زبان جب چلنے لگتی ہے تو کتنی ہی نہیں۔

۸ مارچ سنہ ۳۹ء دوپہر کے کھانے پر انتظار کرنا شروع کیا۔ اسی انتظار میں ایک مدت گزر گئی لیکن بیگم گول کمرے سے ملنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ ایک دو دفعہ بلا بھی بھیجا لیکن خادمہ کو ٹال دیا۔ آخر جل بھن کر تنہا کھانا کھا لیا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آج بیگم کو دو چار کھری کھری سنائی پڑیں گی اور تو سب لوگوں سے پردہ ہے لیکن حسن سے پردہ نہیں کیونکہ وہ بھائی کا دوست ہے اور بچپن میں اُن کے ساتھ کھیلا ہوا ہے۔ میں پردے کا حامی نہیں۔ لیکن یہ کیا کہ کسی سے پردہ ہو اور کسی سے نہ ہو۔ مانا حسن نہایت ہی شریف لڑکا ہے اور بیگم کی عزت بہنوں سے زیادہ کرتا ہے لیکن مجھے یہ ملاقاتیں پسند نہیں۔

آخر کار بیگم حسن کو رخصت کر کے آئیں۔ میں بھرا بیٹھا تھا۔ کھانا بھی نہ کھانے دیا اور برس پڑا کہ آج آپ کا پردہ کیا ہوا۔ خدا جانے کیا کیا کہتا رہا۔ بہر حال دل کا غبار نکال لیا۔ بیگم خاموشی سے سنتی رہیں میری کسی بات کا جواب نہ دیا اور کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئیں والدہ نے کہا روٹھ گئی ہیں بلا سے روٹھ گئی ہیں تو آپ ہی من جائیں گی۔

۱۵ مارچ سنہ ۳۹ء میں نے کہا نیو تھیٹرز کی نہایت عمدہ فلم "مایا" آئی ہے۔ دیکھنے چلیں گی۔ کہنے لگیں نہیں۔ اول تو میں ہندوستانی تصویریں پسند ہی نہیں کرتی اور دوسرے میں نے ایک سہیلی سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم کوئین کرسٹینا دیکھنے جائیں گے۔ میں نے کہا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اس پر ناراض ہو گئیں کہ میں اُن کے معاملات میں کیوں دخل دیتا ہوں جب کہ وہ مجھ سے کسی طرح کا تعرض نہیں کرتیں اس کے بعد پھر ہندوستانی تصویروں کی تنقیص شروع کر دی۔ اس سے میں چڑ گیا کہنے لگیں ہندوستانی تصویریں کس کام کی ہوتی ہیں۔ نیو دیوان دیکھو۔ نوے فی صدی اشعار اسی مضمون کے حامل ہوں گے کہ دست و بازو توڑ کر بیٹھ جاؤ اس زندگی میں غم و رنج کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بخشش حیات کا انجام فنا ہے۔ اس لئے کوئی کوشش فضول ہے۔ یہ ہے غالب کی شاعری۔ نوجوان کے لئے میرے خیال میں اس کا مطالعہ تو عملی زندگی کے لئے زہر کا اثر رکھتا ہے میں نے جو سیدھے سادے الفاظ میں اس قدر ناگوار تبصرہ غالب کی شاعری پر کیا تو بچہ کر بگڑ گئے۔ کہنے لگے تم ناخدا لگنے لگتی ہو۔ نہ کچھ سمجھ ہے نہ عقل بس زبان تمہاری چلتی ہے اور لڑکے تم پیچھے پڑ جاتی ہو۔ یہ ایک ادبی ہنگامے کا ذکر ہے کہ اُن کی مرضی کے خلاف ذرا سی بات ہوتی تو بگڑ گئے۔ کوئی کہے ایسے لوگوں سے بات کرنا اچھا ہے یا خاموش رہنا بہتر

۸ مارچ سنہ ۳۹ء۔ یہ آج معلوم ہوا کہ حضرت کس قدر آزاد خیال ہیں حسن بھائی آئے ہوئے تھے۔ میں اُن سے باتیں کرتی رہی۔ اُس کمبخت سے کہا بھی کہ کھانا کھا لو مگر وہ اس قدر شرمیلا ہے کہ انکار ہی کرتا رہا۔ مجبوراً میں بھی اُس کے پاس ایسے ہی بیٹھی رہی اور جب اُسے رخصت کر کے کھانا کھانے گئی تو وہ بے اختیار مجھ پر برس پڑے۔ طرح طرح کے طعنے دئے۔ کبھی پردے کو ہدف ملامت بنایا کبھی مجھے کوسا۔ وہ تو خوشدامن کا بھلا ہو جس نے انہیں خاموش کرایا ورنہ خدا جانے وہ کیا کہہ بیٹھتے۔ میں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی اس سے دل کی کچھ بھڑاس نکلی۔

میں سوچ رہی ہوں کہ یوں تو ہر روز پردے کے خلاف لکچر دیا کرتے تھے آج انہیں کیا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ منہ سے باتیں کرنا آسان ہے اور کسی کام کو صحیح معنوں میں سمجھنا دشوار ہے۔ میں پہلے دن سے ہی سمجھتی تھی کہ دوسرے لوگوں کی بیویوں کو بے پردہ دیکھ کر اپنی بیوی کو بھی بے پردہ رکھنے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بیوی کی اس آزادانہ روش کو پھر مرد آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ منہ سے کچھ نہ کہے جی میں ضرور کڑھتا ہے۔

۱۵ مارچ سنہ ۳۹ء یوں تو ہر ایک بات میں رائے ظاہر کرنے کے لئے استفسار کیا کرتے تھے لیکن جب ہم نے رائے ظاہر کرنی شروع کی ہے تو بگڑنے لگے ہیں۔ کل میں رقیہ کے ساتھ انگریزی فلم دیکھنے کے لئے جانا چاہتی تھی تو آپ اس پر مصر ہوئے کہ نہیں ہندوستانی تصویر دیکھنی چاہئے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس پر آپ نے بحث شروع کر دی۔ میں نے پھر انگریزی اور ہندوستانی تصویروں کا مقابلہ کیا تو آپ اور چڑ گئے اور بالآخر نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق آپ نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ہم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ غنیمت یہ تھا کہ رقیہ ابھی تک میرے

تھیٹر ملنے چند ایک انگریزی تصویروں کی نقل کر کے نام پیدا کر لیا ہے۔ اب جو بھی اُلٹی سیدھی تصویر وہ اپنے مخصوص ایکٹرسوں سے بناتے ہیں، وہ مقبول ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انگریزی فلموں کی مثالیں دے کر جو لکچر دینا شروع کیا تو تھمتے ہی ہیں نہ آتی تھیں۔ الٰہی پناہ!

۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء شادی سے پہلے اُن بہت سی مصیبتوں کا گمان بھی نہیں ہوتا جو شادی کے بعد پیش آنے والی ہوتی ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ بیوی پڑھی لکھی، باپردہ اور حیادار عورت ہوں گی جس طرح جی چاہے گا اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہیں گے۔ لیکن یہ سارے قیاسات غلط نکلے۔ وہ ہر فعل اور ہر بات کی توجیہ چاہتی ہیں۔ اب سارا دن اور سارا ہفتہ منطق کی مشق کرتے ہوئے کیسے بسر ہو۔ وہ ہر وقت اپنا نیا پروگرام بنائے رکھتی ہیں۔ ہم چکھے بیٹھنا چاہیں تو وہ گانا شروع کر دیتی ہیں۔ ہم سیر کو جانا چاہیں تو وہ خط لکھنے لگتی ہیں اور اعتراض کرو تو کہتی ہیں ہمارا معمول ہی یہی تھا۔ ہم حیران ہیں کہ شادی کی یہ گاڑی اس طرح کیسے چلے گی۔ آج تین دن ہو گئے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی۔ ایسے ہی کئی تین دن پہلے گزر چکے ہیں اور نجانے آئندہ کتنے آنے والے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۳۷ء۔ ہم دونوں ایک ہفتے سے ایک دوسرے سے بگڑے ہوئے ہیں۔ رات بڑے میاں آئے۔ ساری عمر تو فوج میں گزار آیا ہے لیکن کبھی کبھی پتے کی بات بھی کہہ دیتا ہے۔ باتوں باتوں میں والد نے ہماری ازدواجی زندگی کے ناگوار کوائف کا اُن سے ذکر کر دیا۔ پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہمیں بچپن سے جانتا ہے اور ہمارے حالات سے واقف ہے۔ ہمیشہ بزرگانہ انداز میں مخاطب کرتا ہے۔ کہنے لگا رفتہ رفتہ سنبھل جائیں گے۔ دو چار مہینے شادی کو ہوئے ہیں ابھی کون سا وقت گزرا ہے (پھر ہم سے مخاطب ہو کر) کیوں بیٹا تم نے شادی کر کے یہ سمجھا ہو گا کہ اب زندگی سراسر شادمانی ہو گی۔ نئی روشنی کے آدمی ہو نا۔ نئی نئی تجویزیں ذہن میں آتی رہیں۔ اپنی روایات سے پہلو تہی کر کے نئی طرح کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور یہ نہ دیکھا کہ ہر ایک طرح کی نئی چیز اور بالخصوص بہت سے مغربی اثرات ہماری زندگی کو راس نہیں آتے۔ اب اس کوشش میں ناکام ہوئے ہو تو مایوس ہونے لگے ہو۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ دیانتداری سے شادی کے مسئلے کو نبھانے کی کوشش کرو۔ میاں بیوی میں ایک سمجھوتے کی ضرورت ہے جو تم نہیں کر سکے۔ اس پر غور کرو۔

بڑے میاں تو یہ کہہ کر چل دیئے اور میں کافی عرصہ تک اُس کی باتوں پر غور پر نہیں پہنچی تھی۔ میں نے نوکر کو رقعہ دے کر دوڑایا اور معذرت کر دی کہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ کہیں وہ ہمارے ہاں آ نکلتی تو اُسے پتہ چل جاتا کہ ہمارے آزاد خیال شوہر کیا گُل کھلا رہے ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء میں نہ کہتی تھی کہ مرد کسی صورت میں بھی اپنی خواہشات کی پامالی برداشت نہیں کر سکتا۔ شادی سے پہلے ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمارے شوہر نہایت آزاد خیال، تعلیمیافتہ اور بردبار انسان ہیں۔ لیکن شادی کے بعد اب پتہ چلا کہ اس آزاد خیالی اور بردباری کا مفہوم کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ میاں جو کچھ کہے وہ بیوی کرتی رہے تو میاں خوش اور نہ کرے تو میاں ناراض۔ پہلے کبھی پردے کی مخالفت ہوتی تھی کبھی ہماری خاموشی کی شکایت کی جاتی تھی کبھی ہمیں اُن سوشل کہا جاتا تھا۔ اب یہ نوبت آ پہنچی ہے کہ سیر کرنے کو پسند ہی نہیں کیا جاتا۔ گانے لگیں تو آپ کا سر درد کرنے لگتا ہے۔ کسی سہیلی سے ملنے جائیں تو آپ کو کوفت ہوتی ہے۔ کسی کو اپنے ہاں بلائیں تو اس سے ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ خدا جانے عورتوں میں کوئی خوبی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہمارے میاں تو سمجھتے ہیں سب عورتیں احمق ہوتی ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۳۷ء۔ زندگی دن بدن ناگوار صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ بات بات پر تنازعہ ہوتا ہے۔ اُن کی طرف سے یا میری طرف سے۔ وہ میری ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر بار مجھے شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اُن کا کام جب دلائل سے نہیں چلتا تو احکام پر اُتر آتے ہیں۔ بیوی کے فرائض کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔ کل صوفیا ملنے آئی میں نے اُس سے اپنی مصیبت کا ذکر کیا۔ صوفیا کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں میری باتیں سُن کر مسکرا دی۔ کہنے لگی، تم نے شادی کا غلط مفہوم ذہن میں قائم کیا تھا۔ بیکے کے مردوں کی اور حیثیت ہوتی ہے۔ خاوند کی اور حیثیت ہوتی ہے۔ اُن سے خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہاں عمر کی رفاقت ہوتی ہے اور رفاقت کے لئے میاں بیوی کو شادی کے بعد زندگی میں ایک نیا توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ تم دونوں آج تک اپنا محاسبہ نہیں کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے مایوس ہو رہے ہو۔

صوفیا چلی گئی ہے۔ میں یہ سطور لکھتے وقت سوچ رہی ہوں کہ ان باتوں میں کچھ صداقت بھی تھی یا نہیں۔ میں نے تو شادی کو ایک معما بنا کر چل دی ہے۔ لیکن اس معمے پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صوفیا کا تبصرہ یہ معنی؟

۲۰ رمئی ۱۹۳۶ء - توبہ خدایا یہ دو اجی زندگی کے ناگوار ایام بھی کتنے تلخ ہوتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اب یہ سلسلہ منقطع ہو کر ہی رہے گا اور نہ صرف یہ ہوگا بلکہ ہماری زندگی ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ بھلا ہو بڑے میاں کا۔ چلتے چلتے چند باتیں کہہ گیا۔ میں سوچتا رہا تو معلوم ہوا کہ اُس کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ نہ کوئی بات ہوتی ہے نہ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور گھر میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو انسان اور انسانی کمزوریوں کا حامل سمجھنے سے بہت سے تنازعات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک دو دن میں میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا اور آخر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے میں بیگم کے پاس چلا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں وعظ کرنے سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ کچھ معافی، کچھ وعظ، کچھ التجائیں اور کچھ وعدے کرنے سے کدورت دُور ہو گئی اور بیگم راضی ہو گئیں۔

۳۰ رجون ۱۹۳۶ء - زندگی کا اس قدر ہموار ہو جانا بھی کس قدر عجیب ہے کہ کئی دنوں سے ڈائری میں درج کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ملا۔ کل میں ناول پڑھ رہا تھا۔ بیگم نے پیچھے سے آکر میری آنکھیں موند لیں۔ اُن کے ہاتھ مجھ سے کب چھپے رہتے ہیں۔ جب میں نے بوجھ لیا تو کہنے لگیں ہم آپ کو تب جانیں جب آپ وہ راز بھی بوجھ لیں جو میں آپ سے کہنے آئی ہوں۔ میں نے کہا بیگم میں جوتشی تو ہوں نہیں۔ بیگم کچھ لجائیں اور میرے کان کے قریب جھک کر کچھ کہا . . . میں نے حیران ہو کر کہا۔ کیا یہ سچ ہے؟ بیگم کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور متبسم ہو کر سر کو اثباتی انداز میں ہلا کر کمرے سے نکل گئیں۔

---

۳۰ راگست ۱۹۳۶ء - کل صبح کوٹھی کے برآمدے میں ہم دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ بیگم لالا لالا نہ اندازمیں کہنی کے سہارے مجھ پر جھکی ہوئی تھیں سامنے دور گھاٹی سے پرے، پہاڑی کی چوٹی پر سفید سفید بادل گھر گھر کر جمع ہو رہے تھے۔ یکایک مجھے کچھ سوجھی میں نے بیگم کو مخاطب کر کے بادلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"وہ دیکھا؟"

"ہاں" اور پھر اپنے جواب سے اچانک مطمئن نہ ہو کر بولیں "کیا؟"

میں نے توضیح کرتے ہوئے دہرایا "وہ سفید سفید بادل جو پہاڑی کی چوٹی پر جمع ہو رہے ہیں"

بولیں "ہاں دیکھے!"

۲۰ رمئی ۱۹۳۶ء میں منہ پھلا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ آئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کوئی اور قضیہ برپا ہوگا۔ لیکن صوفیا کی باتوں پر غور کرنے کے بعد میں نے دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ میں انہیں ناراض ہونے کا موقع نہ دوں گی۔ لیکن دل میں ڈر ضرور رہی تھی۔ انہوں نے آتے ہی کچھ خجالت آمیز لہجے میں مجھے پکارا۔ میں نے جواب تو نہ دیا لیکن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آپ نے چھوٹتے ہی گلوں کی پوچھار کر دی۔ اپنے احسانات میری بدسلوکیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی اور پھر گفتگو کا رُخ بدل کر صلح و آشتی کی تجاویز پیش کیں۔ میں پہلے ہی اس کے لئے تیار تھی۔ لیکن میں نے یہ ضرور کہہ دیا کہ وہ تمام شکایات جو انہوں نے میرے خلاف کیں وہ اس لحاظ سے بے جا تھیں کہ یہ سب کھٹن کے ایام سے ہوا تھا۔ شادی کے ابتدائی ایام میں اُن کے جو تقاضے مجھ سے ہوتے تھے وہ پورے کرنے پر انہیں ناگوار گزرے اور وہ خواہ مخواہ بگڑنے لگے۔

بہرحال اس ملاقات میں بحث کی بجائے دونوں طرف سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش کامیاب رہی۔

۳۰ رجون ۱۹۳۶ء - کل میں نے اُن سے ایک راز کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ بعد میں وہ پکارتے رہے لیکن میں نہ گئی۔ پھر میرے کمرے میں آ گئے۔ خوشدامن بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب مجھے لے جانے کے لئے مصر ہوئے تو میں نے کہا کہ میں اس شرط پر جا سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے اُس راز کے متعلق کوئی بات نہ کریں جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ وہ مان گئے۔ اپنے کمرے میں لے جا کر مجھ سے پہاڑ پر جانے کے متعلق مشورہ کرتے رہے اور یہ طے پایا کہ تیسرے دن پہاڑ جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

میں نے کہا "میری محبت بھی اسی طرح ہے جو گھر گھر کر اپنے مقصود کے گرد جمع ہوتی رہتی ہے، اور زیادہ ہونے پر اور زیادہ ہونے کی تمنا کرتی ہے!"

بیگم مسکرائیں اور پھر دفعتہً کہنے لگیں "یہ سچ ہے لیکن اُس پہاڑی کو بھی دیکھا کہ اپنی قلیل گرانباری کے ساتھ مستقل طور پر قائم ہے۔ بادل اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں، پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ پہاڑی نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ میری محبت تو اس کی مانند ہے۔ اسے بادلوں کی طرح بکھرنا نہیں آتا"

بیگم یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں اور میں [illegible]

(یہ اندراج دونوں ڈائریوں میں طرزِ بیان کے سوا بیک مفہوم درج ہے۔)

نسیم رضوانی

خدا اور انسان

جہاں طراز ہے تو، رونقِ جہاں ہوں میں
فسانہ ساز ہے تو، جانِ داستاں ہوں میں

یہ کائناتِ عظیم و وسیع و لامحدود
ترا سفینہ ہے، لیکن سفینہ راں ہوں میں

ترے فرشتوں میں تھا زندگی کا سوز اگر
ازل سے کس لئے پھر وقفِ امتحاں ہوں میں

تو اک کنایۂ جاں بخش و روح پرور ہے
اور اک گداز سے لبریز داستاں ہوں میں

مرے لہو سے ہے شاداب ہر پیام ترا
جگر کے خون سے سینچی ہوئی اذاں ہوں میں

یہ مانتا ہوں کہ تو نے مجھے بنایا ہے
مگر تجھے بھی نہیں علم اب کہاں ہوں میں

مرے شعور و تخیّل کی وسعتوں کے حدود
مری نظر سے بھی گم ہیں، کہ بیکراں ہوں میں

عجب جنوں مری فطرت میں شعلہ افگن ہے
کہ بے قرار مثالِ یمِ رواں ہوں میں

مثالِ سنگ ہوں مضبوط و سخت و بے پروا
مثالِ شمع ضعیف اور نرم جاں ہوں میں

کبھی خرد کے یقیں پاش دام میں ہوں اسیر
کبھی یقیں کی فضاؤں میں نغمہ خواں ہوں میں

ہزار تلخ حوادث ہیں راہ میں حائل
کہ جن کے غم سے جگر چاک و نیم جاں ہوں میں

تو میری روح کے اعماق میں اگر اُترے
تو اُس مقام پر آئے اگر، جہاں ہوں میں

عیاں ہو تجھ پہ خدائی بھی گو کہ مشکل ہے
بہت دقیق مگر اس سے میری منزل ہے

عدمؔ

نیپال کے دیہاتی اور اُن کے گیت

نیپال کی خوشگوار سرزمین گویا قدرت کی خوبصورتیوں کا پنگوڑا ہے جو ہمالیہ کی جنوبی ڈھلانوں پر واقع ہے۔ کسی دُور کے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو برف سے ڈھکی ہوئی اور آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹیوں کے نیچے اس کی ڈھلانیں ایک ایسے بزرگ کے چوڑے ماتھے کی مانند نظر آتی ہیں جس کے سر کے سفید بال اس کی بڑی عمر کا پتہ دے رہے ہوں اور کہیں کہیں ذرا نگاہ کو جما کر غور سے دیکھا جائے تو نیپال کے گاؤں سرسبز کھیتوں اور ہری بھری گھاٹیوں کے درمیان ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ایک کنواری لڑکی کی سبز اوڑھنی پر خاکی رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور گمان ہوتا ہے کہ شاید مہابھارت کے زمانے کے کسی نوجوان شاعر کا رنگین خواب دیہات کی شکل میں بدل گیا ہے۔ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے ہنس مکھ بچے جب کھیتوں کے درمیان اچھلتے کودتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ وہاں اُگنے والے پودوں کے خوب صورت پھولوں میں جان پڑ گئی ہے۔ بہت سی جگہ پہاڑیوں پر سے گرنے والے پانی کی آواز اور چھوٹی بچیوں کے گیتوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ وہاں کے لوگ روپے پیسے کے لحاظ سے تقریباً برابر ہیں اس لئے امیر و غریب کا سوال باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان پیار اور محبت بہت زیادہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا ہی رشتہ دار سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کو سوچ لینے کے بعد ان کے گیتوں کو پڑھا یا سنا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کا ہر بول ایک سچی آواز ہے جو واقعی اُن کے دل سے نکلتی ہے۔ دن بھر کھیتی باڑی یا دوسری قسم کے کاموں سے جب وہ تھک جاتے ہیں تو سورج چھپنے کے بعد اپنے ہی بنائے ہوئے گیتوں سے اپنا دل خوش کرتے ہیں تاکہ دوسرے روز تازہ جوش کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کی ان میں طاقت پیدا ہو جائے۔ سب لوگ ہندو دھرم کو مانتے ہیں اور بڑے سچے دل سے پوجا پاٹ میں حصہ لیتے ہیں اس لئے ان کے گیتوں میں دیویوں اور دیوتاؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اچھے پریت کے گیت ہیں جن کو گا گا کر وہ کنواری لڑکیاں اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہیں جنہیں کچھ پریم کرنا آ گیا ہے

ملک کی آب و ہوا کا بھی گیتوں سے بہت تعلق ہوتا ہے اس لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نیپال میں ہر قسم کی آب و ہوا اور سال کے تمام موسم اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ برسات کا موسم بہت خوب ہوتا ہے۔ اس موقعے پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی سنگت میں ان کے گیت اور زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک ہندو راجہ اُن پر حکومت کرتا ہے۔ مگر ہمیشہ سے راجہ اور پرجا کا میل جول آپس میں باپ بیٹوں کا سا ہے اس لئے تمام لوگ بڑی خوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سال میں بے شمار میلے اور تہوار منائے جاتے ہیں جو یاترا کہلاتے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت مشہور ہیں۔ مثلاً بھیراب یاترا، رتھ یاترا، اندرا یاترا، مچھندرا یاترا اور راتھ یاترا وغیرہ ان موقعوں پر بدھ مت کی روایات اور عقیدوں کو گیتوں اور ناچوں کی شکل میں سنایا اور دکھایا جاتا ہے اور بہت خوشی منائی جاتی ہے۔ سوائے نیپالی بولی کے کوئی دوسری زبان نہیں بولی جاتی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود اس قدر مختلف ہے کہ دوسری جگہ کے لوگ اسے مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ خود نیپال ہی میں بعض دیہاتوں کی بول چال میں فرق ہے لیکن اتنا نہیں کہ وہاں کے لوگ بھی اسے نہ سمجھ سکیں۔ بڑے تہواروں کے موقعوں پر مرد و عورت بچے بوڑھے دور دور سے آ کر ایسی جگہوں پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں دو ندیوں کا سنگم ہے۔ وہ کوشش کر کے ایک دوسرے کے ناچ کی نقل اتارتے ہیں اور گیت یاد کر لیتے ہیں تاکہ اپنے اپنے گاؤں میں جا کر اُن سے دوبارہ لطف حاصل کر سکیں۔ ان کے ناچنے کی جگہ کو "روری گھر" کہتے ہیں جو چودھری کے مکان کے قریب چوپال کی طرح

ہر شخص کے لئے عام ہوتا ہے۔

ایک خاص قسم کا ناچ جسے سورتی کہتے ہیں فصل تیار ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔ اس میں رسم و رواج کے مطابق صرف نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں اور ضرورت ہو تو اپنے لئے خود ہی بر تلاش کر لیں۔ پریم کے وہ دلچسپ گیت اور ناچ انکی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیتے ہیں۔ یہ گیت عموماً ملکلے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکے بڑے جوش کے ساتھ اپنا پریم ظاہر کرتے ہیں اور لڑکیاں کسی قدر شرما کر لیکن دل لبھانے والے انداز سے ناچتی ہیں اور اس پریم کا جواب پریم کے الفاظ میں گا کر دیتی ہیں۔ بعض دفعہ بڑے زور کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اگر مرد پریم ظاہر کرتے ہوئے اپنے گانے سے عورت کو ہرا دے تو اس کے ساتھ شادی کرنے کا اسے حق حاصل ہو جاتا ہے اور عورت انکار نہیں کر سکتی لیکن اگر وہ خود ہار جائے تو پھر عورت کی مرضی ہے خواہ وہ اس کے ساتھ رشتہ پسند کرے یا نہ کرے۔ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کا انجام بُرا رہتا ہے۔

ان کے گیتوں میں ان کے پیشوں کا حال بھی اپنی جھلک دکھا دیتا ہے۔ مثلاً کھیتی باڑی کرنے والے فصل وغیرہ کاٹ کر یا گڈریے اپنی گائے بھینس اور بھیڑ بکری کا کسی نہ کسی طرح ذکر کر دیتے ہیں۔ وہ نوجوان لڑکیاں جن کی جان کو پریم کا دکھ گھلا رہا ہو۔ ایسے ناچ گانے میں حصہ نہیں لیتیں اور اگر آئیں تو اپنے دل کے درد بھرے راگ سے سب کو رُلا جاتی ہیں۔

گیتوں کے ساتھ ساتھ جو ناچ ہوتا ہے۔ اسے وہ اپنی زبان میں "لاکھا" کہتے ہیں جو ہندوستان کے عام دیہاتی ناچوں سے ملتا جلتا ہے۔ بعض غریب دیہاتی گانے بجانے سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کبھی اس گاؤں میں اور کبھی اُس گاؤں میں ان کا دورہ رہتا ہے۔ ایک جگہ چند دن قیام کیا اور پھر دوسری جگہ کی راہ لی۔ اگر وہ تنہا ہوں تو عموماً اور دو بھرے راگ گاتے ہیں۔ ایسے گانے والوں کو "آئینے" کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ٹولیاں بنا بنا کر نکلتے ہیں۔ عورتیں ناچتی ہیں اور مرد گاتے بجاتے ہیں۔ یہ مذہبی روایات تاریخی واقعات یا فرضی قصوں کی نقل اتارتے ہیں۔ ایسے مردوں کو "بھاٹ" اور عورتوں کو "جُھان رینی" کہتے ہیں۔

ان دیہاتی گیتوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جو موضوع، وقت اور جگہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان میں سے چودہ قسم کے گیت خاص طور پر مشہور ہیں۔

نمبر ۱۔ جھیاؤ رے گیت۔ یہ زیادہ لمبے نہیں ہوتے۔ بلکہ رباعی کی طرح صرف چار مصرعے ہوتے ہیں۔ محبت سے متعلق ہر قسم کا خیال اسی کے لئے مخصوص ہے۔

نمبر ۲۔ سوائی گیت۔ ان میں مشہور کہانیاں ہوتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہندوستان میں بھی بہت سے قصے نظم میں ہیں۔ ان کا موضوع کوئی خاص نہیں ہوتا۔

نمبر ۳۔ مالسیری گیت۔ یہ درگا پوجا کے تہوار پر گائے جاتے ہیں ماتا درگا نے برائیوں کے دیوتاؤں پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا ذکر ان گیتوں میں ہوتا ہے۔

نمبر ۴۔ بھائیلو گیت۔ یہ فقیروں کی دردناک صدائیں ہیں جو بھیک مانگتے وقت لوگوں کے دروازوں پر لگائی جاتی ہیں۔

نمبر ۵ جُباری گیت۔ یہ بھی جھیاؤ رے گیتوں کی طرح مختصر رباعیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ میلوں اور تہواروں کے موقعوں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہیں گاتے ہیں اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اُن کے ذریعہ ایک دوسرے پر پریم جتایا جاتا ہے۔

نمبر ۶۔ سنگینی گیت۔ ایک خاص تہوار کے موقعے پر جس کا نام "نز" ہے بہت ساری عورتیں مل کر گاتی ہیں۔ ان کا جمگھٹ کسی مندر میں یا پیپل کے درخت کے نیچے ہوتا ہے۔ باری باری ہر ایک عورت بیچ میں اور باقی گھیرا بنا کر کھڑی ہوتی ہیں۔ پہلے بیچ والی گھونگھٹ نکال کر گاتی اور ناچتی ہے۔ اور پھر باقی عورتیں مل کر اسے دوہراتی ہیں۔ ان گیتوں میں گھریلو زندگی کا حال ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو کوئی عورت اس موقعہ پر ناچ گانے میں حصہ نہ لے۔ وہ آئندہ جنم میں لنگڑی پیدا ہوتی۔

نمبر ۷۔ راسیہ گیت۔ اس کی تانیں لمبی اور تیز ہوتی ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلانے بیج بونے یا چاولوں کے پودوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لگاتے وقت یہ گیت گائے جاتے ہیں جن میں اچھی فصل ہونے کی امید باندھی جاتی ہے۔

نمبر ۸۔ بالن گیت۔ ان میں ہندو دھرم کی مشہور روایات رامائن اور مہابھارت کے بعض بعض حصوں کا حال ہوتا ہے اسے صرف مرد گاتے ہیں اور چند مذہبی تہواروں کے لئے مخصوص ہیں۔

نمبر ۹ راتیلی گیت۔ جب دلمن اپنے گھر سے رخصت ہو کر دولہا

کے گھر جانے لگتی ہے تو اس کی سہیلیاں بڑے جوش و خروش سے یہ گیت گاتی ہیں اور بہت خوشی مناتی ہیں۔

نمبر ۱۰ یعنی بھلوٗنی گیت۔ یہ بچوں کو سلانے کی لوریاں اور پنگورے میں جھلاتے وقت کے گیت ہیں۔

نمبر ۱۱ بارہ ماسی گیت۔ ان میں وہ عورتیں اپنے دکھے ہوئے دل کا حال سناتی ہیں جو پریتم سے دور جدائی کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ بہت دردناک ہوتے ہیں۔ اور گانے کی لَے بھی دل ہلا دینے والی ہوتی ہے۔ ان میں موسم کی خوشگوار کیفیات پہاڑوں کے دلچسپ مناظر اور پرندوں کے خوش کر دینے والے چہچہوں کا ذکر کر دینے کے بعد اپنی بے بسی کی حالت بیان کی جاتی ہے کہ ایسے وقت جبکہ سب لوگ خوشی منا رہے ہیں پریم کی ماری جنہ ہستیاں آنسو بھی بہا رہی ہیں۔

نمبر ۱۲ آساڑھی گیت۔ آساڑھ کے مہینے میں جب گرمی بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ مختصر ہوتے ہیں اور گاتے وقت بھی لمبی تان نہیں لی جاتی کیونکہ ان میں یہی ذکر ہوتا ہے کہ گرمی کے مارے دلچسپ کاموں تک میں دل نہیں لگتا۔

نمبر ۱۳ ساوٗنے گیت۔ یعنی ساون کے مہینے کے گیت۔ برسات کے موسم میں تھوڑے عرصے کی بیاہی ہوئی لڑکیاں ضرور اپنے اپنے میکے چلی جاتی ہیں تاکہ پوری آزادی کے ساتھ موسم کی بہار سے لطف حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ گیت صرف عورتیں ہی گاتی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول ان عورتوں کے لئے جو خوش قسمتی سے اپنے میکے پہنچ چکی ہیں اور خوشی منا رہی ہیں۔ دوسری ان عورتوں کے لئے جن کو ساتھ لے جانے کے لئے ابھی میکے سے کوئی نہیں آیا اور وہ صرف انتظار کرتے ہوئے ان مسرتوں کا تصور کر رہی ہیں۔

نمبر ۱۴ چائیتے گیت۔ یہ موسم بہار کے نغمے ہیں جو مارچ سے اپریل تک کے دنوں میں گائے جاتے ہیں۔ یہ کسی کے لئے مخصوص نہیں۔ عورت مرد بچے بوڑھے سب انہیں گاتے ہیں۔

گیتوں کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اصلی زبان میں اسی ملک کے لوگوں کے منہ سے سنا جائے۔ اگر مطلب سمجھ میں نہ آئے تو نہ سہی۔ کم از کم ترنم سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت میں چند گیتوں کو اپنے الفاظ میں پیش کر دوں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان میں کس قسم کے جذبات ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو نظم سے بالکل بے بہرہ اور جاہل ہیں۔ دل کی باتوں کو الفاظ میں کس طرح بیان کرتے ہیں۔ ایک گیت سنئے کسان اپنی تیار فصل دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا:۔

کتنے خوبصورت ہیں چنبین والے میرے بیل۔
اور دیکھو میرے ہل ان سے بھی زیادہ خوب صورت ہیں۔
کتنے خوشنما ہیں میرے ہرے بھرے کھیت۔
اور دیکھو میری فصلیں ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔

ایک اور گیت میں کسان دھرتی ماتا کے ساتھ جو اسے سہارے ہوئے ہے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے:۔

یہ دھرتی میرے لئے باپ ہے اور ماں بھی۔
جسم میں قوت پیدا کرنے والی خوراک ہم اس کے اندر سے حاصل کرتے ہیں
برکت ہو تجھ پر۔ برکت ہو دھرتی ماتا پیاری۔
میرا سارا پریم اور دھرم خاک کے ذروں کے لئے ہے۔

ایک کسان جس کی فصلیں پڑوسیوں کی طرح اچھی نہیں ہوئی ہیں۔ اپنے دل کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:۔

میں نے ہل چلانے میں ساری عمر بسر کر دی۔
آہ! خوشی کا دن مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔
بہت بوڑھا اور بہت کمزور ہو گیا ہے میرا جسم اور میرا دل
خوشی کا چہرہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھے دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

ایک گیت سنئے جس میں پہاڑوں اور ندیوں کا ذکر ہے:۔

کب — ارے کب جمع ہو گی برف؟
دور، بہت دور ہمالیہ کی چوٹیوں پر۔
کہاں۔ ارے کہاں جا کر دم لے گی؟
بل کھا کر بہنے والی تیز ندی۔

اب ایک ایسی ماں کا گیت سنئے جس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے:۔

ترائی کے علاقے میں پیپل کے درخت مرجھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
سورج کی جھلسا دینے والی گرمی کی وجہ سے۔
آہ! کس کام کا ہے میرا حسن میرے لئے
میری کوئی بیٹی ہے اور نہ کوئی بیٹا۔
ذرا آنکھوں کی تشبیہ سن کر ذوقِ نظر کی بھی داد دیجئے۔
لدا ہوا ہے پھلوں اور پھولوں سے تیری جوانی کا پودا۔

اور پیاری تیری آنکھیں گویا تریب قریب رکھے ہوئے دو کریلے ہیں۔
یا پھر وہ ملتی جلتی ہیں دو پاس پاس بیٹھے ہوئے جگنوؤں سے۔
جن کی روشنی دکھائی دیتی اور غائب ہوتی ہے پلک جھپکنے کیساتھ
ایک غم نصیب کے دکھے ہوئے دل کی آہ بھی سن لیجئے:۔
نو لاکھ ستارے اوپر آسمان میں جڑے ہوئے ہیں۔
ناممکن ہے ناممکن ہے میرے لئے ان کو شمار کرنا۔
میرے لبوں تک دکھے ہوئے دل کے الفاظ آکر رہ جاتے ہیں۔
ناممکن ہے ناممکن ہے میرے لئے ان کو بیان کرنا۔
کتنی خوشنما ہے برف سے ڈھکی ہوئی ہمالیہ کی چوٹی
جیسے کوئی سانپ کینچلی اتار کر پھینک گیا ہو۔
راہ چلنے والے مت سنا اپنی بانسری کے درد بھرے راگ۔
میرے جگر میں اُف! میرے جگر میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔
ایک دولہا کا گیت سنئے جس نے پہلی رات اپنی دلھن کا چہرہ دیکھا ہے:۔
کتنا خوشنما معلوم ہوتا ہے نیپال چاندنی راتوں میں۔
گویا وہ تمام دنیا کے اوپر خود ایک آسمان ہے۔
لیکن کہیں زیادہ خوبصورت ہے میری پیاری دلھن کا چہرہ۔
گویا وہ ایک چمکتا ہوا چاند ہے میرے لئے میرے دل کی دنیا کا
سسرال جانے کے لئے ایک نوجوان لڑکی کھیت کے قریب بہنے والی ندی کے کنارے اشنان کرنے بیٹھی ہے۔ وہ مانگ میں بھرنے والا سیندور گھر میں بھول آئی ہے۔ اس کا گیت سنئے:۔
یہاں بہتی ہو دیکھو یہاں بہتی ہے۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی۔
اپنے بال ہاں اپنے بال میں صاف کر رہی ہوں۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی میں۔
میرے بال ہاں میرے بال دھل کر سلجھ گئے۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی میں۔
ایک چٹان پر اپنے بال دھوپ میں سکھانے بیٹھی ہوں۔
قریب پیارے نیپال کی سنہری ندی کے۔
افسوس۔ آہ۔ افسوس! میں گھر بھول آئی
سر کی مانگ میں رنگ بھرنے والا سیندور

رنجیدہ۔ اُف رنجیدہ میرا دل ہو گیا۔
اپنے دولھا کے گھر میں کس طرح واپس جاؤں۔
میری ظالم ساس مجھے دیکھ کر بولے گی۔
آ گئی ایک بے پروا نالائق لڑکی میکے سے
ایک لڑکی اپنی ساس کے ظلم و ستم سے گھبرا کر چڑیا سے التجا کرتی ہے کہ میرے دکھ درد کی خبر میرے ماں باپ کو پہنچا دے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اور بھائی بہن کو ہرگز معلوم نہ ہو کہ ان کی بیاہی ہوئی بہن ساس کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ سنئے۔
کتنا بھلا ہے تیرا گیت اے سنہری چڑیا۔
تیرا اڑنا کس قدر پیارا ہے اے سنہری چڑیا۔
اڑ جا۔ ہاں اڑ جا میری ماں کے گاؤں تک۔
اور میرے دل کی باتیں جا سنا اے سنہری چڑیا۔
اگر میری ماں سوال کرے تو اس سے کہہ دیجو۔
اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آ کر تیری بیٹی مر رہی ہے۔
میرے بھائی سے کہیو تیری بہن مزے میں ہے۔
اگر وہ تجھ سے پوچھے۔ اے سنہری چڑیا۔
اگر میرا باپ سوال کرے تو اس سے کہہ دیجو۔
اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آ کر تیری بیٹی مر رہی ہے۔
میری بہن سے کہیو تیری بہن مزے میں ہے۔
اگر وہ تجھ سے پوچھے۔ اے سنہری چڑیا۔
کتنا بھلا ہے تیرا گیت۔ اے سنہری چڑیا۔
تیرا اڑنا کس قدر پیارا ہے۔ اے سنہری چڑیا
نیپالی لڑکیاں کبوتروں کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ ماں کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ایک لڑکی اپنے باپ سے کبوتر کا ایک جوڑا مانگتی ہے باپ بیٹی کی گفتگو سنئے:۔
باپ! نو جوڑے کبوتروں کے تیری چھت پر بیٹھے ہیں۔
مجھے دے دے۔ مجھے دے دے ان میں سے ایک جوڑا کبوتروں کا
ایک گائے۔ ایک گائے تجھے دے دوں گا میری بیٹی!
مجھے افسوس ہے کہ میں جدا نہیں کر سکتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
باپ! میں تیری دی ہوئی گائے کا کیا کروں گی۔
آہ! کتنی بدقسمت ہوں کہ مجھے نہیں ملتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔

ایک ہاتھی۔ ایک ہاتھی۔ تجھے دے دوں گا۔ میری بیٹی!
مجھے افسوس ہے کہ میں جدا نہیں کر سکتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
باپ! میں تیرے دئے ہوئے ہاتھی کا کیا کروں گی۔
آہ! کتنی بدقسمت ہوں کہ مجھے نہیں ملتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
رومت رومت پیاری بیٹی رومت۔
ابھی ابھی میں تجھے دے دوں گا۔ ایک جوڑا کبوتروں کا۔
خوش رہ باپ۔ میں گھر بلو کام سسرال میں اچھی طرح کر سکوں گی۔
جب اپنے گھر کا پلا ہوا دیکھوں گی ایک جوڑا کبوتروں کا۔

ایک عورت اپنے خاوند کے ہاتھوں کتنی ہی دکھی ہو ہندو دھرم کے مطابق وہ کسی طرح بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اس کی زندگی گویا ہمیشہ کے لئے غلامی ہے۔ ایک درد بھرا راگ سنئے:۔

"اس اجنبی سرزمین پر سوت مجھے اپنی گود میں اٹھائے گی۔
اور افسوس میرے لئے کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔
کچھ نہیں سوائے ماری ہوئی قسمت کے ایک عورت کی زندگی ہے۔
افسوس اس کی شادی اس کے لئے پوری غلامی ہے۔

نیپالی بڑے بہادر اور لڑائی کے وقت میدان میں کام آنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہندوستانی فوج میں بھی بہت سی گورکھا پلٹنیں ہیں۔ ایک عورت جس کا خاوند ملازمت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ فراق میں آنسو بہا رہی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

"افسوس ایک سپاہی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔
عموماً موت کا چہرہ بھی اسے لڑائی کے میدان ہی میں دیکھنا پڑتا ہے"۔

اس کی نند یہ بات سن کر اسے تسلی دیتی ہے اور سنگھار کرنے کے لئے کہتی ہے۔ سنئے:۔

"سنوارے۔ ہاں سنوارے اپنے بالوں کو میرے بھائی کی دلہن۔
میرا بڑا بھائی بہت جلد پیارے نیپال میں آنے والا ہے"۔

وہ لڑکی اپنی نند کو جواب دیتی ہے:۔

"تیرا دل کس طرح دھڑک کر تجھے اس امر کا یقین دلا رہا ہے۔
وہ تو پیارے نیپال سے بہت دور لڑائی کے میدان میں گیا ہے"۔

اب اتفاق دیکھئے کہ وہ سپاہی واپس آتا ہے اور گھر کے قریب پہنچ کر شکار کھیلنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ عورت اس کو دیکھ کر پہچانتی نہیں اور کتنی عجیب گفتگو ہوتی ہے۔

"تو کون ہے؟ ہاں مجھ کو بتا تو کون ہے!
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے!
کس نے دی ہے تجھے پیاری جوانی یہ بالا جوبن!
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے"۔

"میں ہوں بہادر باپ کا بہادر بیٹا!
سن اے عورت! میں ہوں شیروں کا شکاری۔
پرماتما کی کرپا ہے یہ پیاری جوانی یہ بالا جوبن
یہ بڑی کرپا ہے۔ شیروں کے شکاری پر"۔

"تو نے شیر کو گولی سے مار دیا۔ ایک ہی وار میں۔
بہادری چمک رہی ہے شیروں کے شکاری کے چہرے پر۔
تو کون ہے۔ ہاں مجھ کو بتا۔ تو کون ہے!
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے!"

اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اور خوشی خوشی گھر آجاتے ہیں۔ آخر میں فقیروں کی ایک صدا بھی سن لیجئے جسے وہ ہر دروازے کے سامنے ہو کر لگاتے ہیں۔

اس گھر کی مالکہ جب پتھر کے ٹکڑوں کو چھوئے۔
تو پرماتما کی کرپا سے وہ بدل جائیں جواہرات میں۔
زمین جس پر وہ قدم رکھ کر چلے۔
پرماتما کی کرپا سے اناج میں بدل جائے۔
پتے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے صاف کرے۔
پرماتما کی کرپا سے ریشم کے کپڑے میں بدل جائیں۔
پانی جس کو وہ اپنی انگلیوں سے چھوئے
پرماتما کی کرپا سے تیل میں بدل سے۔
لکشمی ہمیشہ اس گھر میں آباد رہے۔
سب چھوٹے بڑے کیلے کی طرح پھلیں پھولیں۔
اس گھر کے لوگ ہری گھاس کی طرح تر و تازہ رہیں۔
ان کی عورتیں بڑ اور پیپل کے درختوں کی سی ہوں۔
ان کا گھر اچھے اچھے کپڑوں سے بھر جائے۔
بھوٹ کا نک اور لاسا کا سونا انہیں بہت زیادہ ملے۔
گھر کی تمام بیماریوں کو پونر گنگا دھو کر صاف کر دے۔
اور تمام تکلیفیں اڑ جائیں ہمالیہ کی چوٹیوں سے آنے والے جھونکوں کے ساتھ
یہ ہے ایک بھکشو کی دعا اپنے پرماتما سے۔

ان کے علاوہ اور [illegible] ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے جذبات کتنے پیارے [illegible] ہیں اور وہ ان گیتوں میں زندگی کی کتنی سچی تصویر کھینچتے ہیں۔ رہا خ[illegible]

فضل حق قریشی دہلوی

نواہائے راز

شرم کی بات نہیں کچھ تمہیں اپنی ہی قسم
کیا کہا پھر تو کہو اہلِ وفا تم ہو کہ ہم

آنکھ تو چار کرو میری طرف تو دیکھو
میں بھی کچھ عرض کروں تم تو نہ ہوگے برہم

آج چھیڑا ہے اگر مجھ کو تو انصاف ہے شرط
ورنہ جو چاہے وہ کہہ لو سرِ تسلیم ہے خم

بے زباں مجھ کو نہ سمجھو فقط اتنا ہے خیال
تم خجل ہوگے کروں گا میں اگر ذکرِ ستم

کچھ زباں سے نہ کہا تم نے مرے منہ پہ مگر
تم مبادا ہوئے مغموم تو ہوگا کسے غم

مسکراتے ہوئے اُس آفتِ جاں نے یہ کہا
جو ترے دل میں ہو کہہ تجھ کو مرے سر کی قسم

عرض کی میں نے کہ "غیروں پہ نہیں چشمِ کرم"
ہنس کے فرمایا "یہ سچ ہے تو وفادار ہیں ہم"

عرض کی میں نے کبھی چشمِ کرم مجھ پہ نہ کی
ہنس کے فرمایا کہ "ناداں ہے یہی عینِ کرم"

عرض کی میں نے "یہ کیا کیا نہ ستم مجھ پہ ہوئے"
ہنس کے فرمایا کہ عاشق ہے تو کر شکرِ ستم"

عرض کی میں نے "میں کس منہ سے کروں شکرِ جفا"
بولے "جس منہ سے کہ کہتا ہے مجھے ظلم شیم"

عرض کی "ہوگا مرا عقدۂ دل وا کب تک"
بولے "جس وقت کہ زلفوں سے مری دور ہو خم"

عرض کی میں نے "غمِ عشق ستاتا ہے بہت"
ہنس کے فرمایا کہ "دے کاش خدا سب کو یہ غم"

عرض کی میں نے "خطِ شوق کا لکھا نہ جواب"
بولے "کر شکر کہ تیرے نہ کٹے ہاتھ قلم"

عرض کی میں نے "پیوں خونِ جگر میں کب تک"
ہنس کے فرمایا "یہ جب تک کہ ترے دم میں ہے دم"

عرض کی "ہجر میں روتے ہوئے اک عمر ہوئی"
ہنس کے فرمایا "کہ اے وائے بہ حالِ شبنم"

قید ہستی سے جو چھٹنے کا کیا میں نے سوال
بولے "کچھ دن ابھی رہ اور گرفتارِ الم"

عرض کی میں نے کہ "ہے حسرتِ پابوس بہت"
بولے "پھر خاک میں ملئے صفتِ نقشِ قدم"

عرض کی "رحم کی امید پہ کب تک میں جیوں"
بولے "اس کے لئے کہہ سکتے نہیں کچھ ابھی ہم"

عرض کی "بس ہے مجھے ایک محبت کی نگاہ"
بولے "کس کس پہ کریں ہم نگہِ لطف و کرم"

عرض کی "میں نے تو کیا رحم نہ کھاؤ گے کبھی"
ہنس کے فرمایا "کہ ہاں اس کی تو امید ہے کم"

عرض کی میں نے کہ "ہے بارِ گراں تن پہ یہ سر"
ہنس کے فرمانے لگے "تجھ کو مرے سر کی قسم"

عرض کی "حسن کے جلوے مرے دل میں دیکھو"
بولے "کیا خوب ترے دل کے بھی محتاج ہیں ہم"

عرض کی میں نے یہ سب ہے مری تقدیر کا پھیر
ہنس کے فرمایا "کہ پھر کر گلہ بختِ ستم"

"حسنِ سیراب تو ہے مرغوب مجھے" میں نے کہا
ہنس کے فرمایا "کہ ناداں یہ ترے حق میں ہے سم"

عرض کی "اب تو جگر میں نہیں اک بوند لہو"
ہنس کے فرمایا "کہ کر اور خطِ شوق رقم"

ڈبڈبا آئے مری آنکھوں میں آنسو تو کہا
تجھ پہ ہنستا ہے انہیں باتوں سے سارا عالم

عرض کی میں نے "شبِ ہجر ہے بس یا میں ہوں"
بولے "کر شکر ہے کوئی تو شریکِ غم و ہم"

پوچھا "دکھلاؤ گے اعجازِ مسیحائی کب"
ہنس کے فرمایا "جب آئے گا لبوں پر ترا دم"

عرض کی میں نے "دمِ نزع تو آؤ گے ضرور"
ہنس کے فرمایا کہ "ہاں شاہِ ولایت کی قسم"

صدق جائسی

(جملہ حقوق محفوظ)

جاپان میں جشن نوروز

اہل جاپان طبعاً میلے تہوار کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے قومی تہوار کچھ کم نہیں جن میں تمام قوم خوشی مناتی ہے۔ مقامی میلے بھی بہت سے ہیں۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا جس میں کوئی نہ کوئی میلہ یا تہوار نہ ہوتا ہو۔ محلے وار میلے تو اس قدر ہیں کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ جاپانی بارہ مہینے خوشی مناتے ہیں۔ پھر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ دیگر اقوام کا کوئی تہوار انہیں پسند آ جائے تو اختیار کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً بڑے دن کا تہوار ایسی دھوم سے مناتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے تمام جاپان عیسائی ہوگیا۔ مگر اس میں عقیدت کو کوئی دخل نہیں۔ بڑے دن میں تہواریت بہت ہے۔ اس وجہ سے انہیں پسند آگیا ہے۔ پھر یہ ماہ دسمبر میں آپڑا ہے جس میں جشن نوروز کی تیاری کے لئے اتنی خرید و فروخت ہوتی ہے کہ سال بھر کی آدھی بکری اسی مہینے میں ہو جاتی ہے۔ ڈیپارٹمنٹ اسٹور اور بڑی بڑی دکانیں بڑے دن کے نام سے قیمتوں میں تخفیف کر دیتی ہیں یا خریداروں کو کچھ انعام دیتی ہیں۔ ہر جگہ سینٹا کلاس نظر آتا ہے۔ بچوں کو کھلونے ملتے ہیں۔ بڑے دن کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ ریسٹورانٹوں اور ہوٹلوں میں خوب ڈنر کھائے جاتے ہیں۔ ناچ گھروں اور شراب خانوں میں رونق ہوتی ہے غرضیکہ عیسائی ممالک کی تقلید کرنے میں جاپانی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

جاپانیوں کا سب سے بڑا تہوار جشن نوروز ہے جو یکم جنوری کو منایا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں قمری حساب سے سال کا شمار ہوتا تھا اور نوروز کا تہوار ماہ فروری میں پڑتا تھا۔ اوائل عہد میجی میں جاپان نے شمسی سال اختیار کیا۔ اس وقت سے یکم جنوری کو نوروز منایا جانے لگا۔ دیہات میں اب بھی یکم جنوری سے زیادہ رونق دار تہوار فروری میں منایا جاتا ہے۔ توکیو میں اور دوسرے بڑے شہروں میں جشن نوروز کی تیاری ایک مہینہ پہلے سے ہوتی ہے بلکہ آخر نومبر سے ہی بازاروں کی چہل پہل بڑھ جاتی ہے۔ خریداروں کے استقبال کے لئے دکانیں خوب سجائی جاتی ہیں۔ اسٹوروں میں ملازمین کی تعداد بڑھا دی جاتی ہے۔ دکانیں دیر تک کھلی رہتی ہیں۔ وسط دسمبر سے بازاروں کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے کیونکہ سرکاری دفاتر، کمپنیوں، کارخانوں اور دکانوں کے ملازمین کو سالانہ یا شہنشاہی انعام ملتا ہے۔ یہ ۱۵ دسمبر سے ۷، ۸ دسمبر تک تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ایک یا دو مہینے کی سالم تنخواہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض جگہ اس سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں لنکر ریلوے نے اپنے دو لاکھ ملازمین میں جو انعام تقسیم کیا تھا۔ اس کی مقدار سوا کروڑ ین تھی۔ آخر دسمبر کی بکری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ توکیو کے ڈیپارٹمنٹ اسٹوروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جس میں روزانہ پچاس ہزار گاہکوں سے کم آتے ہوں۔ بعض میں ایک لاکھ روزانہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عورتوں کے لئے دسمبر کا مہینہ نہایت مصروفیت کا ہوتا ہے۔ تمام خرید و فروخت خود کرتی ہیں۔ گھر والوں کے لئے کپڑے خریدتی ہیں اور سیتی ہیں۔ خانہ داری کا سامان مثلاً برتن، برش، جھاڑو وغیرہ اسی مہینے میں خریدا جاتا ہے۔ گھر کا تمام سامان باہر نکال کر صفائی کی جاتی ہے جس میں مرد عورت بچے سب لگ جاتے ہیں۔ فرش کی تناموں کی بالائی چٹائیاں بدلوائی جاتی ہیں۔ شوجیاں دھو کر نئے کاغذ چڑھائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ گھر کو صاف کر کے چندن بنا دیتی ہیں۔ سلیقہ مند عورتیں نوروز کے لئے موچی بھی گھر میں بناتی ہیں۔ اس کو عید کی خستہ کچوریوں اور سیوئیوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پچیس تیس برس پہلے تک دہلی میں گھر گھر سوئیاں توڑی جاتی تھیں۔ اب یہ منظر کہیں نظر نہیں آتا۔ وہی حال موچی کا ہے۔ مگر یہاں یہ دستور ابھی فنا نہیں ہوا۔ بہت سے گھروں میں اب بھی بنتی ہے۔ اس کے لئے خاص قسم کے چاول استعمال ہوتے ہیں جن کو موچی گومے کہتے ہیں۔ چاولوں کو بڑی بڑی تپیلیوں میں ابال کر اوکھلی میں کوٹتے ہیں۔ جب بالکل آٹا ہو جاتا ہے تو اس کے پیڑے پیچکیاں بنا لیتے ہیں۔ نوروز کے دن موچی کو کوئلے پر سینک کر نوری لپیٹ کر خود کھاتے ہیں اور مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس کا مسالہ نوری اور شویو ہے۔ نوری بھری سبزی سے بنائی جاتی

ہے اور اس میں آیوڈین کا جزو بہت ہوتا ہے۔ شیو ایک قسم کا ساس یا سرکہ ہے جو ہر جاپانی کھانے میں پڑتا ہے۔ تین روز تک ہر کھانے پر موچی ضرور ہوتی ہے۔ اسے سکھا بھی لیتے ہیں اور بھینوں تل کر کھاتے ہیں۔

نوروز پر تحائف بھیجنے کا بڑا رواج ہے۔ تحفے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ آرائشی سامان کے ساتھ گھر کے کام کی چیزیں بہت ہوتی ہیں۔ بچوں کے کھلونے بڑوں کی استعمالی اشیا، کھانے پینے کی چیزیں، غرضکہ سب کچھ بھیجا جاتا ہے۔ شکر کے کعب اور انڈے تک بھیجے جاتے ہیں۔ قصائیوں کی دکانوں پر مچھلی، مرغابیاں اور ہر قسم کا مسکار، یہاں تک کہ چڑیاں تک ذبح کی ہوئی لٹکی رہتی ہیں۔ یہ بھی تحفوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ تحفہ بھیجنے کا طریقہ مقرر ہے۔ بکس میں بند کر کے کاغذ لپیٹا جاتا ہے اس پر موتی ڈوری باندھی جاتی ہے جو نصف سفید ہوتی ہے اور نصف سرخ۔ اس کی گرہ کا بڑا سا گول پھندا بنایا جاتا ہے اور ڈوری کے نیچے کاغذ کی نوشی اڑس دی جاتی ہے۔ اسے پھر اور کاغذ میں لپیٹا جاتا ہے۔ عام طور سے تحفہ جات ڈاک سے روانہ کئے جاتے ہیں۔ جن دکانوں سے تحفے خریدے جاتے ہیں وہ بھی اپنے خرچے پر گھروں میں پہنچا دیتی ہیں اور شہر کے شہر میں یہ طریقہ اکثر برتا جاتا ہے۔ قریب کے گھروں میں خود بھی لے جاتے ہیں۔ تمام تحفہ جات نوروز کے قبل پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ان کا انتخاب عورتوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے کیونکہ خانہ داری کی تمام مزید فروخت کی وہی ذمہ دار ہیں۔ مرد کسی کو خاص طور سے تحفہ دینا چاہیں تو خود بھی خرید لیتے ہیں۔

مردوں کے ذمے نوروز کی مبارک باد لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ بازار میں مطبوعہ کارڈ ملتے ہیں۔ جن پر کوئی نظم یا مختصر عبارت چھپی ہوتی ہے۔ سادگی کے ساتھ مذاق کی نفاست کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ کرسمس کارڈ یا عید کارڈ کی طرح مہنگے نہیں ہوتے بلکہ نہایت سستے۔ ایک سین میں ایک کارڈ مل جاتا ہے، اور اس پر ڈیڑھ سین کا ٹکٹ لگایا جاتا ہے۔ ایک ایک آدمی کے لئے سو کارڈ بھیج دینا بالکل معمولی بات ہے جو زیادہ بھیجنا چاہتے ہیں وہ کارڈ میں اپنا نام اور پتہ بھی چھپوا لیتے ہیں کہ لکھنے کی تکلیف سے نجات ہو۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ لکھنے میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر سے ڈاک میں ڈالنے شروع کر دیتے ہیں۔ ۳۱ دسمبر تک یہ کام ختم کر دیا جاتا ہے ڈاک خانہ تمام کارڈوں کو جمع کرتا رہتا ہے اور سب کی تقسیم نوروز کی صبح کو کرتا ہے۔ مبارک نامے بھیجنے کا شوق بہت بڑھا ہوا ہے اور ہر سال بڑھتا ہی نظر آتا ہے سنہ ۱۹۳۶ء کے نوروز پر جاپان کے ڈاک خانوں نے بڑا سی کروڑ کارڈ تقسیم کئے تھے۔ آبادی کے حساب سے ہر فرد کے حصے میں دس کارڈ آتے ہیں جس میں بچے بوڑھے عورتیں، شہری اور دیہاتی سب شامل ہیں۔ ایک مبارک نامے پر صرف ڈھائی سین خرچ ہوتے ہیں۔ تمام قوم کا حساب لگایا جائے تو صرف اسی مد میں دو کروڑ ین صرف ہو جاتے ہیں۔ اس سے کتنے کاغذ کے کارخانوں کے مزدوروں کے پیٹ پلتے ہوں گے اور کتنے کاغذ فروش روزی کماتے ہوں گے۔

مبارک ناموں کی تعداد سے آبادی کی خوشحالی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے نوروز پر اُن کی تعداد تینتیس کروڑ تھی جو سال ماسبق کے مقابلے میں دس فی صدی زیادہ تھی اور اندازہ تھا کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں تقریباً پچاس فی صدی اضافہ ہوگا۔ مگر نوروز پر مبارک نامے گھٹ ڈھائی گنے سے بھی بڑھ گئے یعنی دو سو پچپن فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۳۵ء میں اہل جاپان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور انہوں نے آپس میں مبارک باد دے کر خوشحالی کا ثبوت دیا۔

جشن نوروز کے لئے مکانوں اور دکانوں کی صفائی کے ساتھ آرائش کا خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ مکان، دکانیں، بازار سب سجائے جاتے ہیں۔ آرائش فروشوں کی دکانیں شروع دسمبر سے علے علے کھل جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ ۲۸ دسمبر سے آرائشیں سجائی جاتی تھیں مگر چند سال سے ۱۵ دسمبر سے سجاوٹ کا رواج ہو گیا ہے۔

گھر اور دکان کے باہر کادو۔ مانسو کی آرائش کی جاتی ہے۔ اس کے تین طریقے ہیں۔ اول صنوبر کا ایک ایک درخت پھاٹک کے باہر دائیں بائیں جانب جڑ سمیت رکھ دیا جاتا ہے۔ ہر صنوبر میں بانس کا پیڑ بھی باندھ دیتے ہیں۔ دویم ہرے بانس کی چھتنگ آڑی تراش دیتے ہیں اور بانس کی جڑ میں صنوبر کے چھوٹے چھوٹے پودے باندھ کر پھاٹک کے دونوں جانب رکھ دیتے ہیں۔ سویم بانس کی جڑ میں صنوبر کی ہری شاخیں باندھ کر پھاٹک کے دائیں بائیں رکھ دیتے ہیں اور اُن میں گچھے دار رسّی آرائش کے طور پر باندھ دیتے ہیں۔ صنوبر کے سالم پودے کثیر تعداد میں مہیا ہونے مشکل ہیں۔ اس لئے تیسرا طریقہ [illegible] سے رائج ہے۔

بانس اور صنوبر [illegible] بہار پودے ہیں اور دونوں بڑی عمر پاتے ہیں۔ عام طور سے [illegible] صنوبر ایک ہزار برس تک زندہ رہتا ہے اور بانس دس ہزار [illegible] ہزار برس رہتا ہے۔ نوروز پر ان پودوں کے استعمال سے یہ مراد [illegible] ہے کہ گھر والے عمر دراز ہوں اور خوشحال

رہیں۔

گھر کے اندر تو کونوں میں موچی کے پیڑے رکھے جاتے ہیں۔ تین ٹانگ کی چوبی چوکی پر اول بڑا پیڑا رکھتے ہیں پھر اس کے اوپر چھوٹا پیڑا۔ موچی کے اوپر اور چاروں طرف "او۔کزاری" سجائی جاتی ہے۔ اس میں کئی اشیا شامل ہیں۔ کڑوی نارنگی، خشک جھینگا، خشک کری، خشک کاکی، فرن، بحری سبزی وغیرہ۔ ہر چیز کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے۔ مثلاً کڑوی نارنگی کو "دائی دائی" کہتے ہیں اور اسی لفظ کے دوسرے معنی ہیں نسلاً بعد نسلٍ۔ خشک کری کو "کاچی کری" کہتے ہیں اور اس کے دوسرے معنی ہیں جنگ کرکے فتح حاصل کرنا۔ جھینگے کی کمر خمیدہ ہوتی ہے۔ اس سے مراد ہے کہ آدمی اتنا بڈھا ہو جائے کہ اس کی کمر جھینگے کی طرح خم ہو جائے۔ فرن سدا بہار پودا ہے، آدمی اس کی طرح ہمیشہ خوشحال رہے۔ دیگر اشیا سے خوشی، سخی میلاپن، رواداری وغیرہ مراد لی جاتی ہے۔

موچی کے ہمراہ جو آرائش لگائی جاتی ہے وہی گھر کے دیگر حصوں میں یعنی دروازے پر، عبادت گاہ پر، باورچی خانے میں، اور کوئیں پر سجائی جاتی ہے۔ وہاں اس سامان میں موچی نہیں ہوتی بلکہ تقریباً گز بھر لمبی گاؤدم رسّی ہوتی ہے جو لٹکا دی جاتی ہے اور ایک ڈوری الگنی کے طور پر باندھ دی جاتی ہے جس میں یہ اشیا لٹکا دی جاتی ہیں۔ ان کے ہمراہ سفید کاغذ کتر کر ڈوری میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈوری تاریخ جاپان کے ایک اہم واقعے کی یادگار ہے۔ تخلیق جزائر جاپان کے بعد جب سورج دیوی آسمان بالا پر حکمران ہوئی تو اس کا بھائی اس سے ملنے گیا۔ وہ نہایت شریر تھا۔ اس نے اپنی بہن کو اتنا تنگ کیا کہ وہ عاجز آکر ایک غار میں چھپ گئی۔ تمام عالم میں اندھیرا چھا گیا۔ اسی ہزار دیوتاؤں نے بہت جتن کئے مگر وہ باہر نہ نکلی۔ آخر ایک دیوی نے ناچنا شروع کیا۔ اس شادمانی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے سورج دیوی باہر آئی۔ دیوتاؤں نے فوراً غار کا منہ بند کر دیا اور اس پر ایک ڈوری تان دی کہ وہ دوبارہ اندر نہ جا سکے اور دنیا تاریکی سے محفوظ رہے۔ اس ڈوری کا آج بھی یہی منشا ہے کہ گھر تاریکی اور بلیات سے محفوظ رہے۔ کاغذ کی کترنیں اُن قیمتی کپڑوں کی یادگار ہیں جو پہلے دیوتاؤں کے آگے چڑھائے جاتے تھے۔ کاد و ماتسو، اور او۔کزاری، کے علاوہ "دائی کوکو" کی مورت بھی گھروں میں رکھی جاتی ہے۔ یہ خوشحالی کا دیوتا ہے۔ دسمبر میں اس کی مورت کے مٹی کے کھلونے بہت بکتے ہیں۔ یہ مورت عموماً باورچی خانے میں رکھی جاتی ہے۔ نوروز کی صبح کو ہر گھر کے دروازے پر نمک بھی ڈال دیا جاتا ہے کہ بلیات گھر میں داخل نہ ہو سکیں۔

توکیو والے نوروز کی آرائش پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اس سے کئی قسم کے پیشہ وروں کے پیٹ پلتے ہیں۔ مالی، بانس اور صنوبر مہیا کرتے ہیں، مچھیرے جھینگا اور بحری سبزی لاتے ہیں۔ میوہ فروش نارنگی، کاکی اور کڑوی فراہم کرتے ہیں۔ محض نارنگی کی اتنی بکری ہوتی ہے کہ دس بارہ دسمبر سے مال گاڑی کے ساتھ ڈبے روزانہ توکیو میں بک جاتے ہیں۔ دیہاتی کسان رسّیاں بٹ بٹ کر شہر میں بھیجتے ہیں۔ شہر والے گاؤں والوں سے صرف رسّیاں ہی نہیں خریدتے بلکہ بہت سی دیہاتی مصنوعات شہروں میں کھپتی ہیں۔ آج کل بہت سا مال کلوں سے بننے لگا ہے۔ پھر بھی دیہات سے بہت کچھ آتا ہے اور وہاں کی مصنوعات کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی جاتی ہے۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی چیز گاؤں کی بنی ہوئی مل جائے گی۔ یہاں کے کسان کھیتی باڑی کے علاوہ خالی وقت میں ریشم کی کاشت کرکے اور دیگر مصنوعات بنا کر اپنے گزارے کا سامان کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کسانوں کے لئے کھیتی باڑی کے علاوہ کوئی دریہ آمدنی کا نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بناتے بھی ہیں شہر والے ان کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔ اگر گاؤں والوں کی صناعی کی قدر کی جائے تو ابتدائی تعلیم کا مسئلہ کیسی آسانی سے طے ہو جائے اور ملکی مصنوعات کو فروغ حاصل ہو کر اقتصادی حالت کس قدر سدھر جائے۔

مدارس میں نوروز کی تعطیلات ۲۵ دسمبر سے شروع ہو جاتی ہیں اور تقریباً ۷ جنوری تک رہتی ہیں۔ ۲۵ دسمبر کو بڑے دن کی تعطیل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمی کا قومی تہوار ہے۔ اس روز دفاتر بھی بند رہتے ہیں۔ اس تہوار کی وجہ سے جاپان میں بڑا دن ۲۵ دسمبر کو نہیں منایا جا سکتا بلکہ ۲۴ دسمبر کو منایا جاتا ہے۔ دفاتر میں ۲۹ دسمبر سے ۳ جنوری تک تعطیل رہتی ہے۔ ۲۸ دسمبر کا دن بھی نیم تعطیل سمجھنا چاہئے کیونکہ اس روز سب لوگ دفتر جاتے تو ہیں مگر کام کچھ نہیں کرتے۔ صرف حاکم کو سلام کرکے

سلہ کزاری یعنی آرائش اور او، تعظیمی لفظ ہے یعنی آرائش شریف۔

چلے آتے ہیں۔ یہ سلام اُس انعام کا شکریہ ہے جو انہیں ۲۷ر دسمبر کو یا اس کے قبل مل چکا ہے۔

اختتام سال کے پہلے دوست احباب جلسے کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کے جلسے کرنے کا بڑا اچھا دستور ہے پہلے سے چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جلسے کا انتظام کسی رسٹورنٹ میں ہوتا ہے جہاں پارٹیوں کے لئے چھوٹے بڑے پرائیویٹ کمرے ہوتے ہیں۔ جلسوں میں کھانوں کا انتظام ضرور ہوتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو چائے اور فواکہات ضرور ہوں گے۔ دعوتی رقعے بہت پہلے سے بھیج دئے جاتے ہیں۔ جو لوگ شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کم از کم تین روز قبل شرکت کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ اس طرح شرکا کی تعداد معلوم ہوجاتی ہے اور اس کے مطابق کمرے اور کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے۔ دعوتی رقعے میں کھانے کی قیمت درج ہوتی ہے۔ رسٹورنٹ میں گنے کھانے کے دام دئے، اور جلسے میں شریک ہوگئے۔ نہ چندے کے لئے خوشامد کی ضرورت اور نہ اُدھار کے لئے تقاضے کی حاجت۔ یہ جلسے اس غرض سے منعقد کئے جاتے ہیں کہ سب مل کر سال کو الوداع کہیں اور سال بھر کے رنج والم کو بھلادیں۔ انہیں بونکائی کہتے ہیں۔ ہر شخص شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ کئی کئی جلسوں میں شریک ہوتا ہے جس کو کئی بونکائی میں شرکت کا موقع نہ ملا وہ بدقسمت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اپنی طرف سے بھی احباب کو دعوتوں میں مدعو کرتے ہیں بعض جلسوں میں شراب اور گیشاؤں کے ناچ گانے کا بڑے وسیع پیمانے پر انتظام ہوتا ہے اور دل کھول کر روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سال بھر کے رنج والام بھلانے کی بجائے اتنے بڑے جلسے کا بل ادا کرنے کی فکر گلے پڑ جاتی ہے اور مہمان صاحب نئے الم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پہلے اس قسم کے جلسے صرف سرکاری ملازمین کرتے تھے۔ اب عام پبلک بھی کرتی ہے جس میں دفاتر کے اہلکار، دکاندار، کارخانہ دار، مزدور اور طلبا سب شامل ہیں۔

جتنے رنج وغم سال بھر میں اٹھانے پڑتے ہیں وہ سب جنوں اور بھوتوں کی شرارت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بعض بدعہ مندران جنوں اور بھوتوں کو خارج کرنے کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ توکیو کے علاقۂ اساکسا میں جہاں رحم کی دیوی کی کاہت بڑا مندر ہے جنوں اور بھوتوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس میں سینما کی ایکٹریسیں جن اور بھوت بنتی ہیں۔ لوگ اس جلوس کو دیکھنے بڑے شوق سے جاتے ہیں اور مندر کو خاصی آمدنی ہوجاتی ہے۔

اختتام سال کے قبل ہر شخص اپنا حساب بیباق کر دیتا ہے کمپنیوں کے دفاتر میں یہ زمانہ نہایت مصروفیت کا ہوتا ہے۔ رات دن حسابات کی جانچ پڑتال ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال ۲۷ر دسمبر کے قبل جانچ کا کام ختم کرنا پڑتا ہے کہ ملازمین کو انعام دیا جاسکے اور تاریخ مقررہ پر تنخواہ دے دی جائے لوگوں کو اپنا قرضہ بے باق کرنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پرانا قرضہ چکانے کے لئے نیا قرضہ سخت شرائط پر لینا پڑتا ہے۔

نوروز پر خوشی منانی ایسا اہم کام ہے کہ اہل جاپان ہر گھر میں جشن کا انتظام کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ غریبوں کی امداد کے لئے کئی انجمنیں قایم ہیں۔ یہ چندہ فراہم کرتی ہیں۔ فوقانیہ مدارس کی لڑکیاں فراہمی چندہ میں بہت ہاتھ بٹاتی ہیں۔ چار چار پانچ پانچ لڑکیوں کی ٹولیاں چوراہوں پر کھڑی ہوجاتی ہیں اور ہر راہ گیر سے امداد کی درخواست کرتی ہیں۔ اس رقم سے موچی خریدی جاتی ہے اور غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو ٹانے سکی کے بلے اور چڑیاں تقسیم کی جاتی ہیں کہ نوروز پر کھیل سکیں۔ اسی طرح لڑکوں کو کنکوے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نوروز کی خیرات میں دھوبی تک شرکت کرتے ہیں۔ بعض نیک دل دھوبی پہلے سے اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم قومی جھنڈے مفت دھوئیں گے جو لوگ مقدرت رکھتے ہیں ان کی غیرت ہرگز تقاضا نہیں کرتی کہ اس اعلان سے ناجائز فایدہ اٹھائیں۔ غریبوں کو اپنے جھنڈے مفت دھلوانے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ جھنڈے نوروز پر ہر گھر کے دروازے پر لہراتے ہیں۔

نوروز کا اعلان ۳۱ر دسمبر کی شب کو بارہ بجے کیا جاتا ہے۔ مندروں اور درگاہوں میں کانسی کی بڑی بڑی گھنٹیاں آویزاں ہوتی ہیں۔ بارہ بجتے ہی یہ گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ایک گھنٹی ایک سو آٹھ مرتبہ بجائی جاتی ہے تاکہ ایک سو آٹھ بلیات دور ہو جائیں۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی لوگ اپنے گھروں سے عبادت کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ رات کو زیارت کرنے والے کم ہوتے ہیں عموماً صبح کو جاتے ہیں۔ بال بچوں کو ساتھ لئے ہوئے سب نئے کپڑے پہن کر مندروں یا درگاہوں میں پہنچتے ہیں۔ شاہ بھی کی درگاہ پر سب سے زیادہ اژدہام ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے نوروز پر تین [illegible] اندازاً پندرہ لاکھ آدمیوں نے اس درگاہ میں عبادت کی تھی۔ نوروز [illegible] سے ہر شخص کی ذات بھی متاثر ہوتی ہے۔ یعنی اسی روز ہر جاپانی کی عمر [illegible] سال کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ خواہ کوئی بچہ دسمبر کی آخری تاریخ کو پیدا ہو [illegible] وہ دوسرے سال کا کہلائے گا۔

نوروز عموماً گھر پر منایا جاتا ہے۔ مگر بہت سے لوگ تفریحاً شہر کے باہر چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سال تو کیو سے دس لاکھ آدمی نوروز کی تعطیل منانے باہر چلے گئے تھے۔

نوروز کو علی الصبح شہنشاہ جاپان بحیثیت قوم کے ملائے اعظم کے پہلی رسم ادا کرتا ہے۔ ننگے بدن پر ٹھنڈے پانی کے لوٹے ڈال کر جسم پاک کرتا ہے پھر محل کی عبادت گاہوں میں چاروں سمتوں کی عبادت بجالاتا ہے۔ اس عبادت کا تعلق "امیترا سو۔ اومیکامی" یعنی سورج دیوی کی اور آباؤ اجداد کی پوجا سے ہے۔ اسی طرح ہر جاپانی اپنے اپنے گھر کی عبادت گاہ میں پوجا کرتا ہے۔ شنتو اور بدھ مذہب کے پیروؤں میں عبادت کے دیوتا مختلف ہوتے ہیں۔

نوروز اپنے ساتھ مسرت کا ایک سیلاب لاتا ہے۔ ہر شخص کا چہرہ بشاش ہوتا ہے اور زبان پر کلمۂ "اومیدیتو" ہوتا ہے۔ صبح اٹھتے ہی گھر والے ایک دوسرے کو مبارک باد کہتے ہیں۔ باہر جس کسی سے ملاقات ہو پہلے مبارکباد ادا کی جائے گی پھر دوسری بات ہوگی۔ پچھلی شام کو جس قرض خواہ نے بڑی شدت سے تقاضا کیا تھا۔ آج وہی مبارک باد پیش کرنے میں سبقت کرتا ہے ہر گھر دلہن بنا ہوا ہے۔ "کادو۔ ماتسو" کی آرائش تو کئی دن پہلے لگائی جا چکی تھی۔ آج آفتاب طلوع ہونے سے قبل ہی ہر گھر پر قومی پرچم لہرانے لگا۔ جس گلی میں نکل جاؤ سرخ آفتاب کا جھنڈا لہراتا دکھائی دے گا۔ کوئی ہمنوا س گھر ایسا نہ نکلے گا جس نے جھنڈا لگا کر قوم پرستی کا ثبوت نہ دیا ہو۔ اس یگانگت اور یک جہتی کو دیکھ کر اجنبیوں کے دل پر اس قوم کے اتحاد کا بہت گہرا نقش بیٹھتا ہے۔

نوروز کی صبح کو تو کیو جیسے عظیم شہر میں ایسی خاموشی ہوتی ہے کہ شہر خموشاں معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور، جن میں کل شام تک ایسی گہما گہمی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی، آج بند پڑے ہیں۔ تمام ملازمین کو تین دن کی چھٹی مل جاتی ہے۔ ہر دکان بند، ہر دفتر بند، کہیں کوئی راہ گیر نظر نہیں آتا۔ سب لوگ اپنے بال بچوں میں بیٹھے خوشی منا رہے ہیں۔ پہلا کام کوئیں میں سے پانی نکالنا ہے۔ یہ رسم پرانے زمانے سے چلی آئی ہے اور اب بھی بہت ٹھاٹھ سے منائی جاتی ہے۔ پانی زندگی کے لئے نہایت اہم ہے اس لئے نئے سال میں پہلا پانی نکالنے کی رسم ایک تقریب بن گئی ہے۔ آج کل ہر گھر میں نل لگ گئے ہیں۔ پھر بھی بیشتر گھروں میں ان کے ساتھ ساتھ کنواں بھی ہے جس میں پمپ لگا ہوتا ہے۔ اسی میں سے پہلا پانی نکالا جاتا ہے۔ یہ تقریب ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ شاعروں نے اس پر نظمیں کہی ہیں۔

گھر کا ہر فرد نیا کیمونو پہن کر دیوان خانے میں آ بیٹھتا ہے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد کہہ کر نئے پانی کی نئی ہوئی سبز چائے پی جاتی ہے۔ پھر میٹھی شراب پی جاتی ہے جس میں کچھ مسالے پڑے ہوتے ہیں کالی مرچ، ادرک، دارچینی اور دیگر مسالے جن میں ترکاریاں اور پھلوں کے چھلکے بھی ہوتے ہیں کوٹ پیس کر ریشم کی تھیلی میں بھر کر شراب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس مرکب کو "توسو" کہتے ہیں اور یہ صرف نوروز کے موقعے پر پیا جاتا ہے۔ اسے صحت بخش اور مقوی معدہ بتاتے ہیں اور یہ معدے کو ان ثقیل غذاؤں کو قبول کرنے کے لئے تیار کرتا ہے جو نوروز کے ایام میں کھائی جاتی ہیں پہلے صاحب خانہ ایک پیالی پیتا ہے۔ پھر گھر والی۔ ان کے بعد درجہ بدرجہ بچے پیتے ہیں اور آخر میں نوکر۔

اس کے بعد ایک شوربہ پیا جاتا ہے جسے "زونی" کہتے ہیں۔ یہ شوربا دو طرح کا بنایا جاتا ہے یا تو آبِ مقطر کی طرح صاف شفاف ہوتا ہے یا اس میں پسی ہوئی دال ڈال کر گاڑھا کر لیتے ہیں۔ اس میں مرغ کا گوشت، ترکاریاں اور "موچی" کے ٹکڑے پڑے ہوتے ہیں۔ "توسو" اور "زونی" کے بعد ناشتے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نوروز پر تین دن تک یہ چیزیں پی جاتی ہیں۔ ہر امیر و غریب "توسو" اور "زونی" ضرور پیتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر صاحب خانہ ڈاک دیکھتا ہے۔ ڈاک کے بچارے نوروز منانے سے محروم رہتے ہیں۔ مگر گھر گھر نوروز کی ڈاک تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ ڈاک میں کچھ مبارک نامے ایسے ضرور نکل آتے ہیں کہ جہاں اس نے خود کارڈ نہیں بھیجا تھا۔ وہ یا تو ان کے جواب میں اسی وقت مبارکنامے لکھتا ہے یا دن کے کسی اور وقت کے لئے ٹال دیتا ہے۔

بہر حال یکم جنوری کو یہ کام ضرور انجام دے لیتا ہے۔ کچھ دن چڑھے وہ گھر سے نکلتا ہے اور قریب کے احباب و اعزہ کے گھروں کے چکر لگاتا ہے ہر گھر کی ڈیوڑھی میں ایک خوشنما کشتی رکھی ہوتی ہے۔ اس میں اپنے نام کا کارڈ رکھ دیتا ہے۔ اگر معمولی شناسائی ہے تو صرف کارڈ رکھنے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے گھنٹی بھی نہیں بجاتا۔ یونہی الٹے قدم واپس چلا آتا ہے۔ جن لوگوں سے بے تکلفی ہے ان کے گھروں پر گھنٹی بجاتا ہے۔ گھر والی آکر استقبال کرتی ہے۔ مرد مبارکباد دینے باہر گئے ہوتے ہیں۔ عورتیں ہی یہ فرض انجام دیتی ہیں۔ معمولی ملاقات ہے تو مبارک باد کے رسمی جملے ایک دوسرے کو کہتے ہیں اور

مہمان ڈیوڑھی سے ہی رخصت ہوتا ہے۔ تعلقات بڑھے ہوئے ہیں تو گھر والی اسے اندر بلاتی ہے۔ یوں تو گھر والی ہر مہمان کو اندر آنے کو کہتی ہے مگر وہی لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں جن کے تعلقات زیادہ دوستانہ ہیں۔ دیوان خانے میں بٹھا کر گھر والی اس کے آگے ناشتہ رکھتی ہے۔ یہ کچھ کھا پی کر رخصت ہوتا ہے۔ دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتا ہے پھر باہر نکلتا ہے۔ اسی طرح تین روز تک مرد ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں تین روز کے بعد عورتوں کی باری آتی ہے۔ پھر وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے نکلتی ہیں۔ سات روز تک اور کبھی کبھی پندرہ روز تک یہ سلسلۂ ملاقات جاری رہتا ہے۔ سات روز تک ہر گھر میں بڑے پر تکلف کھانے پکتے ہیں اور ہر قسم کی شرابیں پی جاتی ہیں۔ ان ثقیل غذاؤں کا بار معدے پر اس قدر پڑتا ہے کہ "توسعہ" کا اثر ذائل ہو جاتا ہے اور عموماً ضعفِ معدے کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لڑکے اور لڑکیاں کھیلنے کے لئے باہر نکلتی ہیں لڑکیوں کے نیلونز رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ ہوتے ہیں جن میں گلابی رنگ غالب ہوتا ہے۔ شوخ رنگ کے لباس میں وہ بالکل "تیتریاں" نظر آتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر کے دروازے کے آگے گلی میں یا سڑک کی پٹڑی پر "ہانے سکی" کھیلتی ہیں۔ یہ بیٹل ڈور کی طرح کا ایک کھیل ہے جسے بیڈمنٹن سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اس میں نہ جال ہوتا ہے اور نہ کورٹ کی لکیریں۔ دو لڑکیاں آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور بتے سے چڑیاں اُچھال اُچھال کر لاتی ہیں۔ بتے لکڑی کے ہوتے ہیں جن کا ایک رُخ سادہ اور دوسرا منقش ہوتا ہے۔ عموماً کابوکی کے مشہور ایکٹروں کے چہرے منقش ہوتے ہیں۔ عورتیں گھر کے کام کاج میں لگی ہوتی ہیں۔ انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ بھی "ہانے سکی" میں شریک ہو جاتی ہیں۔ یہ کھیل نوروز پر ہی کھیلا جاتا ہے۔

لڑکے کنکوے اڑاتے ہیں۔ گھروں کی چھتیں کھپریل کی ہوتی ہیں اور صحن میں اتنی گنجائش ہوتی نہیں کہ وہاں اڑا سکیں۔ لہٰذا وہ قرب و جوار کے میدانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ پارکوں میں کنکوے بازوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ یہ شغل صرف لڑکوں کے لئے مخصوص ہے۔ بڑے آدمی شاذ و نادر شریک ہوتے ہیں۔ مقابلہ دو باتوں میں ہوتا ہے۔ اول پتنگ کی جسامت، دوئم اس کی اونچائی۔ جس کا پتنگ سب سے اونچا جاتا ہے وہی جیتتا ہے۔ بڑے سے بڑا پتنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ کبھی کبھی دس فٹ مربعہ کے پتنگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں شکل ہر طرح کی ہوتی ہے کچھ مربعے کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ عموماً پرندوں کی شکلیں ہوتی ہیں۔ پہلے زمانے میں ایک دوسرے کا پتنگ کاٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کل یہ مقابلے کم دیکھنے میں آتے پڑتے ہیں۔ کاٹنے کی عجیب ترکیب ہے۔ ہندوستان کی طرح مانجھے کی ڈور نہیں ہوتی بلکہ معمولی ڈور میں چاقو کے چھوٹے چھوٹے پھل باندھ دیتے ہیں۔ پتنگ اس طرح لڑاتے ہیں کہ اپنے پتنگ کے چاقو سے دوسرے کی ڈور کٹ جائے۔ پتنگ بازی کا شغل نوروز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک اور تہوار پر بھی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ زور سے ہوتا ہے۔ وہ محض لڑکوں کا تہوار ہے جو ماہ مئی میں پڑتا ہے۔

شام کو "بیا کونین۔ اِشو" کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کو زیادہ مرغوب ہے مگر مرد بھی بڑے شوق سے کھیلتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں "ایک سو آدمی۔ ایک نظم"۔ جاپان کے بہترین شعرا کی ایک ایک نظم انتخاب کر لی گئی ہے۔ ان میں کوئی ستر مرد شعرا شامل ہیں اور تیس عورتیں "ہائیکو" قسم کی ستر بول والی نہایت مختصر نظم ہوتی ہے۔ ہر نظم کا نصف حصہ ایک کاغذ پر چھپا ہوتا ہے جو تاش کے برابر ہوتا ہے اور بقیہ نصف حصہ دوسرے تاش پر کھیلنے والوں کو تمام نظمیں حفظ یاد ہوتی ہیں۔ یہ کھیل دو طرح سے کھیلا جاتا ہے۔ مقابل کی دو ٹولیاں بنا کر بھی کھیلتے ہیں اور الگ الگ بھی۔ سب لوگ گھیرا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں وہ تاش پھیلا دیئے جاتے ہیں جن پر نظم کا آخری حصہ ہے۔ ابتدائی حصے والے تاش کسی خوش الحانی سے پڑھنے والے کو دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک تاش پڑھتا ہے اور اُسے دُہراتا رہتا ہے۔ کھیلنے والے اس نظم کے آخری حصے کی تلاش کرتے ہیں جس کو دکھائی دے گیا وہ جھپٹا مارتا ہے۔ جس کا ہاتھ پہلے پڑ گیا وہی اٹھا لیتا ہے بعض لوگوں کو نظمیں اتنی ازبر ہوتی ہیں کہ قاری نے پہلا بول پڑھا کہ ان کے ذہن میں نظم کا آخری حصہ آ گیا جھپٹے بازی میں بڑا چہل پہل رہتا ہے۔ آخر میں جس کے پاس زیادہ تاش نکلے وہی جیت گیا۔

یکم جنوری کا تمام دن ایسے ہی مشاغل میں گزر جاتا ہے۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ بنانے کی فکر کرے۔ دکھوالی کو اتنی مہلت کہ حمام گرم کرے۔ دکانداروں کا نوروز بھی اسی چہل پہل میں گزرتا ہے۔ ان کا نیا سال دراصل دوسری جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ خریداروں کی

فرمائشات کی تعمیل بھی یہ دوسری تاریخ کو کرتے ہیں۔ اس روز فرمائش کا مال نکال کر اسے باندھنے کی رسم بڑی دھوم سے منائی جاتی ہے۔ کئی مراسم ادا کی جاتی ہیں پھر اسے گاڑی میں لاد کر اسی شان سے گاہک کی دکان نوروز وہاں بھی چند مراسم برتی جاتی ہیں۔

سال کا پہلا غسل بھی دوسری جنوری کی صبح کو کیا جاتا ہے۔ گزشتہ سال کا آخری غسل ۳۱ دسمبر کو کیا گیا تھا۔

دوسری جنوری کی شب کو خواب دیکھنے کی بھی تیاری کی جاتی ہے۔ اس غرض کے لئے مندروں میں تعویذ فروخت ہوتے ہیں۔ ایک پرچے پر "ڈاکا" قسم کی یعنی اتیس بول والی نظم لکھی ہوتی ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ جاپانی حروف میں لکھی جائے تو اُسے الٹا سیدھا دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں اور ہر طرح ایک ہی عبارت پڑھی جائے گی۔ اس کا ترجمہ یہ ہے "سب لوگ طویل رات کی نیند سے جاگ اٹھے ہیں۔ جہاز کے موجوں پر چلنے کی آواز کیسی خوش آئند ہے"۔ اس تعویذ کو تکئے کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں اور اس کی تاثیر سے اچھا خواب دکھائی دیتا ہے۔ اچھے خواب کی تعبیر اچھی ہوتی ہے اور نیا سال خوشی اور خوشحالی میں بسر ہوتا ہے۔ بہترین خواب کوہ فجی کا ہے۔ دوسرے درجے پر عقاب کا اور تیسرے درجے پر بینگن کے پودے کا۔

تیسری جنوری کو شاہی محل میں نئے سال کے پہلے درباری مراسم ادا کئے جاتے ہیں۔ یکم جنوری کی طرح آج بھی قومی تہوار کی تعطیل ہے۔ آج شام تک نوروز کی بہت سی تقریبیں ختم ہو جاتی ہیں۔ قومی جھنڈے بھی آج رات کو یا دوسرے روز کی صبح کو اتار کر رکھ دئے جاتے ہیں مگر چند تقریبیں اور ہیں جو کچھ عرصے تک ادا ہوتی رہتی ہیں۔

۴ جنوری کو شاہی محل میں دربار منعقد کیا جاتا ہے جس میں صرف وزرائے سلطنت شریک ہوتے ہیں۔ شہنشاہ بذاتِ خاص تشریف لاتے ہیں۔ وزیرِ اعظم امورِ سلطنت کی اطلاع پیش کرتے ہیں اور وزیرِ محلاتِ شاہی امورِ محلات کی اطلاع گزرانتے ہیں۔ آج کا دربار گویا نئے سال کے کاروبارِ سلطنت کی ابتدا ہے۔

اسی سلسلے میں ۵ جنوری کو شہنشاہ کی جانب سے بڑی دعوت دی جاتی ہے جس میں شہزادگانِ خاندانِ شاہی، وزرائے سلطنت، عہدیدارانِ وزارتِ محلاتِ شاہی، ممبرانِ پارلیمنٹ، اعلیٰ عہدیدارانِ سلطنت اور اور سفرائے دول کو شرفِ باریابی بخشا جاتا ہے۔

۶ جنوری کو شاہی محل کے سامنے فائر بریگیڈ والوں کی پریڈ ہوتی ہے۔ پلیٹ سخت کے محکمۂ پولیس کا افسرِ اعلیٰ اور شاہی خاندان کا کوئی شہزادہ سلامی لیتا ہے۔ فائر بریگیڈ والے اونچی اونچی سیڑھیوں پر نٹوں کے کرتب دکھاتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔ سال گزشتہ شہر کے جن جن بریگیڈوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ان کو سندات عطا کی جاتی ہیں۔

۷ جنوری کو "ناناکسا" کا تہوار منایا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب نوروز فروری میں پڑتا تھا تو اس میں کچھ آسانی ہوتی تھی۔ آج کل بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماہِ جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے اور اس میں تمام ہریاول مرجھا جاتا ہے اور ساگ پات مر جاتا ہے۔ اس تہوار میں نئے سال کے سات ساگ ضروری ہیں۔ انہیں کوٹا پیسا جاتا ہے۔ عورتیں کوٹتے وقت ایک گیت گاتی جاتی ہیں۔ جب یہ سالن پس کر تیار ہو گیا تو اس کا شوربا پکایا جاتا ہے اور اسے چاولوں میں ملا کر دلیہ بنا لیتے ہیں۔ پہلے یہ دلیہ "ہیجیگائی" دیوتا یعنی مٹی کی مورت کے آگے چڑھایا جاتا ہے پھر گھر والے کھاتے ہیں۔ بلیات سے جو بیماریاں پیدا ہوتی وہ اس دلیے کے کھانے سے دور ہو جاتی ہیں۔ نیز اس سے موسم بہار و گرما و خزان و سرما کی مخصوص بیماریاں رفع ہو جاتی ہیں۔

نوروز کے سلسلے میں شہر اوساکا میں دو تہوار خاص طور سے منائے جاتے ہیں۔ ایک تہوار ۱۰ جنوری کو پڑتا ہے۔ یہ "ایبیسو" دیوتا کا تہوار کہلاتا ہے جو خوشحالی کے سات دیوتاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ تہوار تین دن تک رہتا ہے۔ لوگ اس دیوتا کی درگاہ میں خوشحالی کی دعا کے لئے جاتے ہیں۔ عورتیں اور نوزائیدہ بچے بیماریوں سے حفاظت کے لئے جاتے ہیں اور گیشاؤں کا بڑا شاندار جلوس نکالا جاتا ہے۔ دوسرا تہوار ۱۴ جنوری کو پڑتا ہے اور یہ کسانوں کے لئے مخصوص ہے۔ "تنوجی" کے مندر کے صحن میں ہزاروں بانس کے ننھے ننھے پودے لگائے جاتے ہیں۔ نیا سال شروع ہوتے ہی مندر کے پجاری کسانوں کے لئے دعا کرنی شروع کر دیتے ہیں ۱۴ جنوری کو کسانوں کی دو ٹولیوں کا مقابلہ ہوتا ہے کہ اس سال کس کی کھیتی کم محنت کرنے سے زیادہ پھلے پھولے گی۔ مقابلہ اٹھا دھکیل میں ہوتا ہے۔ ہر ٹولی کے پانچ پانچ طاقتور جوان کندھوں پر لکڑی کا موٹا تختہ رکھے اکھاڑے میں آتے ہیں۔ ایک ٹولی والے دوسروں کو دھکیلتے ہیں۔ جیتنے والوں کے مقابلے میں نئی ٹولی آتی ہے۔ کئی گھنٹے تک اٹھا

دھکیلی ہوتی رہتی ہے۔ مرد دھکیلنے میں شرکت کرتے ہیں اور عورتیں ان کا دل بڑھاتی ہیں۔ آخر میں مندر کی جانب سے تمام شرکا کو بانس کے پودے دئے جاتے ہیں۔ ان میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ بیمار آدمی کے بچھونے میں رکھ دئے جائیں تو وہ اچھا ہو جاتا ہے۔

۲۰ جنوری سے "کان مائیری" کا تہوار شروع ہوتا ہے۔ اس میں صرف سخت محنت طلب پیشوں کے شاگرد حصہ لیتے ہیں۔ وہ جاڑوں کے سفید کمونو پہن کر رات کو گھر سے نکلتے ہیں۔ کمر میں گھنٹیاں بندھی ہوتی ہیں۔ دوڑتے ہوئے کسی درگاہ میں جاتے ہیں اور "توبہ۔ توبہ۔ پاکی۔ پاکی کے دعائیہ کلمات پڑھتے جاتے ہیں۔ درگاہ میں پہنچ کر پہلے کچھ پیسے چڑھاتے ہیں اور روتا سے اپنے پیشے کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔ پھر حوض کے قریب پہنچ کر کمونو اتار ڈالتے ہیں اور ٹھنڈے پانی کے لوٹے بھر بھر کر اپنے بدن پر ڈالتے ہیں۔ پھر کمونو پہن کر دعائیہ کلمے پڑھتے ہوئے اسی طرح دوڑتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ یہ جاڑا وسط فروری تک رہتی ہے۔ اگر دوران سال میں کسی نے اپنا کارخانہ بدل دیا ہے تو نئے سال پر دوسری درگاہ کی جاترا کرتا ہے۔

۲۵ جنوری کو تنگین "دیوتا کی درگاہوں میں "اُسو۔ گائے" کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں جھوٹ واپس کرنا مگر اصطلاح میں اس سے ایک خاص پرندے کی واپسی مراد لی جاتی ہے۔ لوگ اس دیوتا کی درگاہوں میں جاتے ہیں۔ وہاں نقلی پرندے بکتے ہیں۔ وہ خرید کر مندر میں چڑھاتے ہیں۔ پجاری اس کے بدلے میں ایک پرندہ دے دیتے ہیں۔ لوگ اسے گھر لے جاتے ہیں۔ اس کی برکت سے انہیں نئے سال میں خوشی اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے اور آفات دور رہتی ہیں۔

نوروز کے سلسلے میں شاہی محل میں دو تقریبیں اور عمل میں آتی ہیں۔ ایک تقریب میں شہنشاہ کلاسک ادب کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ یہ نئے سال کا پہلا کلاسک مطالعہ ہے۔ اس سال یہ تقریب ۴ جنوری کو منعقد ہوئی۔ شہنشاہ دربار فرماتے ہیں جس میں خاص خاص وزرا کو شرکت کی اجازت ہوتی ہے۔ تین شاہی یونیورسٹیوں سے ایک ایک ماہر پروفیسر بلایا جاتا ہے۔ وہ تخت شاہی کے روبرو کھڑے ہو کر آدھ گھنٹے تک کلاسک ادب پر تقریر کرتا ہے۔ ایک تقریر جاپانی ادب پر ہوتی ہے۔ دوسری چینی ادب پر اور تیسری مغربی ادب پر۔ تقریروں کے خاتمے پر دربار برخاست ہوتا ہے۔

دوسری تقریب شاہی مشاعرے کی ہے۔ نوروز کے کوئی تین مہینے پہلے شہنشاہ کی جانب سے مضمون طرح کا اعلان کیا جاتا ہے تمام جاپانی اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور نوروز پر اپنی کہی ہوئی نظم شاہی محکمہ شعر میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں اُن کی جانچ کی جاتی ہے اور بہترین نظمیں منتخب ہوتی ہیں۔ یہ شاہی دربار میں پڑھی جاتی ہیں۔ نظم کی قسم "واکا" ہوتی ہے جس میں اکتیس بول ہوتے ہیں۔ ۳۶ء کے نوروز کے لئے مضمون طرح "سمندر پر بادل" تھا۔ ۲۰ جنوری کو دربار منعقد ہوا۔ اس میں درباری امرا اور چند وزرا شریک ہوئے۔ سب سے پہلے افسر الشعرا نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ پھر رعایا کی پیش کردہ بہترین نظمیں سنائیں۔ پھر شہزادگان کی نظمیں سنائیں۔ پھر ملکہ معظمہ کی نظم تین بار پڑھ کر سنائی۔ پھر شہنشاہ کی والدہ ملکہ کی نظم تین بار پڑھ کر سنائی۔ سب کے آخر میں شہنشاہ کی نظم پانچ بار پڑھ کر سنائی۔

ملکہ معظمہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ آفتاب صبح نکلتا ہے تو منظر کی خوبصورتی بڑھتی جاتی ہے اور سفید بادل آنظرِ بحر نظر آتے ہیں۔

شہنشاہ کی والدہ ملکہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ صبح کی خاموشی میں ایک جہاز سمندر میں چلا جا رہا ہے اس کے دھوئیں کے پیچھے پیچھے بادل چل رہے ہیں۔

شہنشاہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ جب ہم صوبۂ کی میں رائس شیہونو کا دورہ کر رہے تھے تو ہم نے بادل آنظرِ بحر پھیلے ہوئے دیکھے۔

شہنشاہ کی نظم جاپانی زبان میں بجنسہٖ درج ہے۔

کی نوکنی نو
شیہونومسا کی نی
تاچی یوریتے
اوکی نی تانا بکو
کموادمرُد کانا

یہ تمام میلے اور تقریبیں نوروز کی خوشی میں منائی جاتی ہیں۔ مگر ابھی ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ایک اہم میلا اور تقریب ابھی باقی ہے جو ماہ فروری میں اس روز قرار پائی ہے جس روز قمری حساب کی رو سے نوروز پڑتا ہے۔ یہ تہوار "سیتسو بون" کہلاتا ہے اور اس سال ۴ فروری کو ہوا تھا۔ یہ تمام بڑے مندروں اور درگاہوں میں منایا جاتا ہے۔ اس میں ماسے ماکی نکی رسم ادا کی جاتی ہے جو صرف مندروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر گھر میں ادا

کی جاتی ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے لئے ہر مندر میں ایک یا کئی مرد سال کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بہت بڑا اعزاز ہے۔ عموماً عمائدین ملک، مشہور پہلوان یا مشہور اشخاص منتخب کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی غیر ملکی اخبارات کے ممتاز نمائندوں کو بھی یہ اعزاز مل جاتا ہے۔ لوگ جوق در جوق مندروں میں جمع ہوتے ہیں۔ چند سال سے مندروں کے منتظمین اس اعزاز میں مشہور ایکٹرسیوں اور گیشاؤں کو بھی شریک کر لیا کرتے تھے۔ لوگ ان کو دیکھنے اور بھی زیادہ آتے تھے۔ اس سال پولیس نے اس طرز عمل کو مخرب اخلاق قرار دے کر عملاً بند کر دیا۔

یہ تقریب شام ہونے پر ادا کی جاتی ہے۔ مرد سال بھنی ہوئی دال کی ٹوکری ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ چاروں سمتوں کی طرف باری باری سے منہ کرتا ہے اور ایک دعا یعنی بھوت باہر خوشحالی اندر پڑھتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی مٹھی بھر بھر کر دال پھینکتا جاتا ہے۔ لوگ اس کے دانے لپک لیتے ہیں۔ چاروں سمتیں ختم کر کے اوپر اور نیچے بھی منہ کر کے دال پھینکتا ہے۔ گھروں میں یہ رسم ہر کمرے میں ادا کی جاتی ہے۔ جب ایک کمرے میں رسم ختم ہو چکی تو گھر والی فوراً بیرونی دروازے بند کر دیتی ہے کہ بھوت پھر اندر نہ آ جائیں۔ لوگ اس دال کا ایک ایک دانہ گن کر کھاتے ہیں۔ عمر کے جتنے سال ہوئے ہیں اتنے ہی دانے کھانے ضروری ہیں۔ اسی وجہ سے ہر سال ایک دانہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کو اپنی عمر کے دانے کھانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ان دانوں کی برکت سے عمر دراز ہوتی ہے اور آدمی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ بقیہ دانے تبرک کے طور پر محفوظ رکھے جاتے ہیں کہ گھر میں برکت ہو۔ بعض لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ آدمی کی عمر یکم جنوری کی بجائے "سینسو بون" پر بڑھتی ہے۔

نوروز کے میلے تہواروں کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ جاپانی پرانی رسموں کے بڑی سختی سے پابند ہیں۔ اسے قدامت پرستی کہئے یا کسی اور نام سے یاد کیجئے۔ مگر یہ پابندی رسوم انہیں مادی ترقی سے باز نہیں رکھتی۔ ان کا قدم زمانے کے ساتھ چلنے میں کبھی پیچھے نہیں پڑتا۔

نورالحسن برلاس

نئی بات۔ پرانی بات

کچھ بات عجب ہے اور نئی اِن لمحوں میں!
کچھ بات پرانی بھی ہے اتنی جتنا پرانا وقت کا راگ!
کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے تم نے دبایا ہات مرا!
کچھ بات نئی ہے اِن میں جیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں!
کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے سورج کی زریں کرنیں
ساگر کے کھولتے پانی پر کچھ رنگ سا کرتی جاتی ہیں!
کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے چاند کی ٹھنڈی سی کرنیں
پیڑوں سے چھن کر آتی ہیں اور موہن سائے بناتی ہیں!
کچھ بات نئی ہے ان لمحوں میں جو اُس وقت میں بھی ہوگی
جس وقت نہ ہوں گے تُو اور میں!
ہاں بات نئی ایسے جیسے پانی ساحل پر سر پٹکے!!

"میراجی"

جو ہوتا میں راجہ

جو ہوتا میں راجہ، مری جاں! — جو ہوتا میں راجہ؛
کئی ملک قبضے میں کرتا میں،
پھر تیرے قدموں پہ جھکتے، ہر اک ملک کے رہنے والے!
وہ کھاتے تری مست آنکھوں کی قسمیں،
ترے کالے بالوں کی ہونٹوں کی قسمیں!
ترے نرم ہونٹوں کی بالوں کی قسمیں
وہ کھاتے،
ہمیشہ وفادار تیرے وہ رہتے،
ہمیشہ وفادار تو میری رہتی،
ہمیشہ وفادار میں تیرا رہتا!

جو ہوتا میں راجہ

تو لاتا میں ہیرے
میں لے آتا موتی، — کئی لعل، نیلم، زمرد
تجھے لا کے دیتا!
یہ دنیا انگوٹھی کا ہوتی نگینہ!
ستاروں کی مالا گلے میں لٹکتی!
یہ چاند اور سورج بھی ہوتے
ترے نرم اور گرم سے جسم کے بے بہا اور انمول گہنے!

تجھے لا کے یہ کچھ میں دیتا مری جاں
جو ہوتا میں راجہ مری جاں
جو ہوتا میں راجہ

مگر میں بھلا دوں یہ وحشی سے سپنے!
جنوں خیز الفاظ دل میں نہ آئیں
اور اونچے خیال آسماں کے نہ لائیں!
زمیں کے ہیں تو اور میں رہنے والے۔
کہیں دُور بن میں برندا کے بن میں مجھے دے رہی ہے سنائی
کنھیا کی بنسی!
یہ سُر ہیں کہ جادو جنہیں سُن رہی ہے کوئی سانولی مست رس والی گوپی،
کنھیا کی رادھا کہ گوکل کی رانی!

یہ سُر ہیں محبت کی باتیں کہ جن سے
پریتم کو سندر سے سندر بنا دیں، — پریمی کی آنکھیں!
یہ سُر ہیں محبت کے جادو کہ جن سے
پریتم کو اپنا بنا لیں، — پریمی کے جذبے!
تجھے بھی میں اک گیت ہی لا کے دیتا، مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ، مری جاں —
جو ہوتا میں راجہ!

"میراجی"

"فرانسوی ان"

تخیل پرست انسان

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افرادِ تمثیل:

سلیم ـــــــ صاحبِ خانہ

اختر ـــــــ مہمان

نووارد ـــــــ چور

وقت: رات کے ایک اور دو بجے کے درمیان۔

منظر: ایک اوسط درجے کے گھرانے کا ڈرائنگ روم۔ خوب آراستہ و پیراستہ۔ دو مرد کرسیوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ بائیں طرف کی کھڑکی میں سے چاند کی ایک شعاع کمرے میں آ رہی ہے۔ سامنے ایک بڑی کھڑکی ہے جو کٹہرے کی طرف کھلتی ہے۔ کمرے میں اور کوئی روشنی نہیں۔ یہ دو مرد سلیم اور اختر ہیں۔ سلیم صاحبِ خانہ ہے اور اختر اس کا مہمان۔ سلیم کی عمر ۳۵ برس کی ہے۔ صورت شکل سے درشت مزاج اور سخت گیر معلوم ہوتا ہے۔ اختر کی عمر ۲۱ برس کی ہے۔ دونوں ضبط و تحمل کے ساتھ بات کرتے ہیں تو سرگوشی کے لہجے میں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ چند روز سے کوئی چور ان کے گھر کا چکر لگا رہا ہے۔ آج اُسے پکڑنے کی فکر میں یہ دونوں جاگ رہے ہیں۔ آتش دان میں آگ چمک رہی ہے۔

اختر۔ (سامنے والی بڑی کھڑکی کھول کر چپکے چپکے پنجوں کے بل واپس آتا ہے) کچھ بھی نہیں ہے باہر تو۔ یہ کیا مشغلہ نکالا ہے تم نے؟ (پھر باہر جھانکتا ہے) پتہ تک نہیں کھڑکتا۔ باہر تو خوب سردی ہے۔

سلیم۔ کھڑکی بند کر دو۔ نہیں کھٹکا نہ لگاؤ ابھی۔ یونہی بھیڑ دو۔

اختر۔ اب تو وقت ہو گیا ہوگا۔ کس وقت دیکھا گیا تھا اُسے؟

سلیم۔ بس کوئی یہی وقت ہوگا۔ ابھی میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ دیکھنے والوں کو یونہی شبہ گزرا ہوگا (جیب میں سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ جلاتا ہے) جب مسلسل تین راتوں تک وہ یہاں آتا رہا اور خالی ہاتھ گیا تو کچھ ضروری نہیں ہے کہ آج پھر وہ یہیں آئے۔

اختر۔ (آتش دان کی طرف جاتے جاتے ٹھٹک کر) یہ آہٹ کس کی ہے؟ (غور سے سنتا ہے) مجھے یہ معلوم ہوا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ ہے تمہارے پاس اپنا طمنچہ ہے نا؟

سلیم۔ ہاں ہے۔

اختر۔ میرے پاس بھی تیار ہے۔

سلیم۔ میرا طمنچہ خالی ہے۔

اختر۔ میرا بھرا ہوا ہے۔

(کمرے میں گھنٹہ ایک بجاتا ہے۔ خاموشی ہیں۔ اس کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد ہی گھر کے کسی حصے میں سے کسی اور گھنٹے کے ایک بجانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر کسی اور گھنٹے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد دور سے گھنٹہ گھر کا گھڑیال بجتا ہے)

سلیم۔ یہ ایک بجا ہے یا ڈیڑھ؟

اختر۔ (میز پر رکھے ہوئے بجلی کے لیمپ کو روشن کرتا ہے اور اپنے ہاتھ کی گھڑی دیکھتا ہے) ڈیڑھ بجا ہے۔ سنو۔ پھر آواز سنائی دی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی کی آہٹ سُنی ہے۔

(دونوں سنتے ہیں۔ آہٹ سنائی دیتی ہے)

اختر۔ (جیسے ایک دم سے گھبرا گیا ہو) یہ۔ سنائی دی؟

سلیم۔ ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو . . . لیمپ بجھا دو (اختر لیمپ گل کر دیتا ہے)

اختر۔ دیکھو پھر کوئی اِدھر ہی آ رہا ہے۔

(سلیم اپنی جیب میں سے طمنچہ نکال کر کارتوس چڑھاتا ہے اور دونوں جلدی سے ایک پردے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ ایک لمحہ بعد کمرے کے فرش پر ایک تاریک سایہ پڑتا ہے۔ کھڑکی کے باہر کوئی ہے)

اختر۔ خدا خیر کرے۔ دھاپہ پہنچا۔

(سایہ آگے پیچھے حرکت کرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ وہ باہر برآمدے میں گھوم رہا ہے اور یہ دونوں پردے کے پیچھے چھپے کھڑے ہیں۔ کھڑکی کے قریب پھر کوئی نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ کھڑکی کو کھولتا ہے۔ کھٹکا کھلا ہوا ہے اس لئے پٹ کھل جاتے ہیں۔ آنے والا مذبذب حالت میں کھڑا رہتا ہے۔ پھر بہت ہوشیاری سے کمرے کے اندر ایک قدم رکھتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے۔ اس کا سر سلیم کے بہت قریب ہے۔ اس کے مُنہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا ہے۔ پھر اور اندر قدم بڑھاتا ہے سلیم نہایت پھرتی سے نکل کر کھڑکی کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اختر لپک کر دروازے پر پہنچ جاتا ہے)

سلیم۔ اب کہاں جاتے ہو دوست!

(آنے والا گھبرا کر کھڑکی کی طرف پلٹتا ہے تو سلیم اور طمنچے کو دیکھتا ہے پیچھے ہٹ کر ایک کونے میں ہو جاتا ہے)

سلیم۔ (طمنچے کی زد میں اُسے لیتے ہوئے) اپنے مُنہ پر سے ڈھاٹا ہٹاؤ اور ہاتھ اونچے کرو۔ (ایک دفعہ پھر اپنے الفاظ دُہراتا ہے) اپنے مُنہ سے ڈھاٹا ہٹاؤ اور ہاتھ اونچے کرو ورنہ گولی تمہارے جسم کو توڑ کر نکل جائے گی (نووارد سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے پھر دانستہ طور پر اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لیتا ہے) چلو چلو۔ یہاں یہ حماقت نہیں چلے گی۔ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں گولی چلا دوں گا۔

(نووارد ساکت و خاموش کھڑا رہتا ہے) میں تین تک گنتی گنتا ہوں اور پھر طمنچہ داغ دوں گا۔ ایک . . . دو . . . تین! . . .

(سلیم کو گولی چلانے کا خیال تک نہیں تھا۔ تین کی آواز ختم ہو جاتی ہے اور دونوں بدستور کھڑے رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ نووارد ڈر کر حکم نہیں مانتا سلیم کچھ ہٹ جاتا ہے۔ نووارد ایک دم سے بولتا ہے۔ آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ آواز ہلکی ہے مگر اس میں ایک نوع کا وقار ہے)

نووارد۔ گولی چلاؤ۔ سوچو مت۔ گولی چلاؤ۔

اختر۔ (کچھ گھبرایا ہوا کیونکہ پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا) (اُ) تم سُنتے کیوں نہیں جو تم سے کہا جا رہا ہے وہ کیوں نہیں کرتے؟

نووارد۔ تم گولی کیوں نہیں چلاتے . . . میں جو تم سے کہہ رہا ہوں۔ اس طرح تو یہاں کھڑا رہنا بہت دشوار ہے۔

اختر۔ تم کون ہو؟

(نووارد اپنا ڈھاٹا کھول دیتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً پینتیس سال کی ہے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا ظلم و تشدد اُس نے برداشت کیا ہے مگر جو مصائب اس نے اٹھائے ہیں اُن سے اُس کی شائستگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کی بول چال اور لب و لہجہ نہایت صاف اور شستہ ہے)

نووارد۔ میں کون ہوں؟ چور ــــ ایک معمولی چور ــــ بس یہ ہوں میں۔ آپ نے گولی کیوں نہیں چلائی . . . میری خواہش یہی تھی مجھے اس سے نجات مل جاتی۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوتا۔

سلیم (سرد مہری اور سخت گیری سے) ٹھہرے رہو جہاں تم ہو۔ خبردار جو تم ہلے۔ (اختر کھڑکی کا کھٹکا لگا دو (اختر کھڑکی بند کر دیتا ہے۔) دروازے میں بھی قفل لگا دو (اختر دروازہ بھی بند کر دیتا ہے) روشنی جلا دو۔

(میز کے قریب جا کر اختر لیمپ روشن کر دیتا ہے)

نووارد۔ (جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے اور کافی دیر تک خاموشی رہتی ہے تو کچھ اور ہی لہجے میں بولتا ہے اس کی آواز میں غیر متوقع چمک ہوتی ہے ــــ جیسے طوفان خیز رات میں ستارے کی چمک) تو پھر اب؟ اب آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ پولیس کو بلوائیں گے۔ شاید۔ تھانہ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہے نا؟ کیا آپ کے پاس ٹیلیفون ہے؟

سلیم۔ نہیں۔

نووارد۔ یہ تو ایک عذاب ہے۔ (کچھ خوش مذاقی سے کہتا ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے بولنے والا شکست خوردہ اور مایوس ہو چکا ہے) سنتے ہیں جناب آپ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے لئے باعثِ زحمت بن رہا ہوں۔ ابھی تو صرف ڈیڑھ بجا ہے نا۔ کیسا نامناسب وقت

ہے (سلیم خاموش رہتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ نووارد کہتا ہے) یہ اچھا ہوا کہ آپ دو حضرات یہاں ہیں۔ ایک صاحب اگر ٹھہر جائیں گے تو دوسرے میرے پاس ٹھہریں گے (پھر جیسے نیا خیال ذہن میں آیا ہو) یا پھر تینوں کو یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔

سلیم۔ (خشکی سے) ازراہِ کرم اس کا فیصلہ ہم دونوں پر چھوڑ دیجئے۔

نووارد۔ (بسرو چشم۔ میں تو صرف اس لئے بول رہا ہوں کہ خاموشی نہ رہے ——— آہ!

(اظہارِ تکلیف کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نووارد اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور گرنے سے بچنے کے لئے ایک کرسی کا سہارا لیتا ہے۔ سلیم اور اختر اُسے دیکھتے رہتے ہیں کچھ تعجب سے اور کچھ شبہ سے۔ ایسے شخص کو گرفتار کرنے کی اُن کو مطلق توقع نہ تھی۔ کافی کوشش کے بعد نووارد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور جب سنبھل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ خوش مذاقی کا جو انداز اس میں تھا یکلخت معدوم ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کسی نے اُسے کچل ڈالا ہے۔ اُس کی آنکھیں بے معنی طور پر کمرے میں گھومتی ہیں۔ سامنے کچھ پھل پھلاری رکھی ہے۔ اس پر اس کی نظر پڑتی ہے)

نووارد۔ کیوں جناب اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو اس میں سے کچھ لے لوں۔ میرے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے کوئی . . . پرسوں دن کے وقت سے۔

سلیم (ہاتھ میں طمنچہ لئے ہوئے) تم جہاں ہو وہیں ٹھہرو۔ اختر تم اٹھا کر دے دو۔

(اختر جلد پھل اٹھا کر نووارد کے سامنے میز پر رکھ دیتا ہے)

نووارد۔ شکریہ (جلدی جلدی نگلنا شروع کر دیتا ہے جیسے بہت بھوکا ہے) . . . تھوڑا سا پانی بھی مل سکتا ہے مجھے؟

سلیم۔ اگر آپ ہمیں پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع دے دیتے تو دعوت کا انتظام پوری طرح کر لیا جاتا۔

نووارد (سلیم کے طنز کو محسوس نہ کرتے ہوئے) معاف فرمائیے گا۔ میرا اس طرح آپ سے چیزیں طلب کرنا بدتمیزی میں داخل ہے . . . میں چور ہوں۔ لیکن یہ محسوس کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خیر (بطور ثبوت کے کہتا ہے) یہ پہلا موقع ہے کہ میں پکڑا گیا ہوں۔

(سلیم اختر کو اشارہ کرتا ہے کہ نووارد کو پانی دے دے۔ اختر گلاس میں پانی دیتا ہے) شکریہ۔ آپ نے بہت کرم فرمایا (پانی پیتا ہے) میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کی سخت ضرورت تھی۔

سلیم (اختر سے) کیوں بھئی ہمیں کیا کرنا چاہئے! میں جاؤں شہر میں اور کسی کو یہاں بلا کر لاؤں ——— یا تم جاؤ اور میں یہاں ٹھہروں۔

اختر۔ نہیں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں یہاں ٹھہر جاؤں گا

نووارد۔ میں بالکل ساکت و خاموش رہوں گا۔

سلیم۔ کاش آپ ایسے ہی رہیں۔

(نووارد کھسیانی ہنسی ہنستا ہے)

اختر۔ نزدیک کا راستہ کونسا ہے؟ کھیتوں میں سے یا سڑک سڑک؟

سلیم۔ کھیتوں میں سے ——— صرف اندیشہ ہے کہ تم راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ میرا ہی جانا مناسب ہے۔

اختر۔ مجھے راستہ خوب معلوم ہے۔

سلیم۔ یقین ہے تمہیں؟

اختر۔ بالکل۔

سلیم۔ اچھا میں بطور تمہارے میزبان کے تم سے پوچھتا ہوں تم جاتے ہو ——— یا یہاں ٹھہرتے ہو؟

نووارد۔ آپ حضرات پیسہ اچھال کر فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے (یہ بات غیر متوقع طور پر کہی گئی اور چونکہ اچانک کہی گئی تھی اس لئے دونوں نے پلٹ کر نووارد کی طرف دیکھا) مجھ سے اُدھار لے لیجئے۔ (اپنی جیب میں سے ایک سکہ نکال کر میز پر ڈالتا ہے) لیجئے۔ ایک پیسہ ہے ——— اور ساری دنیا میں میری یہی کل دولت ہے! تو اسے آپ بعد میں مجھے واپس دے دیجئے گا دے دیں گے نا؟

(سلیم اور اختر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، گویا پوچھتے ہیں کہ ہمیں اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں میں طے کیا کہ یہی کر دیکھنا چاہئے)

سلیم۔ (پیسہ اٹھا لیتا ہے) اچھا اختر تم پیسہ لیتے [illegible] حروف!

اختر۔ حروف۔

(کمرے کے بیچ میں جو چھوٹی میز ہے اس [illegible] اختر دائیں طرف سلیم اور اس کے پیچھے نووارد ہے [illegible] بیٹھتے ہیں)

نووارد۔ ٹھہریئے۔ مجھے ایک خیال اور آیا ہے۔ میری طبیعت اس وقت کچھ موزوں ہے۔ یہ کھانے کا نتیجہ ہے۔ چلئے ہم تینوں ساتھ چلیں۔ آپ میں سے کسی کو پھر میرے پاس تنہا نہیں رہنا پڑے گا اور جب آپ واپس آئیں گے تو اکیلے نہیں آئیں گے۔

سلیم۔ واللہ! ٹھیک بتایا تم نے۔

نووارد۔ میرے خیالات عموماً ٹھیک ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس حالت میں ہوں . . . میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ کھانے کا خمار . . . کیوں جناب اس سے پہلے کہ ہم یہاں سے روانہ ہوں کیا آپ کو آپس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اگر میں ایک آرام کرسی میں آسودہ ہو کر چند منٹ کے لئے ایک سیگرٹ پیوں؟ اس لطف سے میں مہینوں سے محروم ہوں . . . آپ سمجھ نہیں سکتے کہ میرے لئے کتنی بڑی تفریح کا باعث ہوگا۔

سلیم۔ بہت اچھا۔

اختر۔ تم عجیب و غریب آدمی ہو۔

نووارد۔ (آواز میں تھکی ہوئی ناامیدی کی جھلک) کیا واقعی؟

سلیم۔ تم محسوس نہیں کرتے کہ تم کیا ہو؟

نووارد۔ (کیا کوئی بھی یہ محسوس کرتا ہے؟ . . . آپ کیا ہیں (تکلیف سے کراہتا ہوا) ایک کرسی میں بیٹھ جاتا ہے پھر دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے) مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ حضرات کی نیند میں مخل ہو رہا ہوں مگر ایک لحاظ سے یہ غلطی آپ ہی کی ہے — آپ کو میرے لئے جاگتا نہیں رہنا چاہیئے تھا (کرسی میں بیٹھ جانے کے بعد نووارد کے گرد کچھ اس درجہ تاسف انگیز ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ اختر کا دل پسیج جاتا ہے۔ سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر نووارد کے سامنے پیش کرتا ہے اور نووارد ایک سگریٹ لے کر کچھ اس طرح مسکرا کر اختر کی طرف دیکھتا ہے جیسے کوئی بچہ اظہارِ ممنونیت کرتا ہے) شکریہ۔

(اختر دیا سلائی جلا کر نووارد کا سگریٹ سلگاتا ہے۔ ان کی نظریں ایک لمحے کے لئے ملتی ہیں۔ نووارد اپنی نظریں جھکا لیتا ہے لیکن اختر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

سلیم (اختر کی مہربانی کو بہ نظرِ تحسین دیکھتا ہے اور ہنس کر کہتا ہے) کچھ اور آپ ان کی خاطر کر سکتے ہیں!

اختر۔ (ہلکی آواز میں) بچارہ! اس کے لئے یہ واقعہ ایسا ہے جیسے کوئی بُرا خواب ہو۔

نووارد۔ یہ آپ کیوں کہتے ہیں؟ . . . یہ بُرا خواب نہیں ہے۔ (آرام کرسی میں پھیل بیٹھتا ہے اور سگریٹ مزے لے لے کر پیتا ہے۔ پیچھے جھکتا ہے، پاؤں پھیلاتا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتا ہے۔ گھٹنے پر سے پاجامہ پھٹا ہے جس میں سے گھٹنا نظر آتا ہے اس لئے نووارد پہلو بدل کر بیٹھتا ہے) یہ ایک خوبصورت خواب کی طرح ہے۔ میں نے یہ خواب اکثر دیکھا ہے، اور اتنا دیکھا کہ اس کو فراموش کر بیٹھا . . . سجے سجائے نفیس کمرے میں اس طرح پھر سانس لینا (کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے تاکہ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا سکے) واللہ! حسین تصویریں اور قالین! (ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر اس کی نظر قالین پر سے ہوتی ہوئی اپنے پھٹے ہوئے پاجامہ پر پڑتی ہے) . . . اس حلیہ کو پہنچنے میں مجھے دس برس لگے ہیں (کرسی میں اُبھر کے بیٹھتا ہے۔ پھر سامنے میز پر جو تصویر رکھی ہے اس پر نظریں جم جاتی ہیں) لاہور! مشن کالج!

اختر۔ ہاں (میز پر جو لیمپ رکھا ہے اُسے روشن کر دیتا ہے)

نووارد۔ میں بھی ایک زمانے میں وہاں تھا (کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے)

اختر۔ آج کل میں اس کالج میں ہوں۔

نووارد۔ (بہت دلچسپی لیتے ہوئے عجلت سے) اچھا آپ آج کل وہیں ہیں! بوڑھا سیموئل اب بھی سینئر ٹیوٹر ہے؟

اختر۔ (میز پر بیٹھتے ہوئے) ہاں۔

نووارد۔ (ہنس کر جیسے پرانی باتیں یاد آ رہی ہوں) کیا واقعی ابھی تک وہیں ہے؟ پیارا بوڑھا سیموئل! کیا آپ وہاں تازہ واردوں میں ہیں؟

اختر۔ (قدرے ناز و پندار کے ساتھ) میں تھرڈ ائیر میں ہوں (نووارد سر ہلاتا ہے گویا سمجھ گیا)

نووارد۔ اب کے جو آپ بوڑھے سیموئل سے ملیں تو انہیں یاد دلائیے کہ . . . مگر نہیں۔ شاید یہی بہتر ہوگا کہ آپ تذکرہ نہ کریں۔

(پھر کچھ دیر آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی پنکھی پر تا ہو)

سلیم۔ آپ دونوں اپنی اپنی تعلیمی زندگی کا تذکرہ ختم کر لیں تو ہم چلیں۔

اختر۔ نہیں سلیم نہیں ـــــ ابھی بہت وقت ہے (نووارد کی طرف سگریٹ کا ڈبا بڑھاتے ہوئے) سگریٹ اور لیجئے جناب (اس "جناب" پر سلیم بے چینی سے جنبش کرتا ہے اور اختر بھی اپنی لغزش کو محسوس کرتا ہے) میرا مطلب یہ ہے . . . (بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ نووارد فوراً سگریٹ لے کر شکریہ ادا کرتا ہے) مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے اور یہ خلاف تہذیب بھی ہے لیکن . . . میرا مطلب یہ ہے کہ . . . میں پوچھ نہیں کرنی چاہتا۔ لیکن آپ نے ایسی زندگی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟

(نووارد اختر کی طرف ایک نظر دیکھتا ہے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں جب جواب دینا ہے تو سوال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا)

نووارد۔ ایک دن جو اپنے کمرے میں میں آیا تو دو خط مجھے ملے۔ (توقف) ایک میں کرکٹ کا میچ کھیلنے کی دعوت تھی اور دوسرے میں یہ اطلاع تھی کہ میرے والد کا سب روپیہ ڈوب گیا۔ اب ایک کوڑی بھی باقی نہیں تھی۔

(نووارد کی نظریں کمرے میں گھومتی ہیں۔ پھر اختر پر پڑتی ہیں۔ اس کے بعد سامنے جم کر رہ جاتی ہیں جیسے بھولی بسری باتوں کو کوئی یاد کر رہا ہو)

اختر۔ پھر کیا ہوا؟

نووارد۔ پھر کیا ہوا؟ میں نے کوشش کی اور ایک دفتر میں مجھے ساٹھ روپے ماہوار کی جگہ مل گئی۔ لیکن نئے نئے خیالات میرے دل میں ہمیشہ پیدا ہوتے تھے اس لئے راتوں کو میں مضامین لکھا کرتا تھا بعض رسائل و اخبارات سے معاوضہ مل جاتا تھا۔ فلم کے لئے ایک کہانی بھی لکھی تھی جو اچھے داموں بک گئی۔ اس دن مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس طرح میں نے کافی رقم پیدا کی۔

اختر۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر کیا ہوا؟

نووارد۔ ایک عورت ـــــ میں نے اس کی زندگی برباد کر دی۔

سلیم۔ (جھگڑے میں ہٹتا پھرتا ہے۔ کھڑکی سے میز تک اور میز سے کھڑکی تک) مجھے یہی گمان تھا۔ کوئی آدمی تمہاری حالت کو اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک اپنا ہی کوئی ذاتی نقص اُسے نہ گرائے۔ کیچڑ کی چھینٹیں اُسی وقت پڑتی ہیں جب کیچڑ میں پاؤں رکھا جائے

نووارد۔ (سلیم کی طرف پلٹ کر ملائمت سے کہتا ہے) نہیں۔ لوگ موٹروں میں تیزی سے میرے قریب سے گزرے اور مجھے کیچڑ میں لت پت کر گئے اور پھر مجھے اس درجہ گندہ و ناپاک سمجھا کہ مجھے ملنے کے لائق نہ سمجھا (آواز میں اب احساسات نمایاں ہوتے ہیں) ہماری شادی ہوگئی (سلیم سے) اس نے اُس کی زندگی کو برباد کر دیا ـــــ اور میری زندگی کو بھی . . . (سلیم تمسخر سے دیکھتا ہے) اگر وہ تنہا ہوتی تو میں غرق ہونے سے بچ جاتا ـــــ وہ آزاد رہتی مگر اس کے لواحقین بھی تھے اور دنیا ہمیں ایک دوسرے سے جدا بھی ہونے نہیں دیتی تھی ـــــ اس لئے ہم دونوں پگھلے گئے۔

سلیم۔ مضحکہ خیز بات ہے۔

نووارد۔ (سادگی سے) ہے نا؟ لیکن اس وقت ہم مضحکہ خیز مرد تھے۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ خدا ان کی مدد کرے۔ انسان تو مدد کرتے نہیں۔

سلیم۔ باتیں بنانے میں کیا لگتا ہے ـــــ اپنی ناکامیوں کے لئے انسان ہمیشہ عذر تلاش کر لیتا ہے۔

نووارد۔ عذر تلاش کر لیتا ہے؟ . . . (ایک دم سے بھڑک اٹھتا ہے) اور میں ناکام کیسے ہوں؟ کیا اُن سب کاموں میں جنہیں میں نے کرنے کی کوشش کی مجھے بری طرح ناکامی ہوئی؟ میں نے اپنے آپ کو ایک کافی سمجھ دار انسان بنایا۔ میں نے اپنے آپ کو محسوس کرنے اور سوچنے کا عادی بنایا۔ میں نے اوروں کی محسوس کرنے اور سوچنے میں مدد کی۔ میرے پاس تخیلات تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کا اظہار لکھ کر کر سکتا ہوں ـــــ اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دوستی اور محبت کے معنی سیکھے ـــــ ان سب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر ناز کیا جا سکے ـــــ میں نے غلطیاں کیں، مگر میں ناکام نہیں ہوا اور وہاں کھڑے ہو کر آپ ـــــ اس سب کچھ کے مالک ـــــ کیوں حقارت سے ناک بھوں چڑھا کر اس چیز کو نفرت سے دیکھ رہے ہیں جس سے میری موجودہ ہستی عبارت ہے؟ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ میں نے جو کچھ کیا اس کی وقتی قیمت کچھ بھی نہیں تھی۔ بس یہی بات ہے اور آپ چاروں طرف دیکھئے کہ لوگ اپنا روپیہ کس چیز پر صرف کرتے ہیں ـــــ بیکار زہریلے کیڑے ڈھیروں کو دیکھئے جنہیں وہ پڑھتے ہیں۔ نشاط خانوں کو دیکھئے کہ ذلیل موسیقی کے لئے لوگوں سے کس قدر کچھ

بھرے ہوتے ہیں، اُن سڑی سڑی تصویروں کو دیکھئے جنہیں وہ اپنی دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں۔ اُن ذلیل گانوں کو دیکھئے جو عوام میں مقبول ہو کر بچے بچے کی زبان پر ہوتے ہیں ـــــ اور پھر مجھے حقارت سے دیکھئے کہ میں اس کو فروخت نہ کر سکا جو میرے اندر تھا اور جب لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو اُسے وہ صرف کس طرح کرتے ہیں! ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو دنیا کے اور شہروں سے برابر کی ٹکر لیتے ہیں، آپ میرے ساتھ چل کر اُس گندگی اور ارذل پستی کو دیکھئے جو انسانیت کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے ـــــ اور پھر مجھے ناکام کہئے کہ میں اُبھر نہ سکا۔ اگر روپیہ ہو تو دنیا ناکامی کو بھی کامیابی سمجھے گی۔ یہ معیار ہے قدر و قیمت کا ـــــ اور یہ معیار بدترین، ظالمانہ، اور سب سے چھوٹا معیار ہے (وفورِ جذبات سے کرسی میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) رہے عذرات! اگر عذرات کا کوئی ذکر ہے تو جتنی کامیابیاں آپ کو حاصل ہوں اتنے ہی عذرات بھی پیش کرنے چاہئیں کہ آپ موٹروں میں بیٹھے اور دوں پر تیزی سے کیچڑ اچھالتے جاتے ہیں۔

(نوازار دکا جان ختم ہو جاتا ہے اور وہ ہلکی طنزیہ ہنسی کے ساتھ بے دم سا ہو کر کرسی میں پھر دراز ہو جاتا ہے۔ اختر خاموشی کو توڑتا ہے)

اختر۔ آپ کے ڈرامے کا کیا ہوا؟

نوازار د۔ (ہنس کر) وہ دکھایا ہی نہیں گیا۔ تھیٹر کے مالک نے کہا کہ اس میں خیالات بہت زیادہ ہیں اور لوگوں کو اس قسم کی چیز پسند نہیں آتی۔ جب اس ڈرامے کو قبول کر لیا گیا تھا تو میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اپنے لکھنے لکھانے پر اعتماد کیا تھا مگر اِن کا رُخ غلط ہو تا گیا۔ ان میں بہت زیادہ پیچیدگی آ گئی۔ میں اس کا کوئی علاج نہ کر سکا۔ میں نے کبھی اس نیت سے لکھا ہی نہیں تھا کہ عوام کی جہالت کے مطابق ہو اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُن کے مذاق کا لحاظ رکھا جائے اور بیوی کے وجود کی وجہ سے معاملات مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے گئے اور ہم گرتے چلے گئے گرتے چلے گئے، یہاں تک کہ انجام پر پہنچ گئے۔

اختر۔ انجام؟

نوازار د۔ (سست اور بے زور آواز میں) کشمکش اور کھانے کے لئے معقول غذا بھی نہیں۔ اس سے اُس بچاری کی زندگی اجیرن ہو ہو گئی (اُسے واقعات واضح طور پر یاد آتے ہیں اور وہ پھر بھڑک اُٹھتا ہے) متعفن تنگ و تاریک محلے میں ایک بوسیدہ بدبودار کمرہ ـــــ اور ڈاکٹر جس کی فیس دینے کے لئے میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی ـــــ اور میں اُسے سخت کرب و تکلیف سے مرتا دیکھتا رہا ـــــ اور میں نے کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھنے سے ہمیشہ نفرت کی اُس کے ماتھ آنکھوں کو چھپا لیتے ہیں گویا کسی بھیانک تصویر کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ جلدی ہی آنکھیں کھول دیتا ہے اور ذرا آہستگی سے کہتا ہے، بس یہ سب کچھ ہو گیا ـــــ میرا خیال یہ تھا کہ میں ان باتوں کو بھول گیا ہوں گا۔

اختر۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟

نوازار د۔ (اختر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے) آپ لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں بیٹھ کر اپنے گل وحشیانہ ماضی کی روداد سناتا رہوں گا؟

اختر۔ معاف فرمائیے گا۔ مجھے نہیں پوچھنا چاہئے تھا ـــــ خدا جانے میں نے آپ سے کیوں دریافت کیا . . . نہ جانے کیوں میں جاننا چاہتا تھا۔

نوازار د۔ (اختر کے ملائم و متاسف لہجے سے فوراً متاثر ہو کر، کوئی مضائقہ نہیں، میں نہیں جانتا کہ آپ میرے حال سے کیوں آگاہ نہ ہوں (کچھ حقارت سے) شاید اس وجہ سے کہ دلچسپ ہے۔ آپ اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کریں گے ـــــ دو بجے رات کو جیتے جاگتے چور کے روبرو ـــــ زندگی کو دیکھ رہے ہیں آپ؟

اختر۔ جی نہیں۔ جی نہیں۔

نوازار د۔ (اختر کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے اپنی داستانِ حیات سناتا ہے) جب وہ مر گئی تو میں نے ہر چیز کو پھینک دیا اور مردوں اور عورتوں کو یک جا دیکھنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ میں بھاگ گیا کھیتوں میں چلا گیا۔ موسم گرما تھا۔ سڑک کنارے کسی درخت کے سائے میں پڑ رہتا تھا ـــــ بھیک مانگتا تھا یا چھوٹی موٹی مزدوری کر لیتا تھا۔ میری حالت اس درجہ خراب نہ ہوتی اگر وہ بہر وقت میرے کانوں میں روتی نہ رہتی۔ جب پہلی رات کو بارش ہوئی تو مجھے نزلہ ہو گیا۔ میں بیمار پڑ گیا ـــــ اور پھر سردیاں آ گئیں۔ مجھے پھر شہر میں آنا پڑا۔ میں کمزور تھا ـــــ اس قدر کمزور کہ کسی کام کے

لائق نہیں۔ کام اگر تمہارا بھی تو مجھ سے نہ ہوتا۔ خدایا! بس یہ تھا وہ موقع جب میں ڈوب کر بالکل تہ میں پہنچ گیا . . . فاقے مرنے لگا . . . شاید آپ کے لئے یہ صرف ایک لفظ ہو۔ صبح کا ناشتہ نہ کرنا یا دن کا کھانا دو ایک گھنٹے دیر سے کھانا . . . مگر فاقے کرنا ـــ میں نے یہ کیا ہے ـــ مہینوں تک کیا ہے ـــ دُکانوں اور پٹریوں پر پڑ رہنا اور کسی پرانے پھٹے ہوئے بوری کے ٹکڑے سے گرمی حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اُس مخلوق سے نفرت کرنا جس کے ساتھ رہنے سہنے پر مجبور تھا ـــ جو آرام و آسائش سے گزر کرتے انہیں کوسنا۔ ایک دن شبہ میں مجھے پولیس نے گرفتار کر کے چالان کر دیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا کہ تم "سوسائٹی کے لئے عذاب ہو" (نہایت حقارت سے) "سوسائٹی کے لئے عذاب" اس سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔ سوسائٹی کا میں اس درجہ مرہونِ منت تھا کہ میں اس کے لئے عذاب بننا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے ایک چیز لے لی جو میری نہیں تھی اور اُسے بیچ ڈالا ـــ اور ایک شب کے لئے میرے پیٹ کے لئے غذا اور تن کے لئے گرمی کا انتظام ہو گیا۔ جائز یا ناجائز کا سوال ہی اس صورت میں پیدا نہیں ہوتا ـــ یہ اس قدر بہیمانہ کیفیت ہوتی ہے۔ (سلیم کی طرف دیکھ کر) نفرت انگیز ہے نا؟ . . . (وہ اٹھتا ہے) میں نے چیزیں اڑانی شروع کر دیں ـــ مگر یہ چیزیں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ اُن کے اڑانے سے مالک کو سخت تکلیف اٹھانی پڑے ـــ میرا مطلب حقیقی تکلیف سے ہے . . . (اپنا میلا کچیلا ڈھاٹا اٹھاتا ہے) پھر میں نے یہ صورت اختیار کی . . . بس . . . (ڈھاٹا میز پر ڈال دیتا ہے) . . . ہاں تو اب میں یہاں ہوں۔ (یکایک اُسے اختر کا طمنچہ میز پر قریب پڑا نظر آتا ہے۔ ڈھاٹے کے نیچے رکھا تھا۔ سلیم آتش دان کے قریب ہے۔ اختر نیچے فرش کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نووارد طمنچہ اٹھا لیتا ہے اور چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ سلیم کی شست لگاتا ہے اور زور سے کہتا ہے) تو بیٹھئے!

(اختر گھبراہٹ میں ایک کرسی الٹ کر کونے میں جا کھڑا ہوتا ہے)

سلیم۔ (ایک لمحہ کے لئے بدحواس ہو کر) نیچے کرو اُسے (نووارد کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

نووارد۔ وہیں کھڑے رہو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔

اختر۔ (اپنے کونے سے نکل کر نووارد کی طرف بڑھتا ہے) سنئے تو یہی یہ میرا ہے۔

(نووارد اختر کی طرف طمنچہ کرتا ہے)

سلیم۔ اختر وہیں ٹھہرو۔

(اختر ٹھہر جاتا ہے)

نووارد۔ بس ٹھیک ہے . . . اب اگر تم دونوں میں سے ایک بھی ہلا تو میں گھوڑا دبا دوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھرا ہوا ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ اب آپ کا اپنا فعل ہوگا۔

اختر۔ وہ بھرا ہوا ہے۔

نووارد۔ شکریہ آپ کا۔

اختر۔ اگر آپ کسی کو مار دیں گے تو بھلا فایدہ کیا ہوگا۔ اس کے بدلے میں آپ کو پھانسی مل جائے گی۔

نووارد۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے پھانسی کی پروا ہوگی یا نہیں . . . دیکھو چپکے کھڑے رہو۔ سلیم ٹھہر ٹھہر کر نووارد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ طمنچہ اس کی طرف لگا ہے مگر وہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نووارد زور سے کہتا ہے) ٹھہرو!

سلیم۔ (نووارد کے قریب آ جاتا ہے اور پُرسکون لہجے میں کہتا ہے) چھوڑئے اسے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اسے رکھ دیں۔

نووارد۔ آپ بہادر آدمی ہیں۔

سلیم۔ آپ بڑے بے وقوف ہیں . . . چھوڑئے اسے (سلیم اس کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور نووارد مسکرا کر طمنچہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ سلیم اُسے میز کے خانہ میں مقفل کر دیتا ہے)

نووارد۔ مجھے اس کے حاصل کرنے کے بعد کوئی بڑا کارنامہ کرنا چاہئے تھا ـــ آپ دونوں کو اس بات کی قسم [illegible] چاہئے تھی کہ مجھے جانے دیں گے ـــ یا آپ کا سب [illegible] پیسہ حاصل کرنا چاہئے تھا ـــ یا کچھ اور۔ مگر مجھے تو [illegible] ہی نہیں کہ یہ کام کیسے کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] طمنچوں سے سخت نفرت ہے . . . اس قدر غل مچ [illegible] سے! اگر سر میں گولی مارنی ہو تو پاؤں پر نشانہ لگانا پڑتا [illegible] ہے نا؟ مجھے یقین ہے کہ میں کسی کو طمنچے سے مار ہی نہیں سکتا

اختر۔ (ایک دم سے) سلیم انہیں ہم جانے کیوں نہ دیں؟

نووارد۔ یا اللہ۔

سلیم۔ (خوش مزاجی سے) ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ اتنی دور جانے سے ہم بچیں گے . . . میرا خیال یہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں اس سے پیشتر کہ میری رائے پھر بدل جائے۔

نووارد۔ بہت اچھا۔ خدا حافظ۔ (کھڑکی کی طرف رُخ کرتا ہے)

سلیم (سنتے۔ (اس کے پیچھے پیچھے کھڑکی کے قریب آکر جیب میں سے کچھ روپے پیسے نکال کر اُسے دیتے ہوئے کچھ خفت و احساسِ ندامت سے کہتا ہے) آپ یہ لے لیں ——— اس سے آپ کو روزگار تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔ بہرحال کوشش کیجئے کہ کوئی کام مل جائے۔

نووارد۔ (روپے کی طرف دیکھ کر سلیم کی طرف دیکھتا ہے) شکریہ . . . کیا میں ایک سگریٹ اور لے سکتا ہوں؟

اختر۔ (دلگیری احساسِ ندامت کے) آپ پورا ڈبہ لے جائیے۔ (اختر ڈبہ اٹھا کر لاتا ہے اور نووارد آگے بڑھ کر لیتا ہے۔

نووارد۔ (ڈبہ لے کر) شکریہ . . . خدا حافظ۔

اختر۔ خدا حافظ۔

(کھڑکی پر پہنچ کر نووارد پلٹ کر آخر سے کہتا ہے)

نووارد میں خوش ہوں کہ آپ نے وقتِ رخصت ہاتھ ملانے کی تجویز نہیں کی ——— یہ حماقت آمیز حد تک بھیشر بکل ہو جاتا۔

(چلا جاتا ہے)

اختر۔ کیا دیا تم نے اُسے!

سلیم۔ کوئی پچاس روپے۔

اختر۔ اچھا!

سلیم۔ میں بڑا بے وقوف ہوں (میز پر جو لیمپ روشن ہے اُسے بجھا دیتا ہے) یہ وقت کا اثر ہے۔ بھلا دو بجے رات کے بھی کسی کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں۔ آؤ۔ میں سونے جا رہا ہوں (کھڑکی بند کر کے پردے کھینچ دیتا ہے ——— کمرے میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں سے اُس کی آواز سنائی دیتی ہے) لوگوں سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ کہہ دیں گے کہ کوئی اُچکا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھاگ گیا۔

اختر کی آواز۔ ٹھیک ہے (ایک لمحے کی خاموشی۔ پھر ایک کرسی کے گرنے کی آواز) توبہ۔ توڑ دیا گھٹنا۔

(سلیم دروازے کے پاس پہنچ کر دیا سلائی جلاتا ہے)

سلیم۔ لو آ جاؤ اب۔

(اختر نکل جاتا ہے۔ سلیم دیا سلائی بجھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کمرے میں گھنٹہ دو بجاتا ہے۔ اندر گھر میں دوسرا گھنٹہ دو بجاتا ہے۔ دور فاصلے سے گھنٹہ گھر کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر زور سے دو بجتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

(ماخوذ از ٹالز بیلیس)

شاہد احمد

رُباعی

اپنی جانِ عزیز اپنی نہ ہوئی
عقل و خرد و تمیز اپنی نہ ہوئی
ہم بھی کچھ اُن کو نہ دے سکے اے امجدؔ
افسوس کہ کوئی چیز اپنی نہ ہوئی

امجد حیدر آبادی

غزل

چشمِ بینا کو حجابِ رُخِ زیبا کیا ہے
فطرتِ حُسن کو اندازِ یہ سوجھا کیا ہے

کبھی سورج ہے کبھی چاند ہے زیبِ گردوں
رات دن سوچ رہا ہوں کہ یہ ہونا کیا ہے

پھول کھلتے ہیں تو کانٹے بھی نکل آتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا کیا ہے

سوچتا ہوں کہ ہے کیا کیا مری آنکھوں سے نہاں
اور میں دیکھ رہا ہوں یہاں پیدا کیا ہے

اپنی آنکھوں پہ تھا انساں کو غرورِ بے حد
اور کہتے تھے ستارے ابھی دیکھا کیا ہے

یہ شکایت ہے کہ تو یاد نہیں ہے مجھ کو!
چاند کو تا بہ سحر دیکھتے رہنا کیا ہے

عندلیبانِ قفس سے کوئی اتنا پوچھو
آخر انجامِ غم و آہ و بکا کا کیا ہے

کوئی ناکامِ تمنا ہی کرے اندازہ
مدعائے دلِ ناکامِ تمنا کیا ہے

بادۂ حال میں ہوں مست مجھے کیا معلوم
دوشِ کار نج ہے کیسا غمِ فردا کیا ہے

خود کہے دیتی ہے ویرانیِ میخانۂ عشق
ساقیا حال ترے بادہ کشوں کا کیا ہے

رونا اس بات پر آتا ہے کہ سوچا کیا تھا
اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہونا کیا ہے

تیری کشتی نے مصیبت میں دیا تجھ کو جواب
ناخدا تیرے خدا کا بھی بھروسہ کیا ہے

میں بھی ان کا ہوں مرا دل بھی نہیں کا ہی ضیاؔ
اب بتاؤ کسے اپنا کہوں، اپنا کیا ہے

ضیاؔ فتح آبادی

رادھا کے گیت!!

(۱)

کوئل گاتے گاتے چُپ ہو گئی!
ندی بہتے بہتے رک گئی!
کلی ہنستے ہنستے رو پڑی!
رادھا پوچھتی ہے "سکھی! ہردے مندر کی مورتی آج
کیوں اداس ہے!!!

(۲)

سکھی!
رادھا کا پریم ابھی ادھورا ہے!!
پورا اُس وقت ہوگا جب رادھا کی آنکھوں سے
آنسو نہیں موت کے سُپنے ٹپکیں گے!
پورا اُس وقت ہوگا جب رادھا کے جیون کا
بن باس ختم ہوگا!
سکھی!
رادھا کا پریم ابھی ادھورا ہے!!

(۳)

سکھی، پریم ناگن سچے ہردوں کو کھا جاتی ہے!!
جل پری ساگر سے نکل کر کنارے پر آئی اور مر گئی!
کنول ساگر کے اندر گیا اور جان دے دی!
سکھی، پریم ناگن سچے ہردوں کو کھا جاتی ہے!

(۴)

ندی بہتی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے!
کلی ہنستی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے!
کوئل کوکتی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے۔
سکھی، وہ پریم ہی کیا جس میں آنسو نہیں بھی اور ختم بھی
جائیں!!!

(۵)

آکاس کی اپسراؤں نے گا کر کچھ گیت،
چندرماں کو دے دیئے!
چندرماں نے وہ گیت اپسراؤں سے لئے،
اور روتے ہوئے تاروں کی طرف پھینک دئے۔
تارے خوشی میں چلّائے "ہمارے گیت ہمیں
مل گئے!!!"
رادھا کا ہردے یہی پکارتا رہا "آہ، میرا گیت
مجھے کیوں نہیں ملتا!!؟"

(۶)

سکھی، جا یہ ہار پریتم کو دے آ
پریم کا یہ ہار رادھا نے اپنے ہردے کے آنسوؤں سے گوندھا ہے!
پریم کا یہ ہار رادھا نے اپنے روپ کی اُداسیوں سے گوندھا ہے!
سکھی، جا یہ ہار پریتم کو دے آ

(۷)

وہ دن دور نہیں!
جب رادھا کا تھکا ہوا جیون،
موت کے سپنوں کا ہار بن جائے گا!!
وہ دن دور نہیں!
جب رادھا کا بے آس من،
موت کے گالوں کا رس بن جائے گا!!
رادھا کہتی ہے "سکھی، میرے جیتے جی خوشیوں
کا چندرماں اب نہیں چمکے گا۔!!!

(۸)

پپیہے کا گیت،
رادھا کیوں سُنے؟
جس کا اپنا ہی گیت بن گیا ہوا پڑا ہے!!
کوئل کا گیت،
رادھا کیوں سُنے؟
جس کا اپنا ہی گیت مرجھایا ہوا پڑا ہے!!

(۹)

رادھا کی آنکھوں میں ایک سپنا آیا
جو رادھا کو رلاتا رہا اور ہنستا رہا
جیون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
اور کہا "دُکھ کی ہنسی جب سپنا بن جاتی ہے تو
سدا ہنستی ہی رہتی ہے!!"

(۱۰)

سکھی،
آج رادھا کا من اداس ہے!!
چندرماں! آج دھرتی پر وہ کرن پھینک جس میں
رادھا کی چتا کا سپنا ناچ رہا ہو!!
کام دیو! آج رادھا کو اپنی ہنس مکھ بان سے تھوڑی
دیر کے لئے مار ڈال!!
سکھی،
آج رادھا کا من اداس ہے!!

عظیم قریشی

فکرِ اقبال

[مندرجہ بالا عنوان سے میں نے نظموں کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہر نظم میں فلسفہ کے کسی خاص موضوع پر کسی مغربی شاعر اور علامہ اقبال کے نظریات کا مقابلہ کیا جائے گا جس سے میرا مقصد علامہ موصوف کے افکار کو واضح کرنا ہے۔ یہ نظمیں "ادبی دنیا" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔ ح۔ ل]

(۱)

"عزم للحیات"

شوپنہار

دنیا فریب و مکر و ریا، درد و رنج و غم! — حرص و ہوا و کشمکشِ "عزم للحیات"!
تسکین جاں ہیں فلسفہ و علم و شعر و فن — ممکن نہیں ہے آہ! مگر ان کو بھی ثبات
فطرت ہے طفل، اور جہاں بلبلوں کا کھیل! — کھلتا نہیں ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات
اندوہِ بے کراں سے عبارت ہے زندگی — شاید کہ بعدِ مرگ بشر کو ملے نجات

اقبال

اے "عزم للحیات" کے معنی سے بے خبر! — آ میں بتاؤں رازِ سراپردۂ حیات
افسانۂ زبونیٔ ہمت ہیں علم و فن — حاصل ہیں فلسفے کا پریشاں توہمات
تیغِ خودی سے جوہرِ ہستی کی ہے نمود — تیغِ خودی سے زندہ حقیقت ہے کائنات

اس تیغ میں ملے گی اماں تجھ کو بالیقیں کیوں ڈھونڈھتا ہے موت میں اپنے لئے نجات

(۲)

"عزم للقوت"

نظمشہ

"عزم للقوت" میں ہے رازِ حیات "علم" میں ہے "عزم للقوت" کا راز
علمِ محسوسات ہے علمِ بشر رُوح ہے بیگانۂ سوز و گداز!

اقبال

"عزم للقوت" جسے کہتا ہے تُو "علم" سے محکم نہیں، عرفاں سے ہے
انتہائے علم ہے علمِ نظر
رازِ یہ مجھ پر کھلا قرآں سے ہے

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر

تعلیم دماغی اور جسمانی تربیت کا ایک سائینس ہے۔ اس لئے اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی کی شخصیت کی تکمیل اور بلند حوصلگی اور اخلاقی جذبات اور خیالات کی تحصیل کے لئے درست تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ انفرادی زندگی کو بکار آمد بنانے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے۔ اس طرح قومی زندگی میں خوشحالی اور خوش نصیبی کی نشو و نما کرنے کے لئے یہ لازمی چیز ہے۔ خصوصاً ابتدائی تعلیم۔ یہ جس قدر ملک میں اندر و باہر پھیلتی جائے گی اور قومیت کے قوام کو درست کرنے والے جتنی اس کی اصلاح کرتے رہیں گے اسی قدر قوم میں بہبود کے آثار نظر آتے جائیں گے اور ملک اخلاقی اور اقتصادی ترقی کی معراج پر پہنچے گا۔

اس وقت میرا مقصد تعلیم پر بحث کرنا نہیں ہے۔ اور نہ اس مختصر مقالہ میں جاپان کی تعلیمی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس لئے عصر موجودہ کی جاپانی تعلیم پر ایک بالکل سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جاؤں گا۔ اور تفصیل کے لئے کسی آئندہ فرصت کا انتظار کروں گا۔

تعلیم پر نظر ڈالنے سے پہلے موجودہ جاپان کی جغرافیائی حالت کا ایک خاکہ پیش کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ہمارا ملک جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جو براعظم ایشیا کے مشرق کی طرف بحرالکاہل میں شناوری کی مشق کر رہا ہے۔ اس کا رقبہ ۶۷۵۱۱۸۰۴۳ مربع کلومیٹر ہے۔ ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کے مطابق جاپان کی کل آبادی ۹۷۶۹۴۶۲۸ ہے۔ یعنی فی مربع کلومیٹر ۱۸۱ نفوس آباد ہیں۔ اس کا پایۂ تخت ٹوکیو ہے۔ جس کی آبادی ۵۸۷۵۳۳۸ ہے۔ شہر اوسا کا دوسرے درجے پر ہے۔ اور اس کی آبادی ۲۹۸۹۸۶۶ ہے۔ علاوہ ان دونو شہروں کے یہاں دو اور ایسے شہر ہیں۔ جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور تیس ایسے شہر ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ سے دس لاکھ کے درمیان ہے۔ اور ۹۳ شہروں کی آبادی بیس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان شمار کی گئی ہے۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے۔ وہ جاپانی زبان ہے یعنی جاپانی زبان ہی ہماری پیاری مادری زبان ہے۔ شاید یہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہ ہوگی کہ تعلیم یہاں اسی جاپانی زبان کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

جاپان میں موجودہ تعلیم کا آغاز ۱۸۶۸ء کے ریسٹوریشن کے بعد ہوتا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں اس تعلیم کے متعلق ضروری قوانین مرتب اور نافذ کئے گئے۔ ۱۸۷۹-۸۰ء میں ان قوانین پر تنقیدی نگاہیں ڈال کر ان میں اصلاحیں کی گئیں اور ۱۸۸۶ء میں جب کہ وای۔ موری وزیر تعلیمات مقرر ہوئے۔ تو موجودہ تعلیم کو ایک خاص معیار پر لانے کی کوشش شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۸۹۰ء میں آنجناب شہنشاہ میجی کی طرف سے ایک مشہور تعلیمی شاہی فرمان جاری ہوا۔ اس شاہی فرمان کو ہم جاپانی بحرِ زخارِ علم و فن کا قطب نما خیال کرتے ہیں۔

جاپانی تعلیم کی چند خصوصیتیں ہیں۔ (۱) یہ تعلیم قومیات اور اخلاقیات کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ (۲) تعلیم اور مذہب کی جدائی یعنی مذہب کو تعلیم میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ (۳) یہاں ہر طبقہ کے لوگ۔ امیر ہوں یا غریب بلا امتیاز تعلیم حاصل کرنے کا مساوی حق رکھتے ہیں۔ برخلاف یورپ اور دوسرے ممالک کے جہاں اعلیٰ تعلیم زیادہ تر دولتمندوں ہی کو حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اس بلا تخصیص تعلیم نے درحقیقت تمام ملک کو حصول علم کے لئے تیار کر دیا ہے۔ اور غریب سے غریب جاپانی اپنی اولاد کو اسکولوں اور کالجوں میں بھیجنے کا شوقین نظر آتا ہے۔

عہد میجی سے پہلے یہاں عموماً تعلیم کا یہ دستور تھا کہ صرف استادوں کے گھر مکتب خانے تھے۔ جہاں علم کے شوقین جا کر لکھنا پڑھنا سیکھا کرتے تھے۔ لیکن ریسٹوریشن کے بعد جب نیا دور شروع ہوا تو تعلیم کا طرز بھی بدلا۔ یورپ اور امریکہ کا طریق تعلیم اختیار کیا گیا۔ عہد میجی کے ابتدائی زمانہ میں ہمارے مڈل اسکولوں میں جغرافیہ۔ ممالک غیر کی تاریخ۔ تحریر اقلیدس۔ جبر و مقابلہ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی تھی۔ لیکن یہ بات اب مدت دراز سے بالکل بند ہو

گئی۔ اور موجودہ زمانہ کی تعلیم میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

جاپان میں علاوہ ہیرز اسکول اور فوجی اکادمیوں کے سب درس گاہیں گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کے ماتحت ہیں۔ ان درس گاہوں میں سے یونیورسٹیوں اور کالجوں اور ہائی اسکولوں کا تعلق براہِ راست محکمۂ تعلیم کے ساتھ ہے یعنی قومی بیت المال ان درس گاہوں کے اخراجات کا کفیل ہے۔ مڈل اسکول صوبہ سے پرورش پاتے ہیں۔ اور پرائمری اسکولوں کا خرچ شہر یا گاؤں سے ملتا ہے۔ جہاں یہ موجود ہیں۔

جاپان میں چھ سال کی ابتدائی تعلیم قانوناً جبریہ ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں آدمی رہتے ہیں۔ خواہ پہاڑی علاقہ ہو خواہ چھوٹا سا جزیرہ بچوں کے لئے پرائمری اسکول موجود ہے۔ جہاں لڑکے لڑکیاں دونو کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

پرائمری اسکولوں میں جونیئر کلاس اور سینیئر کلاس موجود ہیں۔ جونیئر کی چھ سال کی تعلیم قانوناً جبریہ مقرر کی گئی ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کے لئے مڈل اسکول کی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے وہ انہیں سینیئر کلاس میں داخل کرتے ہیں۔ یہاں مدتِ تعلیم دو برس یا کبھی تین برس کی ہوتی ہے۔

پرائمری اسکولوں کی تعداد ۱۹۳۱ء میں ۲۵۶۶۵ اور ان کے استادوں اور استانیوں کی تعداد ۲۳۳۸۶۲ اور شاگردوں کی ۱۰۳۸۱۲۹۰ تھی۔

چونکہ ہمارے ملک کی آبادی برابر ترقی کر رہی ہے۔ اور ہر سال تقریباً دس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ابتدائی مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا رہنا لازمی ہے۔

ہر بچہ سات برس کی عمر کا ہوتے ہی پرائمری اسکول میں داخل کیا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ یہاں شرحِ داخلہ فیصدی کس حد تک پہنچ چکی ہے:۔

پرائمری اسکول جانے والے بچوں کی شرح داخلہ (فیصدی)

	اوسط	لڑکی	لڑکے
۱۹۲۹ء	۹۹.۴۸	۹۹.۴۶	۹۹.۵۱
۱۹۳۰ء	۹۹.۵۱	۹۹.۵۰	۹۹.۵۲
۱۹۳۱ء	۹۹.۵۴	۹۹.۵۳	۹۹.۵۵

ابتدائی تعلیم تو آج اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ایسا جاپانی مشکل سے ملے گا۔ جو اپنی مادری زبان میں معمولی خط و کتابت نہ کر سکے یا اخبار وغیرہ نہ پڑھ سکے۔ یہاں مجھے جاپانی کتب خانوں اور اشاعتِ کتب و رسائل کے متعلق بھی کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اطلاعات کے مطابق جاپان میں ۴۶۰۹ کتب خانے موجود ہیں۔ جن میں کتابوں کی تعداد ۱۰۱۳۸۰۰۰ ہے۔ اور سال بھر میں ۲۴۹۸۰۰۰۰ آدمی ان کتب خانوں میں جاتے ہیں۔ پھر ۱۹۳۳ء کے آخر میں اخباروں کی تعداد ۱۸۶۰ تھی جن میں روزانہ اخباروں کی تعداد کل کے دسویں حصے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور عام کتابوں رسالوں کی تعدادِ اشاعت بھی ۱۹۳۳ء میں دنیا بھر میں تیسرے درجے پر تھی۔

پرائمری اسکولوں کے استادوں اور استانیوں کو تعلیم دینے کے لئے مردانہ اور زنانہ نورمل اسکولوں کی تعداد ۱۹۳۱ء میں ۱۰۴ تھی اور علاوہ ان کے یہاں دو مردانہ اور دو زنانہ ہائیر نورمل کالج ہیں۔

مردانہ اور زنانہ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۵۳۸ تھی۔ ان مڈل اسکولوں کی معلمی ان لوگوں کو دی جاتی ہے۔ جو ہائیر نورمل کالج یا دوسرے کالج اور یونیورسٹیوں کے فارغ التعلیم ہوں۔

چھ برس کی پرائمری تعلیم کے ختم ہونے پر لڑکے مڈل اسکول اور لڑکیاں زنانہ مڈل اسکولوں میں داخل ہوتی ہیں۔ مردانہ مڈل اسکول کی مدتِ تعلیم پانچ برس اور زنانہ مڈل اسکول کی چار سال یا پانچ سال کی ہوتی ہے۔ مڈل اسکولوں کو چھوڑنے کے بعد لڑکے یا تو ہائی اسکول چلے جاتے ہیں یا کسی تجارتی صنعتی یا زراعتی کالجوں کے داخلہ کا امتحان دیتے ہیں۔ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں مدتِ تعلیم تین سال کی ہوتی ہے۔ لیکن بعض کالجوں میں یہ کورس چار سال کا بھی ہوتا ہے۔ جو طالب علم ہائی اسکول کی عموماً تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے داخلہ کا امتحان دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تعلیم کے مختلف شعبے موجود ہیں۔ مختلف نصابِ تعلیم کی تکمیل کے لئے عام طور پر تین برس صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اور جو ڈاکٹری کی سند حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چار سال تک وہاں رہنا پڑتا ہے۔

لڑکوں میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو پرائمری اسکولوں کو چھوڑنے کے بعد تجارتی یا صنعتی یا زراعتی مڈل اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو عام طور پر چار پانچ سال تک رہنا پڑتا ہے۔

بعض لڑکیاں مڈل اسکولوں کو چھوڑنے کے بعد زنانہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چلی جاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل فہرست سے غالباً درسگاہوں اساتذہ اور طلباء کی تعداد معلوم ہو سکے گی:۔

درسگاہوں کی فہرست ۱۹۳۱ء

	درسگاہیں	اُستاد	شاگرد یا طالبعلم	فارغ التعلیم
پرائمری اسکول	۲۵۲۲۵	۲۳۳۸۶۲	۱۰۳۸۱۲۹۰	۱۹۴۱۶۸۵
زنانہ و مردانہ نورمل اسکول	۱۰۴	۲۵۲۵	۳۸۸۲۸	۱۱۰۳۳
مردانہ ہائیر نورمل کالج	۲	۱۸۸	۱۸۴۴	۴۰۲
زنانہ ہائیر نورمل کالج	۲	۱۱۱	۸۵۰	۲۰۳
مردانہ مڈل اسکول	۵۵۸	۱۳۸۰۲	۳۳۶۱۸۶	۵۹۱۵۷
زنانہ مڈل اسکول	۹۸۰	۱۵۲۵۷	۳۶۲۶۲۵	۸۸۳۴۵
ہائی اسکول	۳۲	۱۴۴۱	۲۰۸۴۴	۵۸۳۰
یونیورسٹی	۴۵	۵۹۸۴	۶۹۹۸۵	۲۰۱۸۲
مختلف کالج	۱۶۳	۷۱۲۷	۸۹۸۶۵	۲۳۱۵۱
بخاری صنعتی زراعتی کالج	۱۰۰۳	۱۵۲۱۳	۲۹۲۰۱۵	۷۲۳۱۶
بخاری صنعتی زراعتی سپیشل اسکول	۱۵۰۸۳	۲۰۳۵۱	۱۲۷۱۹۷۱	۴۳۳۴۵۳
اندھوں کے مدرسے	۷۷	۶۲۵	۴۵۵۰	۱۰۲۹
بہروں گونگوں کے مدرسے	۵۹	۵۰۰	۴۱۴۴	۵۸۳
باقی مختلف درسگاہیں	۱۹۹۲	۱۶۷۹۵	۱۹۸۸۱۵	۱۶۷۱۹۹
میزان	۴۵۷۶۵	۳۳۳۷۷۹	۱۳۰۷۳۸۵۴	۲۸۲۴۵۶۸

علاوہ مندرجہ بالا مختلف اقسام کی درس گاہوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے کنڈر گارٹن موجود ہیں۔ محکمۂ تعلیم کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۳۱ء میں ۱۶۲۲ کنڈر گارٹن موجود تھے۔ جن کی استانیوں کی تعداد ۵۰۱۲ اور بچوں کی ۱۲۶۵۶۴ تھی۔

اب میں فیس کے متعلق کچھ بیان کروں گا۔ کنڈر گارٹن میں تقریباً تین این سے لے کر پانچ این ماہوار فیس ہے۔ چونکہ چھ سال کی پرائمری تعلیم قانوناً جبریہ ہے۔ اس لئے پرائمری اسکولوں میں کوئی فیس نہیں ہوتی۔ مڈل اسکولوں کے لئے تقریباً پانچ چھ این سے لے کر نو دس این ماہوار اور ہائی اسکولوں اور کالجوں کے لئے تقریباً اسی پچاسی این سالانہ اور یونیورسٹیوں میں تقریباً ایک سو این سے لے کر ایک سو پچاس این سالانہ تک فیس ہے۔

گورنمنٹ اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس میں کسی قدر فرق ہے۔ چونکہ پرائیویٹ درس گاہوں کے لئے عموماً گورنمنٹ کی طرف سے مالی امداد نہیں ملتی۔ اور ان کو فیس ہی پر اپنے مدرسوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کو فیس زیادہ لینی پڑتی ہے۔

مندرجہ بالا مختصر بیان سے ہمارے معزز دوستوں کی معلومات میں جو جاپان کے متعلق ہیں۔ اگر تھوڑا سا بھی اضافہ ہونے کا موقع ہوگا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

آخر میں جناب منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے حقیر مضمون کو اپنے قیمتی رسالہ میں جگہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

آر۔ گامو (جاپانی) بمقام دہلی

قطعہ

مری جاں پر بنی ہے کاہشِ دردِ محبت سے
مرے اللہ دُہائی ہے مرے اللہ دُہائی ہے

مجھے غم دے الم دے رنج دے دے سب زمانے کے
اٹھائے اُٹھ نہیں سکتا کہ یہ رنج جدائی ہے

جلال الدین اکبر

بہار

پھر بہار آئی ہُوا تازہ فسونِ کائنات
ذرہ ذرہ ہے نمودِ ذوقِ تجدیدِ حیات

آسماں سے پھر نزولِ بارشِ انوار ہے
ایک عالم نغمہ ریز اور اک جہاں گلزار ہے

رقص سے زہرہ کے گونج اٹھا فرازِ کوہسار
پھر ہوا ہے حسنِ عالم سوز، ہمرنگِ بہار

پھر ہوئے روشن ستارے کرکِ شب تاب سے
پھر نئے نغمے ہوئے پیدا نئے مضراب سے

پھر ہوئی رقصاں رگوں میں موجِ خونِ زندگی
چھا گئی ہے پھر فضا پر تازگی ہی تازگی

پھر جنوں نے کر دئے جیب و گریباں تار تار
ہے قیامت عالمِ جذبات کی رنگِ بہار

اٹھ رہے تھے ولولے نومیدیٔ جاوید سے
مرتعش تھا دل کسی موہوم سی امید سے
آتشِ تخئیل میرے قلب کو گرما گئی
برگ و گل بن کر مرے اجڑے چمن پر چھا گئی
لرزشیں پیدا ہوئیں میرے شکستہ ساز سے
نغمہ ہائے شوق جاگ اُٹھے مری آواز سے

حمید عرفانی ایم اے

جھکی جھکی آنکھیں

عذرا ان عورتوں میں سے نہیں جن کی رگ رگ سے پیامِ زندگی چھلکتا ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جن کی رگ رگ میں پیامِ زندگی شلگتا ہے۔ جن سے وصال میں بھی تکمیلِ حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے یا جنہیں میٹھا سا اضطراب پریشان کئے رکھتا ہے جو دلخراش حقائق سے دور دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے۔ مگر عذرا میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ حساس سی ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران سی موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کی حیران سی خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوتِ تکلم کا بیشتر حصہ سلب کر چکی ہیں خدا جانے کونسی دنیا میں رہتی ہیں بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا سا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے بلکہ کسی وقت مجھے شبہ سا ہوتا ہے کہ یہی ہلکا سا خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذرا کچھ بُن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف سا احساس ہوگا کہ بیشک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھا کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو . . . میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کروگے۔ اس وقت مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذرا مجھ سے کوسوں دور ہے اور یقین نہیں پڑتا کہ وہ ہے بھی یا نہیں یا زندگی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گم ہو جاتی ہے یعنی میں پریشان سا ہو جاتا ہوں۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ یہیں سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر اُن دنوں اس کے انداز میں کچھ یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اس کی نگاہ میں چھٹپنے ہی سے تھیں شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی۔ مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہوگئیں اور اب وہ حیرانیاں نرمی سے بھیگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانکے رکھتی ہیں۔

اُن دنوں جب وہ سکول سے لوٹا کرتی تھی تو اس کے انداز میں ایک بیگانہ روی سی پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹک جاتی یا اس کی آنکھ میں ایک ہلکا سا تبسم لہرا جاتا جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اُسے زندگی میں دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے انداز میں ایسی "بیگانہ روی" پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطۂ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہئے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداریاں دیکھنے کے کیوں متحمل نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے بچے نمی کلیوں کی طرح سوئے ہی رہیں اور شاید اسی طرح سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں اس لئے یا تو وہ اپنے بچوں میں بیداریاں نہ دیکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور یا بیداریاں پیدا ہونے ہی نہیں دیتے۔ عذرا کے والد موحرالذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کو بہت تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے متعلق وہ اپنے آپ کو بہت بدقسمت سمجھتے تھے۔ انہیں یہ گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کو شادی کے بعد جلد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے۔ اُن کی آرزو تھی کہ انہیں کوئی ایسی بیوی ملے جو گوناگوں ہموار ان کا ایمان تھا کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں ایسی عورت موجود ہے اس لئے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کا عام ہو جانا اس کی بدذاتی کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق وہ اکثر سوچا کرتے تھے۔

"انجنیر صاحب کی بیوی کو دیکھئے۔ اس کی آنکھوں میں بیسیوں نگاہیں ہیں۔ ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اُداسیوں میں تو کبھی سرخیوں میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی "ہم تمہیں جانتے ہی نہیں" اور کبھی "اب کیسے مزاج کیسے ہیں" کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی اور تنا بدلتا رہتا ہے۔ کبھی گلابی اور کبھی گہری گہری۔ گدری گدری، میلی میلی۔ یہ جو پڑوس میں مسٹر ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اُسے کس قدر ملکہ ہے۔ اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و پیچ مضطرب رہتے ہیں۔ ایک وہ عذرا کی ماں کو دیکھ جاتی تو گھنٹوں الھنا لحال ہو جاتا۔ بس دن بھر آہ ہی بھرتی رہتی تھی اور پھر وہ زہرہ تھی کہ ایک مرتبہ ساڑی کے لئے بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھ رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصے تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔"

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی۔ مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمۂ اجل ہو گئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ پیدا ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو وہ عام طور پر باہر ہی ٹھیک میں بیٹھے رہتے۔ جب کبھی وہ اندر آتے تو عذرا کو کوئی نہ کوئی نصیحت کرنے کے عادی تھے۔

"عذرا دوپٹہ سنبھالو ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا"یا

"حشمت! وہ گلی والی کھڑکی بند کر دو۔ عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں"یا

"عذرا تم مسز ملک کے ہاں زیادہ آیا جایا نہ کرو۔ لڑکیاں اپنے گھر ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں"۔

اور جواب میں عذرا نے کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا تھا۔ وہ خود بھی اس سے زیادہ بات چیت کرنے سے گھبراتے تھے۔ جوان بیٹی سے باپ کے لئے از حد مشکل ہو جاتا ہے۔ خدا جانے وہ عذرا سے ڈرتے تھے یا اپنے آپ سے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال ہی نہ آیا تھا اور نہ انہوں نے عذرا کو کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ چونکہ دو بیویوں کے میاں رہنے کے باوجود وہ ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے اس لئے ان کے دوست انہیں زینت محفل سمجھتے تھے۔ باہر دیوانخانے میں اکثر جمگھٹا رہتا اور قہقہوں سے در و دیوار گونجتے رہتے۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا سکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنی محبوب نیلی ساڑی پہنے بال بنا رہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر نہایت تشکیں انداز سے کہنے لگے۔

"عذرا۔ آج سے تم سکول نہ جایا کرو۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں"۔

"مگر ابا امتحان" عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے بدلتا ہو رہا تھا۔

"مگر وگر کوئی نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "امتحان دینے کی کچھ ضرورت نہیں"۔

ایک ساعت کے لئے عذرا کی آنکھیں اٹھیں، شعلے کی طرح چمکیں، مگر اُس کے والد جا چکے تھے۔ حشمت نے اُن آنکھوں کو دیکھا اور اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھرتھرا رہا ہو۔ پھر وہ جھک گئیں دو موٹے موٹے آنسو اُس کے رخساروں سے ڈھلک کر اس کی ساڑی میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھٹکے ہوئے کسی نے نہ دیکھا اور اسے بیگانہ روی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھڑی ہوئی سی کھڑی رہتی۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پڑھوا کر اُسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ عذرا کی بیداریوں کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا کہ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان چند ایک ساعت کے لئے ان خاموش مہیب چٹانوں میں اُبھر اُبھر کر ان خاموشیوں کے سکون کو اور بھی خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلق خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے چہ گوئیاں ہوئیں دبی دبی آوازیں اٹھیں۔ مگر آواز دبنے کی نوبت نہ پہنچی ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کو کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرحدار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلے والیاں اس سے کینہ توزی کریں۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشتر کریں۔ بلکہ وہ تو اُن کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان نگاہوں کی قدردان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجینئر کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آوازہ

کسنے میں بلکہ تھا ان کو تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول ڈھمکا نہ چھم چھم نہ تاک نہ جھانک، نہ تو قمیں ہیں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریب سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو "سہیلی" بن کر جائیں، حنا مالیدہ ہاتھ ہوں، جھلملاتی ہوئی ساڑیاں ہوں، کاجل رسیں، بندیاں چمکیں، پلیٹوں سے چولیاں بھیں، پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آنکھ تو گھونگٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ لٹ جھٹک کر منہ پر آگرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی، گوری گوری حنائی انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں۔ باریک تہوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید باہیں گھونگٹ سے نکل کر کچھ دیں کچھ لیں یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

مگر کچھ نہ پوچھئے۔ آخر خلق خدا خلق ہی ہے اور بات بات ہی ہے۔ سونگل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا "کسی سے آنکھ لڑ گئی ہوگی"۔ کوئی کہنے لگی "لو اب تو ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی" کوئی کہنے لگی "سنا ہے اس کے ابا نے خط پکڑ لیا"۔ کوئی بولی "ایدی بی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ دفتر سے آ رہے تھے۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لئے بیٹھا تھا۔ توبہ کیسا زمانہ آیا ہے۔ غرضکہ کئی باتیں نکلیں۔ بلکہ کونسی بات تھی جو رہ گئی۔ مگر دبی دبی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ لوگوں کے لئے تو بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر شاید عذرا کے لئے بات ہی بات رہ گئی اور وہ خود آئی گئی ہو گئی۔

اُس بے چاری کا صرف یہی قصور تھا کہ وہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بُت کا شبہ ہوتا۔ اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اُس بت کو دیکھ کر ایک سویا ہوا مصور بیدار ہو جائے اور اُسے اُس بُت میں محو کر دے... اس مصور کے پریشان کن عزم و خوض کو نس نس میں محسوس کر کے عذرا کی پلکیں اٹھیں، دو موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں نظر بھر کر دیکھ لیں... مصور کی جگہ کسی کی رگ رگ میں ایک بجاری جاگ اُٹھے تو عذرا کا اس میں کیا قصور؟ ہاں سکول کی ویران سی سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پوری تفصیلات سے تو مجھے واقفیت نہیں۔ ہاں سلیم کا اونچا لمبا قد اور فراخ شانے اور اس کا انداز بے نیازی اس امر کا شاہد ہے کہ اُسے تانک جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے۔ غرضکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں۔ چند دن تو صبح ۶ بجے وہ روز اُس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا۔ پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا سکول کے پھاٹک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم آکر اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر اُسے ایک طرف لے گیا اور اُسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟ "تمہارا کیا نام ہے؟"... "تم بولتی کیوں نہیں"... "اچھا" اُس نے عذرا سے جھنجھوڑ کر کہا "تم چاہے کوئی بھی ہو۔ تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا"۔ اور بیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اُسے کیا کرنا چاہئے سلیم جا چکا تھا۔ پھر اُسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے آنے کے لئے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھاٹک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا ٹھہرنا پڑا بھی تھا یا نہیں۔ اُس روز اُس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اُس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا۔ اُسے اُس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہیں آتا تھا مگر اُس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے، اور اُس کے شانوں پر ایک لذیذ سا درد دہر رہا تھا۔

وہ اُس روز اپنے سفید طوطے سوّلی سے کہہ رہی تھی "سوّلی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا کوئی بھی" وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ پھر اُس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اُسے گدگدا دیا۔ وہ ہنس پڑی "کیوں سوّلی ہے نا"

اُس کے بعد اُن کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دو چار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس سلیم ہمیشہ کے لئے اس کے لئے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش چند ایک دل کی پر کیف دھڑکنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور دل اور سینے کی چند مبہم سی تھرتھراہٹوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا جس قدر یہ نقوش منتشر اور موہوم سے تھے۔ شاید اُس کے دل میں اُن کے متعلق حسیات اُسی قدر گہری اور مضبوط تھیں۔

گاڑی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ ایک درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی وہ جا رہے تھے۔ مگر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ سمجھتی تھی کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ جیسے قدرت اُسے چھیڑنے کے لئے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پھیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے ہیبت ناک دیو نما کھمبے گرد سے اٹے ہوئے کسالوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھٹھکنوں میں کوئی "گلیوتن" آن کھڑا ہو۔ سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اُس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا اُن جھلسے ہوئے بہاڑوں کے تسلسل میں، ایک دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اُس ٹیلے پر سلیم کھڑا اُسے بلا رہا تھا یا اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ دور سڑک پر جو لاری جا رہی ہے اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اُس کے شانے کوئی نا معلوم گرفت محسوس کرتے اور وہ سنتی "تم میری ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا" اور وہ ٹھٹھک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سوتی اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں۔ مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں۔ اُس کے برعکس سوتی کی آنکھیں پرنم سی معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے۔ مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "سوتی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے" اُس وقت غالباً یہی مرتبہ اُس کے دل میں سوتی کو آزاد کرنے کی خواہش محسوس ہوتی۔ ہاں۔ خدا جانے کتنی بہاریں اُس نے اِس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اُس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اُس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے؟" پھر اُس نے سُنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ماں پوچھ رہی تھی۔ "بیٹی عذرا۔ نذر پوچھتا ہے۔ کچھ ہو گی؟" . . . دیکھو ناکس قدر گرمی ہے!" . . . تمہیں ضرور پیاس لگی ہو گی کیوں بیٹی؟" اُس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ اُسے کنکھیوں سے بھی اُدھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اُس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اُس کے شانوں سے پکڑ کر اُس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا . . .

اس نے یوں محسوس کیا جیسے میلوں سے کوئی کہہ رہا ہو۔ "نہیں اماں تم کہو تو۔ دیکھو کس قدر گرمی ہے!" اُس بھدی سی آواز میں کس قدر اُداسی تھی۔ ہاں اگر سلیم اس سے پوچھتا۔ اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی۔ مگر سلیم۔ سلیم خدا جانے کہاں ہو گا۔ خدا جانے اُسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید وہ اپنی بیچاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو۔ شاید ان رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی۔ مگر اُس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ "نہیں نہیں یہ الزام ہے۔ سلیم ایسا نہیں!" پھر وہ اُداسیوں بھری متبسم آنکھیں اُس کے سامنے معلق ہو جاتیں۔ نہیں وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں۔ شفقت سے لبریز ہیں۔ اُس کے دل میں یقین سا ہو جاتا۔ "وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا وزنہ وزنہ چھان مارے گا۔ شاید وہ اسی گاڑی میں ہو" . . . "کہیں وہ بیمار نہ ہو!" وہ ایک جھرجھری سی محسوس کرتی۔ "نہیں وہ بیمار نہیں۔ بس نہیں"۔ عذرا اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں۔ وہ سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر اُن شانوں پر جھک جاتی "چاہے کچھ بھی ہو اب مجھ کو تم سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا . . . کوئی بھی نہیں!"

اُس کی ساس نے اُسے کمرے میں ایک وسیع پلنگ پر بٹھا دیا۔ کمرے میں دھندلی سی روشنی تھی۔ تمام مکان سنسان سا محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں۔ مگر چند منٹ ٹھہر کر چلی گئیں۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیمپ اس قدر روشن نہیں معلوم ہوتے تھے، اور اندھیرا تھا۔ مگر اُس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے وہ سلیم کے انتظار میں بیٹھی ہو۔

دور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اُداس سا کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔

اُس کے چہرے پر پریشانی کی گھڑیاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ سلیم کی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا حسین خواب تھا۔ اُس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اُس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اُس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یک لخت باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی "پہاڑی" کی تان اُس کے کان میں پڑی تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لئے پہاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے سامنے سکول والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھی۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اُس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی ٹکٹکی . . . .

اس کے بند بند میں ایک نامعلوم سا درد ہو رہا تھا۔ سوّلی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سوّلی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے ایک ٹوٹے ہوئے سٹول پر ٹیک رکھے تھے اس کا منہ عذرا کی طرف مڑا ہوا تھا جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک تبسم سا تھا جیسے کوئی خواب میں اُسے گدگدا رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی اور روپہلی سی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی۔ "نذر! نذر" نذر کی ماں بلا رہی تھی۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک اضطراب سا چھا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں عذرا پر آن جمیں۔ پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔ "آیا ماں" کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کو دیکھنے کا شوق تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لئے جوانی کے دن چند ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے۔ عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ مگر کوئی دبی ہوئی آہ اس مسکراہٹ کو اُداس بنا دیتی۔ وہ شوق سے آتی مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتی جس طرح کوئی اپنے گزشتہ زندگی کے کسی دلنشین واقعے کو یاد کرکے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر ایک کسک سی محسوس کرتا ہو اور اپنے گرد ایک اُداس اور لٹی ہوئی دنیا دیکھتا ہو۔ دو ایک جوانیوں سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں لچکتی ہوئیں۔ مٹکتی ہوئیں۔ مسکراتی ہوئیں۔ "ہم جاتے ہیں" کی سی مسکراہٹیں بس یہ ظاہر داری رہنے دو" . . . . ابھی تو اس نحوسی کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئیں۔ بنتی سنورتی، ٹہلتی ہوئیں۔ مگر عذرا اپنی تنگی میں گم صم تھی۔ جب کوئی نووارد اس کا منہ دیکھنے کے لئے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی۔ پھر اُسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھتا۔ یا کبھی کبھار سوّلی کی چیخ اُسے اپنی لٹی ہوئی خوابوں سے بیدار کر دیتی اور اُسے احساس ہوتا کہ وہاں صرف سوّلی ہی ایک ایسا متنفس ہے جو اس کے دل کی کیفیتوں سے واقف ہے۔

سوّلی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اُسے از سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کرکے بار بار چیختا۔

شام کے وقت نذر نے سوّلی کا پنجرا عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سوّلی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سوّلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ میں ایک ہلکی سی چمک آ گئی۔ صرف سوّلی ہی اس کا راز داں تھا جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ "تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ عذرا! کچھ تو کھاؤ۔ اماں نے تمہاری اتنی منتیں کی ہیں!" اُس نے دھیمی سی منت بھری آواز میں کہا۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ عذرا . . . اور تم اس کی ملکہ ہو۔ اس کا حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا۔ اُس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "عذرا! عذرا تم چپ کیوں ہو؟" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی زبان کہنے والی زبان نہ تھی۔ مگر اس کا ہاتھ ایک خاموش اور مدھم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھدا سا گرم ہاتھ اس کی قوتِ گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے ذرے ذرے سے سنا اور اس کی تمام قوت سلب ہو گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اسے اپنا آپ حوالے کرنے پر مجبور کر رہی تھی کوئی نامعلوم مطلوب لہر اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ اس کی نس نس میں رچنے جانیکی خواہش

لہرا رہی تھی۔ صرف دماغ کا کوئی نحیف سا حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھا رہا تھا جس طرح ڈوبتا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بت سی بنی بیٹھی تھی۔ اس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی۔ اس نے ایک مخمور وضع لکھے میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم سا تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ شوخ تھا۔ بلا کا شوخ . . . اس کے دل میں خواہ مخواہ یہ آرزو پیدا ہوگئی کہ وہ بھاری ہاتھ متحرک ہو جائے۔ اس میں آرزو بھڑک اٹھی کہ اُس کی اپنی تمام قوت، شوخی، زندگی اس گھڑی کے لئے اس بڑے بھدے سے ہاتھ اور اُن مضبوط بازوؤں میں منتقل ہو جائے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اُس بھدے ہاتھ کے لئے منتظر تھا، بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم سی محسوس کر رہی تھی اور پریشان سی تھی مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھے . . . عذرا اپنا آپ سنبھال نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا ہو۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آ کھڑا ہوا . . . "تم ہو سلیم! . . . مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" اس کے شانے جھک گئے۔ اس کا سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط باہیں اس کے گرد آ پڑیں . . . وہ سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لئے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا رقمیں چھوڑ مرے تھے۔ وہ عذرا کے بہت گہرے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے کہیں اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی نیچی نگاہوں اور اس کی الٹی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنی خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازۂ ہستی پریشان کرنا ہے۔ ایک مرحوم دوست کے تلاش لڑکے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اُسے یقین نہ پڑتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور اسے احساس ہوگا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدہوش کن خوابیں ان لاتعداد ہی فائلوں کے سامنے کس قدر جھیلنی پڑتی ہیں۔ مگر خدا جانے یہ بھی فطرت کی ایک ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب حسرت کا اس کی تھی۔ نذر کے لئے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو صرف غیر متوقع خوشی کی ہم رکاب ہوتی ہے۔

اس کی خواہشات میں جو صرف زندگی تک محدود تھیں۔ ساڑیاں جھلملانے لگیں۔ پھول مہک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکاریں نغمہ زن ہو گئیں۔ . . . عذرا کے لئے ایک حسین نازک سی چیلی ہو۔ عذرا کے لئے ایک نقدِ آدم آئینہ ہو۔ . . . عذرا کے لئے شربتی ریشم ہو۔ عذرا کے لئے . . ."

عذرا اُس کی خواہشات میں بھنور بن کر آئی تھی۔

اُس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹائپ خرید لیا تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے اور اس کی خاموشی ایک حسرت بھری تشویش ہے۔

عذرا کو پہلی مرتبہ نیلی ساڑی میں دیکھ کر نذر کی آنکھوں میں ایک مخمور چمک سی آ گئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے غسل خانے میں یا کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ نذر کی جرابوں پر آن ٹھیریں۔ "بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو۔" اس نے کہا "دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں۔ لاؤ میں انہیں دھو دوں۔"

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو پہنی تھیں۔" "نہیں بیٹا نہیں" ماں نے اصرار سے کہا۔ "کیا ہرج ہے۔" جرابیں لے کر ماں چلی گئی کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عذرا یہ نیلی ساڑی تو تمہیں بہت زیب دیتی ہے۔ میری طرف دیکھو نا۔ عذرا۔"

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا۔ عذرا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ "ہاں" اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ اُن کو بھی یہ نیلی ساڑی بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہے تھے۔ کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی۔ عذرا تمہیں نیلی ساڑی کیسی زیب دیتی ہے اور کس پیار سے اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ عذرا وہ کرو گے تم ہمیشہ یہ نیلی ساڑی پہنا کرو گی۔ میرے لئے ہی۔ میری خوشی کے لئے۔ زندگی کے لئے اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے . . .

اُس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ سا محسوس کیا۔ سوئی کی چبھن نے اُسے

بیدار کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سوتی کے پیچھے کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سوتی سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی۔ "تم میرے ہو نا سوتی؟" وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سوتی ہی ایک ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لئے اس کو بولنے کی ضرورت نہیں۔

"انہیں نیلی پسند تھی نا سوتی؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے۔ تم اس نیلی کو جانتے ہو نا!۔ اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے۔ اُن کے پیار کی سانسیں ہیں۔

اُن پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لئے توڑ کر لایا کرتے تھے۔ اس نیلی کے ڈھیلے تاروں سے اُن کی نگاہیں گزرنے کی کوشش کیا کرتیں۔ کیوں سوتی۔ تم جانتے ہو نا؟ . . . مگر تم نہیں جانتے تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ تم انہیں جانتے تو سمجھتے کہ نگاہیں کس طرح آغوش میں اٹھا لیتی ہیں . . . نگاہیں کتنی دور دیکھ سکتی ہیں۔

. . . یہ نیلی اُن کی نگاہوں میں حائل نہیں ہو سکتی تھی . . . اور سوتی ان کے پگلے ہاتھ بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ باہیں . . . اس کے کندھوں کے گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اُس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے چھٹک دیا . . . وہ اپنے دل کی دنیا میں تھی۔

یوں ہی دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔ مہینے گزر گئے۔

یوں تو رہنے کو عذرا اُس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اُس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دور بین ہو گئیں۔ وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھکی ہوئی مژگاں پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی اُن نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی۔ گو نذر اُن کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا مگر کبھی کبھی اُن نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اُسے ایک ڈر سا محسوس ہوتا۔ مگر شاید وہ ہلکا سا ڈر اُن نگاہوں کو نذر کے لئے اور بھی جاذب بنا رہا تھا۔ عذرا جب کبھی اپنی دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ کالی کالی حیران آنکھوں کو ایک حیا بھرے تبسم سے نیچے جھکا لیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لئے پیامِ حیات بن جاتا۔ اس کی نس نس میں محبت کا راگ گونج جاتا۔ وہ اس حیا سے لبریز تبسم کے لئے اپنی زندگی اپنا آپ، سبھی کچھ دے دینے کے لئے تیار تھا۔ پھر اس کی نظر نیلی ساڑھی پر جا پڑتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی تھی۔ اُس میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ وہ سوچتا دیکھو یہ کتنی جگہ سے پھٹ رہی ہے، بوسیدہ ہو چکی ہے، چمک نہیں، پھر بھی عذرا اُسے میرے لئے پہنے پھرتی ہے۔ اس لئے کہ میں اُسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لئے۔ حالانکہ اُس کے پاس وہ سُرخ ساڑھی بھی تو ہے۔ بلکہ وہ سُرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ۔ عورت کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

. . . ہندوستانی عورتیں . . . وفا کی ننھی دیویاں . . .

اور اُس کی جھکی جھکی آنکھیں کس قدر حیا سے لبریز ہیں۔ پیاری پیاری کالی کالی آنکھیں . . . دھیمی میٹھی سی نگاہیں۔ خوابیدہ سا انداز . . . کبھی میری طرف بھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا . . . پڑھی لکھی ہونے کے باوجود دنیا کی نام کو نہیں۔ کوئی زیبائش کوئی انداز نہیں . . . لنگ نہیں۔ منک نہیں . . . اور نیلی ساڑھی تو اُسے بہت ہی بھلی لگتی ہے۔

"مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں۔ گو نذر رام کہہ رہا تھا۔ ایسی ساڑھی چالیس روپے کو ملے گی۔ چالیس روپے!! ساڑھیاں بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں . . . " اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ کے سامنے جا بیٹھتا۔ اُس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا، جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھے گی۔ خوشی بھری، تعجب بھری، محبت بھری نگاہ، اُس لمحہ بھر کی نگاہ حاصل کرنے کے لئے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لئے تیار تھا۔

عذرا اُس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا۔ بلکہ وہ نذر کی وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ تھی۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی۔ باقی خط و خال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لئے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے، کوسوں۔ دن بھر وہ سوتی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس

پہنچنے کے لیے اُسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا ماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ کوئی اجنبی عورت آکر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر ماں جب اندر نماز پڑھنے کے لئے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں ایک لفافہ ہو، کاغذ کا گولا سا رکھ دیا اور اس کی مٹھی بند کر دی اُس نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "یہ انہوں نے دیا ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں"

پہلے تو عذرا حیرانی سے اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اُس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر سا پیدا ہو گیا۔ مگر وہ عورت جا چکی تھی۔

غالباً وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی، اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو چکی تھی کہ اُسے کسی چیز جلد گئے سلیم کا انتظار تک نہ رہا تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذاتِ خود اس وقت اُس کے سامنے آ موجود ہوتا تو اُسے بیگانہ سا محسوس ہوتا یا شاید اُسے سلیم پر کوئی توقع نہ رہی تھی۔ بہر صورت اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لفافہ کس کا تھا۔ بلکہ اُس کے دل میں اُس لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ سخت پریشانی سی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ اٹھ بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی۔ صحن میں آئی . . . . اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لئے یہاں وہاں گھوم رہی ہے جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے ڈر کو محسوس کرتے ہوئے پرندے ان کالی کالی اُداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ اپنی مٹھی میں اُس کاغذ کے گولے کو بھینچ بھینچ کر محسوس کر رہی تھی۔ اسے دبا رہی تھی مسل رہی تھی۔ شاید وہ اپنے موہوم خوف کے احساس کے جذبات میں اسے بھینچ رہی تھی یا شاید اُس کی یہ خواہش تھی کہ اس کو بھینچ بھینچ کر نابود کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے . . . .

اس کا سر گھوم رہا تھا . . . اُس نے اپنے آپ کو اپنے ٹرنک کے سامنے بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفافہ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اُس نے کھولے ہوئے انداز سے اُسے پھاڑ کر کھولا . . . اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں۔ جیسے کہ وہ مضمون کو دل سے سمجھنا نہ چاہتی ہو جیسے کہ وہ اس مضمون کو سمجھنے سے ڈرتی ہو اور اس مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے جانے پر مُصر ہیں اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو۔ "بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا"۔ وہ بھاگتی بھاگتی پھر رہی تھی۔ مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا اس پر غلبہ پا رہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی . . . جانا! چلے جانا! . . . اس کا دل کانپ اٹھا . . . اُس کے دماغ میں ایک خلا سا کھول پڑا۔ اُس کے ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا . . . اس وقت کائنات اس کے لئے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کوئی اور کئی خوفناک شکلیں اُس کی خوابوں میں گُھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی شکلیں ڈراؤنی۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا "کیا ہے عذرا؟" اُس کا چہرہ فکر اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا "آج تمہیں کیا ہے۔ تم ہمارا تو نہیں"۔ عذرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے میلوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ "ہاں وہ عورت . . . آئی تھی۔ دوپہر کو . . . اس نے وہ خط . . . اُن کا خط . . . سلیم کا . . . وہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں"۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ نذر کس سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کا سر کسی کے شانوں پر جا ٹکا۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا۔ مگر وہ سر نذر کے شانوں پر بھی نہ تھا۔ خدا جانے تکیے پر تھا یا پتھر پر . . . مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نذر کو اور بھی فکرمند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی

خواہشات ایک دوسری سے جھگڑ رہی تھی۔ ایک حصہ سوکی کی شکل میں کہہ رہا تھا۔ تم ان کی ہو عذرا اور اب اُن سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ ایک فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ عذرا تم بیمار تو نہیں۔ تمہیں کیا ہے عذرا" دو بھدے بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے، "تم آنکھیں جھکا لو عذرا تمہاری دنیا تو ہمارے پاس ہے"۔ سامنے سیکم کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ "ڈراونی ہنسی۔ پیاری ہنسی . . . "؟

شام کو وہ سوکی سے کہہ رہی تھی۔ سوکی تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کیا کرو گے؟ مجھے بُرا تو نہیں کہو گے سوکی؟ کیا سوکی میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟ وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر سامنے دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سوکی میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ ابا جان کیا کہیں گے؟ سوکی! تو تم جانتے ہو نا! تم تو سمجھتے ہو نا!"

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل سا بنا لیا اور اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس کا دل ہلکا سا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلدی اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس روز وہ سو نا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی۔ اُس نے ایک پرانا رسالہ اٹھا لیا۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر گھوم جاتے . . . اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی اُس روز اس کی قوت سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اس نے نذر کو ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے ایک بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سیکم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی کے باہر درخت پر جا جمتی۔ کھڑکی اس وقت بند تھی۔ مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی کوئی راہ گیر گذرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اس کے ہر راز سے واقف ہو۔ صحن والی کھڑکی میں سوکی کا پنجرا تھا۔ سوکی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سوکی تمام دنیا سے بیزار ہو چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا ایک کراہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اُس نے سنا۔ ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

"تم نے تو اپنا ناس کر لیا ہے۔ صبح و شام کام۔ دن رات کام۔ ہر وقت کی ٹک ٹک . . . ایک ساڑھی کے لئے اپنا آپ حلال کر دینا"

"نہیں اماں یہ نہ کہو نذر بار بار کھانس رہا تھا، جب سے وہ آئی ہے۔ ہم نے اس کو دیا ہی کیا ہے۔ مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اُسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گذارہ ہوتا ہے" مگر بیٹا اُس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لئے کیوں اس قدر بے تاب ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی . . . ہمارے زمانے میں . . . "اماں تم سمجھتی ہو۔ اُس نے تو مجھے نہیں کہا . . . مگر یہ تو معمولی بخار ہے۔ تم فکر نہ کرو"

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ اسے بہت بخار تھا۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئے ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے۔ "تم سو جاؤ عذرا نذر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ تم کیوں میرے لئے بے آرام ہو۔ میرا فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں"۔

وہ بخار کی شدت میں وہ وہ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہا تھا جو وہ کبھی کہہ نہ سکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم نہ ہوتی عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی۔ تم میری زندگی ہو۔ میری قسمت ہو . . . میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا" اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔ پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔ اس قرب پر وہ خوشی سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے حسین پاؤں سے کھیل رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ کسی پیارے سے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بُت سی بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اس کی باتیں نہیں سُن رہی تھی یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یکلخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ چونک اٹھی۔ کانپ اٹھی اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

نذر تمام رات بخار سے بے چین رہا۔ وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا۔ چالیس

روپے رنیلی۔ چالیس۔ روپے وہ اکثر عذرا عذرا کہتا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا "تم میرے پاس ہو نا عذرا . . . ہاں . . . تم میرے پاس ہو" پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا "تم آرام کرو عذرا تم اب سو جاؤ . . . تم یہاں رہو جاؤ گی۔ میرا فکر نہ کرو۔ میں اب اچھا ہوں" اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عذرا بیزار سی تھی۔ "وہ آئے ہیں، ہاں!" عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے۔ مگر کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اٹھ بیٹھی۔ اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھالی۔ نذر بڑبڑا اٹھا "نیلی نیلی چالیس روپے"۔ عذرا ڈر گئی۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سوتی نے چیخ ماری۔ دردناک چیخ۔ عذرا نے اُسے دیکھا۔ غریب سوتی اپنے پنجرے میں یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتہً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی۔ وہ پارسل پر لکھ رہی تھی "میں نہیں آسکتی"۔ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی۔ شاید اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھنے کے بغیر ہی وہ پارسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس کے کانوں میں ایک شور محشر سنائی دے رہا تھا . . . کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا . . . وہ چیخ مار کر اُسے بلا لینا چاہتی تھی . . . اس نے اپنے دل میں ایک شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی میں گر گئی۔ "یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا" اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے . . . بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ ہچکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا . . . کیوں عذرا . . . کیوں . . . ہیں . . . تم روتی ہو؟ تم کیوں رو رہی ہو۔ عذرا میں یہاں ہوں میں تمہیں چھوڑ نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں عذرا۔ تم فکر نہیں کرو۔ سو جاؤ۔ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا۔ اس کے کانوں میں گونج اٹھا سلیم تم نہ جاؤ سلیم! سلیم! اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا "سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا" . . . وہ سلیم کی بانہوں میں تھی۔

پھر اس نے سنا جیسے کوئی میلوں دور کہہ رہا تھا "عذرا میری وفا کی دیوی"۔

ممتاز مفتی

شاعر

ہے میری نظر میں حسن کا سیل — پہنائے بہار سے زیادہ
بربط میں مری ہے نغمہ میرا — اندازۂ تار سے زیادہ

اعجاز

غزل

یہ کیف بارشوں کے یہ مستی سحاب کی
توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

وہ عشوہ کاریاں ترے حسنِ شباب کی
وہ تیر باریاں نگہہ بے حجاب کی

پھر جلوۂ جمال دکھا اور شاد کر
پھر داد دے مری نگہہ انتخاب کی

یہ کیوں نہ مان لوں مری قسمت خراب ہے
توجیہ کیا ضرور ترے اجتناب کی

دنیا کی راحتوں کی طرف کیا نظر کروں
دنیا کی راحتیں ہیں نمائش سراب کی

آزاد کا دل اور اسیری کی آرزو
تقدیر، تیرے طرۂ پُر پیچ و تاب کی

ایضاً

کرے کسی کی محبت مجھے شکار کرے
کرے ہلاک ستم ہائے بے شمار کرے

قرارِ تام کی ساعت قریب آپہنچی
کسی کی یاد ذرا اور بے قرار کرے

قریب ہے کسی کافر ادا کی مست نگاہ
مقربانِ خدا تک کو مے گسار کرے

ستم شعار ستا لیکن اس قدر نہ ستا
کہ شکر شکل شکایات اختیار کرے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ
کہ یاس چارۂ تکلیف انتظار کرے

ہوا خلاف، تلاطم شدید ساحل دور
خدا ہی ڈوبنے والے کی ناؤ پار کرے

حکیم آزاد انصاری

بنامِ یگانہ

کدھر چلا ہے اِدھر ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا!

دکھا دے خاک کے پتلوں میں زور کتنا ہے
ہوا پہ تیر چکا اب زمیں میں دھنستا جا!

رُلا رُلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک
مری طرف سے اب اپنی دسا پہ ہنستا جا

جفائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا!

علاجِ اہلِ حسد، زہرِ خندِ مردانہ!
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

بقدرِ ذوق تماشائے حسن ناممکن
ترسنے میں بھی ہے اک کیفیت ترستا جا!

تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کستا جا

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

پنڈت جواہر لال نہرو

آبا و اجداد | جواہر لال کے جد اعلیٰ راج کنول کشمیر کے مشاہیر میں سے تھے۔ اُن کی قابلیت سنسکرت اور فارسی میں بہت اچھی تھی۔ شہنشاہ فرخ سیر جب کشمیر آئے تو اُن کی لیاقت سے بہت متاثر ہوئے اور دہلی چلنے کے لئے کہا۔ یہ واقعہ ۱۷۱۹ء کا ہے۔ شہنشاہ نے جاگیر اور ایک عمدہ مکان نہر کے کنارے انہیں عطا کیا۔ اور اسی عطیہ کے بعد سے ان کے نام کے بعد نہرو (نہر سے) کا اضافہ کیا گیا۔ کنول خاندانی نام تھا اس لئے ان کی اولاد کنول نہرو پکاری گئی۔ لیکن ایک عرصہ بعد کنول حذف کر دیا گیا اور یہ خاندان نہرو کے نام سے شہرت پا گیا۔ مغلیہ شہنشاہی کا چراغ گل ہونے کے بعد اس خاندان نے انگریزی حکومت میں ملازمت کر لی۔ جواہر لال کے پردادا لکشمی نارائن نہرو "سرکار کمپنی" کے پہلے وکیل مقرر ہوئے۔ ان کے دادا گنگا دھر نہرو دہلی کے کوتوال ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ہنگامہ آرائیوں نے اس خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا۔ سارے خاندانی اسناد تلف ہو گئے۔ اور دولت لوٹ کھسوٹ میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ جان بچی لاکھوں پائے سمجھ کر اکثر افراد نے بیک بینی و دو گوش آگرہ کا رُخ کیا۔ جواہر لال کے والد ابھی اس دنیا میں آئے نہ تھے لیکن ان کے دو چچا ہوش سنبھال چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مئی ۱۸۶۱ء میں آگرہ میں ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور بھی اسی دن اسی مہینہ اور اسی سال پیدا ہوئے۔ چونکہ جواہر لال کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اس بڑے خاندان کا بار ان کے دونوں چچاؤں پر پڑا۔ ایک چچا نے حکومت کے محکمۂ عدالت میں ملازمت کر لی اور دوسرے نے کھتری اسٹیٹ میں دیوانی کا عہدہ حاصل کر لیا۔ ہائیکورٹ آگرہ سے الہ آباد میں منتقل ہوا اور چونکہ ان کے چچا کا تعلق اسی سے تھا اس لئے ان کے چچا مع خاندان کے الہ آباد چلے آئے۔ الہ آباد پہنچ کر ان کے چچا نے وکالت شروع کر دی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں صف اول میں جگہ مل گئی۔ موتی لال نہرو کی تعلیم کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔ لیکن وہ بحیثیت طالب علم کچھ زیادہ نہیں چمکے اور ہر امتحان میں بمشکل پاس ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ جب بی۔ اے کے امتحان کا وقت آیا تو بھی ان کی لاپرواہی باقی رہی اور اس امتحان کا ایک پرچہ کر کے وہ اس قدر بددل ہوئے کہ انہوں نے باقی پرچوں میں بیٹھنا وقت ضائع کرنا خیال کیا۔ لیکن بعد کو ان کے پروفیسر کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا پہلا پرچہ اتنا خراب نہ تھا کہ امتحان کا خیال سرے ہی سے چھوڑ دیتے بہرحال انہوں نے اپنی جامعاتی زندگی یہیں ختم کر دی اور کبھی بی۔ اے پاس کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اب انہیں اپنا پیشہ پسند کرنے کی فکر ہوئی۔ وکالت کی طرف ان کا بچپن سے رجحان تھا اور وہ اسے حد درجہ پسند کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اپنے بھائی کی کامیابی بھی مدنظر تھی۔ اسی خیال سے وہ وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اور یہاں وہ پہلی دفعہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ سارے امیدواروں میں اول آئے اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ کانپور میں انہوں نے اپنی وکالت کا آغاز کیا اور تین سال بعد وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں آ گئے اس اثنا میں ان کے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ان کے مقدمے بھی ان کے ہاں آنے لگے۔ موتی لال نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور وہ تعطیلات اور فرصت کے لمحات بھی بن صحت کا خیال کئے مقدمات کی تیاری میں صرف کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بہت جلد ان کا شمار الہ آباد کے چوٹی کے وکلاء میں ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ان کی آمدنی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ طریق معاشرت بھی بدلتا گیا۔ مغربی طرز رہائش پر بیشمار دولت دل کھول کر صرف ہونے لگی۔

جواہر لال کی پیدائش اور بچپن | ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں جواہر لال پیدا ہوئے۔ ہندوستانی طرز معاشرت کے لحاظ سے نہرو کا سارا خاندان ایک ہی گھر میں رہتا تھا۔ لیکن جواہر لال سب بچوں سے چھوٹے تھے۔ اس لئے کوئی انہیں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نہ ان کے ساتھ کوئی کھیلتا۔ نہ انہیں کسی تفریح میں شریک کرتے اور نہ شرارتوں میں ساتھ لیتے۔ انہی اسباب کی بنا پر جواہر لال کو تنہائی میں مجبوراً رہنے کی کچھ عادت سی ہو گئی۔ اور گو کہ شروع شروع میں انہیں تکلیف ہوئی تھی لیکن بعد میں طبیعت کو تنہائی سے انس ہو گیا۔ مغربی معاشرت کی پیروی کے سلسلے میں ان پر ایک انگریز "گورنس" تھی۔ جواہر لال اپنی ماں سے جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا زیادہ مانوس تھے بہ نسبت باپ کے

اس لئے نہیں کہ موتی لال اس زمانہ میں ذرا تند مزاج واقع ہوئے تھے۔ اور ایک دن جبکہ ان کی عمر ۵ یا ۶ سال کی ہوگی۔ باپ کا ایک فاؤنٹن پن چھپا لینے کے الزام میں خوب پٹے تھے اور اس سبب سے ڈرتے تھے بلکہ محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں انہیں حد سے سوا چاہتی تھی۔ اور چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے سے انس زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنی ماں کے سوا جواہر لال کو اپنے باپ کے ملازم منشی مبارک علی سے بھی خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ منشی جی ۱۸۵۷ء کے غدر کے ستائے ہوئے تھے۔ وہ اچھے خاندان کے فرد تھے لیکن غدر نے ان سے دولت۔ وجاہت اور حیثیت سب کچھ چھین لی تھی اور ان فلک کے ستائے ہوئے منشی جی کو موتی لال نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی سفید داڑھی نے جواہر لال کی نظروں میں ایک خاص وقعت پیدا کر دی تھی۔ ان کا خلوص جواہر لال کی کشش کا باعث ہوا اور ان کی شفقت نے جواہر لال کا دل موہ لیا۔ وہ اکثر الف لیلہ کے قصے بیان کرتے تھے اور جواہر لال انہیں حیرت و استعجاب کے عالم میں سنا کرتے تھے۔ ایک عرصہ بعد جبکہ جواہر لال ہوش سنبھال چکے تھے منشی جی نے انتقال کیا لیکن جواہر لال کے دل میں اب تک ان کی یاد باقی ہے۔

مذہبی تہواروں اور پوجا پاٹ کے فرائض میں عورتوں کی سرگرمی خصوصیت رکھتی ہے۔ جواہر لال کے خاندان میں بھی ان معاملات میں عورتوں ہی کا دخل تھا۔ مرد اور وہ بھی نوجوان مغربی طرز کے پیرو ان کی پابجائی سے اکثر قاصر رہا کرتے تھے۔ لیکن عورتیں کمسن ہوں کہ مسن ادائی فرائض میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ جواہر لال کی عمر ابھی اس قابل نہ ہوئی تھی کہ ان کے ساتھ سمجھ بوجھ کر حصہ لیتے۔ اس لئے وہ محض نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے۔ عید اور تہواروں کے موقع پر رنگ رلیاں مناتا۔ مٹھائیاں کھانا اور نئی نئی پوشاکیں پہننا ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ اس خصوصیت میں وہ سب سے زیادہ اہمیت اپنی سالگرہ کو دیتے تھے۔ اس وجہ سے کہ وہی ایک تقریب ایسی ہوتی تھی جس کے وہ تنہا ہیرو ہوتے تھے۔ اور ہر شخص ان کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیتا اور ان کی آؤ بھگت کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ دل ہی دل میں ہمیشہ اور علی الاعلان بعض دفعہ کہا کرتے تھے کہ یہ تقریب سال میں صرف ایک دفعہ کیوں آتی ہے۔ جب کہ دوسری عیدیں اور تقاریب سال میں کئی کئی دفعہ آتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہ اتنے انتظار کے باوجود بھی دیر سے آئے۔

انند بھون | جواہر لال کی عمر دس سال کی تھی کہ ان کے والد نے ایک نیا مکان جو ان کے پچھلے مکان کی بہ نسبت بہت وسیع تھا بنایا اور سب خاندان اس میں منتقل ہو گیا۔ اس کا نام "انند بھون" تھا۔ یہ مکان آج بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور غالباً اس کا چرچا کانگریسی کاروبار کے سلسلہ میں زیادہ ہوا۔ جواہر لال کو اس مکان کی دو چیزیں زیادہ پسند تھیں۔ ایک تو اس کا عمدہ باغیچہ اور دوسرا تیرنے کا بڑا حوض۔ آخر الذکر سے خصوصاً ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور بہت جلد انہوں نے اچھا تیرنا سیکھ لیا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ جب ان کا دل نہ لگتا تھا یہ فوراً اس میں غوطہ زن ہوتے تھے۔ ان کے والد گو اچھا تیرنے نہ تھے لیکن سہ پہر میں عموماً اپنے دوستوں کے ہمراہ ضرور تیرنے آتے۔ مسٹر پنڈت بہادر سپرو بھی جو ان دنوں الہ آباد ہائی کورٹ میں جونیر تھے اکثر موتی لال کے ساتھ تیرنے چلے آتے۔ لیکن نہ انہیں تیرنا آتا تھا اور نہ سیکھنے کے خواہشمند تھے۔ گہرے پانی میں قدم رکھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کمر برابر پانی میں کھڑے ہو کر چھینٹے لڑایا کرتے تھے۔

اساتذہ | جواہر لال کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت جی مقرر تھے جو سنسکرت اور ہندی پڑھاتے تھے۔ اور موقع بے موقع مذہبی فرائض سے بھی آگاہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے جواہر لال نے بہت کم سیکھا۔ اس میں دراصل پنڈت جی کا زیادہ قصور نہ تھا بلکہ جواہر لال خود ہی لاپروا تھے۔ موتی لال کی ولائت سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی سفارش پر ایک انگریز استاد تعلیم کے لئے مقرر ہوا۔ اس کا نام فرڈینینڈ ٹی بروکس تھا۔ تین سال تک جواہر لال اس کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ اسی زمانہ میں انہیں مطالعہ کا شوق ہوا۔ بچوں کے قصے کہانیاں ختم کر کے انہوں نے اس کے ساتھ ڈکنز۔ تھیکرے اور ویگز کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔

تھیاسوفی | چونکہ فرڈینینڈ تھیاسوفسٹ تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھار اس کا ذکر جواہر لال سے کیا کرتا تھا اور بعض دفعہ اس کے کمرے میں اس سوسائٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے جن میں یہ بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں اس سوسائٹی سے دلبستگی سی ہونے لگی اور حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ اس کے نشیب و فراز کو سمجھ سکیں مگر اس کی خاموشی اور جاذب نظر کارروائی نے انہیں اس کا طرفدار بنا لیا۔ ایک دن انہیں خواہش ہوئی کہ وہ بھی اس کے ممبر بنیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اپنے والد کے پاس پہنچے اور ان سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہنسنے لگے شائد اس وجہ سے کہ جواہر لال کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی مگر پھر بھی انہوں نے اجازت دے دی۔ جواہر لال ممبر ہو گئے اور چونکہ ان دنوں ڈاکٹر اینی بیسنٹ الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے خود یہ رسم ادا کی۔ بعد میں جواہر لال کو معلوم ہوا کہ موتی لال بھی اس سوسائٹی کے قدیم ممبر ہیں۔ لیکن ان کی دلچسپیاں ختم ہو گئی ہیں۔

انگلستان کو روانگی مئی ۱۹۰۵ء میں جواہر لال کا پورا خاندان ماں باپ اور چھوٹی بہن سب کے سب انگلستان کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر انصاری مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی جو اس وقت لندن کے ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ "ہیرو" کے ممتاز اسکول میں انہیں فوراً ہی جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد انگلستان سے واپس ہو گئے۔ چونکہ اُن کی عمر ابھی پندرہ برس ہی کی تھی اور اب تک کبھی والدین سے علیحدہ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ تنہائی شاق گزرنے لگی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی دلچسپیوں نے اس کمی کو پورا کر لیا۔ جواہر لال کو اس سال کے "عام امتحانات" سے دلچسپی ہونے لگی اور توقع پر انہوں نے اس کا کافی غور سے مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۶ء کی ابتدا میں ایک دن کسی مدرس نے پچھلے امتحانات کا حال لڑکوں سے دریافت کیا تو اس کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں سوائے جواہر لال کے کوئی بھی صحیح جوابات نہ دے سکا۔ مزید براں انہوں نے امتحانات کا تفصیلی حال سنایا اور اراکین کا بینہ کے نام صحت کے ساتھ گنائے۔ دوسری دلچسپی ہوائی جہازوں کے متعلق تھی۔ ایک دفعہ تو انہوں نے موتی لال کو لکھا کہ وہ بہت جلد ہوائی جہاز کے ذریعہ مختصر سی چھٹیاں منانے گھر آنے والے ہیں۔

اس زمانہ میں "ہیرو" میں چار یا پانچ ہندوستانی طالب علم تھے۔ بڑودا کا ایک شہزادہ تھا، جو ان سے پہلے وہاں تھا۔ اور ان کے وہاں پہنچنے کے تھوڑے دن بعد واپس ہو گیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کپورتھلہ کا شہزادہ "پرمجیت سنگھ" آیا۔ یہ "ہیرو" کو ہندوستان بلکہ اپنی ریاست سمجھ رہے تھے اور اسی شان و شوکت، متانت اور وقار سے رہنا پسند تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی تھیں اور لڑکے چھیڑتے تھے۔

کیمبرج جواہر لال کو اپنے اسکول اور ساتھیوں سے اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ ۱۹۰۷ء میں جب انہیں ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شریک ہونے کے لئے ہیرو چھوڑنا پڑا تو وہ بے حد مغموم نظر آنے لگے۔ کیمبرج کے ٹرائی پاس میں انہوں نے اپنے مضامین کیمیا، ارضیات اور نباتات لئے۔ اس زمانہ میں عام طور پر ان کے ساتھیوں میں نیشٹے، برنارڈ شا، ایوان بلاک، ہیولاک، رلس، کرانٹ ابنگ وغیرہ پر تبصرے اور تنقیدیں ہوا کرتی تھیں اور جواہر لال بھی ان میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ آرٹ اور زندگی کے عام طرز کے متعلق آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے خیالات طلبہ کے دماغوں پر مسلط تھے۔ اور بڑی حد تک جواہر لال بھی ان ہی کے ساتھ تھے۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں نے ایک سوسائٹی "مجلس" کے نام سے قائم کی۔ اس میں ہندوستانی مسائل پر آزادانہ طور میں تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ سوائے جواہر لال کے ہر ہندوستانی طالب علم بڑے زور و شور کی تقریریں کیا کرتا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ لوگ دق کرتے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ یہ سنتے سب تھے لیکن کہتے کچھ نہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پلیٹ فارم پر آنے سے بہت شرماتے تھے۔ کیمبرج کی انجمن اتحاد میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ ہر طالب علم اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے اور تقریر کرے۔ کم سے کم "ٹرم" میں ایک دفعہ ورنہ اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ باوجود اس سختی کے جواہر لال تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے اور چپکے سے جرمانہ ادا کر دیتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو (جو بعد میں سکرٹری آف اسٹیٹ ہوئے) اکثر انجمن کے مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ ان دنوں پارلیمنٹ میں کیمبرج کے نمائندے تھے۔ بعض مشہور ہندوستانی لیڈروں نے بھی ان دنوں کیمبرج کی انجمن اتحاد میں تقریریں کیں خصوصاً چندر پال۔ لاجپت رائے اور گوکھلے کی تقریروں نے جواہر لال پر خاص اثر کیا۔

جواہر لال کے ہمعصروں میں سین گپتا، سیف الدین کچلو، سید محمود تصدق احمد شروانی اور محمد سلیمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ہی سے ہر شخص ہندوستانی مسائل میں برابر کی دلچسپی لیتا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا اس وقت ناممکن تھا کہ بعد میں کون کانگریسی ہوگا اور کون حکومت کی ملازمت میں چلا جائے گا۔

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد مستقبل کا خیال جواہر لال کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ انڈین سول سروس کا مقناطیس ایک طرف انہیں کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف کسی آزاد پیشہ کے اختیار کرنے کا سوال جاذب نظر ہو رہا تھا۔ سول سروس کا خیال اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہ ابھی اپنی عمر کے لحاظ سے مقابلہ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی عمر کا بیسواں سال ابھی شروع ہی ہوا تھا اور مقابلہ کی شرکت کی عمر کم از کم بائیس تھی۔ اس لحاظ سے انہیں کم از کم دو سال ٹھیرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ موتی لال کا خیال تھا کہ سوئین ہو کر اُن کا اکلوتا بیٹا گھر سے دور رہے گا۔ اس لئے قرعۂ فال ان کے خاندانی پیشہ وکالت پر پڑا۔

کیمبرج کے بعد ۱۹۱۰ء میں جواہر لال نے کیمبرج چھوڑا اور لندن میں وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں انہیں اپنا پورا وقت اس پر صرف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے اوقات فرصت میں مختلف مضامین پر مطالعہ شروع کیا۔ "نے مین" اشتراکیت کا ان دنوں زور تھا اور جواہر لال

بھی اس سے متاثر ہونے لگے۔ اشتراکیت کے علاوہ آئرلینڈ کا سیاسی انتشار اور عورتوں کا حق رائے دہی نوجوان جواہر لال کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ انہوں نے اسی سلسلہ میں آئرلینڈ کا سفر بھی کیا اور بچشم خود وہاں کے حالات کا معائنہ کیا۔

لندن کی سوسائٹی نے جواہر لال کو قدرے مسرف بنا دیا اور بعض بعض دفعہ جو کچھ ان کے والد بھیجتے تھے وہ ناکافی ہونے لگا۔ اکثر چھٹیوں کے موقع پر وہ یورپ کے سفر کو نکل جاتے۔ ایک دفعہ موتی لال بھی اُن کے ساتھ برلن میں تھے کہ کونٹ زیپلن پہلی مرتبہ طویل ہوائی سفر سے واپس ہوئے۔ زیپلن کے استقبال کے لئے برلن کی آبادی کا بڑا حصہ ٹوٹ پڑا۔ اور اژدحام کی حالت یہ تھی کہ بس جدھر دیکھئے انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ خود قیصر بھی استقبال کے لئے آئے تھے جس سے یہ واقعہ تاریخی یادگار ہو گیا۔ موتی لال اور جواہر لال جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اس نے اسی رات کو اپنے سارے مسافروں کی خدمت میں کونٹ زیپلن کی ایک خوبصورت تصویر بطور تحفہ پیش کی تھی جو ممکن ہے کہ جواہر لال کے ہاں اب بھی محفوظ ہو۔

۱۹۱۰ء میں جواہر لال نے قانونی ڈگری حاصل کر لی اور ہندوستان کا رُخ کیا۔

وکالت سے بیزاری | انگلستان سے واپس ہو کر جواہر لال الہ آباد ہائی کورٹ میں رجوع ہو گئے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے دلچسپی سے کام کیا۔ جیسا کہ ہر شخص نئے پیشے میں داخل ہوتے وقت کرتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کی طبیعت اُکتانے لگی۔ ان کے باپ کا اس وقت طوطی بولتا تھا۔ اور گھر میں آٹھوں پہر مقدموں کے چرچے رہتے۔ دوست احباب بھی اسی مذاق کے آتے جاتے اور کتب خانہ بھی قانونی کتب سے بھرا پڑا تھا۔ فضا کی اس یکسانیت نے انہیں وکالت کے پیشہ سے بیزار کر دیا اسی سلسلہ میں ان کے کان کانگرس اور سیاست حاضرہ سے آشنا ہوئے۔ موتی لال بھی اس زمانہ میں وکالت کا بچا ہوا وقت قانون سازی، دستور سازی اور سیاست پر صرف کرتے تھے۔ لیکن جواہر لال نے دل ہی دل میں وکالت سے زیادہ سیاست کی ٹھان لی۔ اسی خیال سے کانگرس میں شرکت کی اور اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہے۔ علاوہ اس کے طبیعت جب ذرا اچاٹ سی ہو جاتی تھی تو سیر و شکار کی بھی سوجھتی تھی۔ لیکن انہیں جانوروں کی جان لینے سے زیادہ لطف شکار کے سامان کی تیاری اور اس کی تلاش میں آتا تھا۔ سوائے ایک دفعہ کے جب کہ انہوں نے کشمیر میں ایک ریچھ کا شکار کیا تھا۔ اُن کا کانگرس

اس خصوص میں خون آلود نہیں ہوا۔

سر راش بہاری گھوش کا مشورہ | وکالت سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی جواہر لال اس سے بالکل کنارہ کش نہیں ہو گئے تھے۔ شائد اس لئے کہ کوئی اور کام انہیں نہ تھا۔ سر راش بہاری گھوش جو کلکتہ کے مشہور ترین وکیل تھے نہ جانے کیوں ان سے دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ قانون پر اپنی دلچسپی کے لحاظ سے کوئی موضوع پسند کریں اور اس پر ایک عمدہ کتاب لکھیں۔ گھوش کے خیال میں اس پیشہ میں منہمک ہونے کا یہ بھی ایک ذریعہ تھا مگر یہ دقتی سے جواہر لال کے بس کا یہ دھندا نہ تھا۔ گھوش اپنی عمر کے تقاضے کی بنا پر تند مزاج ہو گئے تھے اور اپنے "جونیرس" کو وقتاً فوقتاً ڈانٹتے تھے لیکن جواہر لال کے ساتھ کبھی بھی انہوں نے سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔

ستیاگرہ | "رولٹ بلز" کے خلاف گاندھی جی نے جب احتجاج شروع کیا تو انہوں نے ساتھ ہی ایک ستیاگرہ سبھا قائم کی جس کے سپرد کا فرض تھا کہ وہ "رولٹ ایکٹ" کی خلاف ورزی کریں۔ جواہر لال کی نظریں جو کسی مصروفیت کی متلاشی تھیں اس پر پڑیں اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اس ایکٹ کے ذریعہ حکومت ہند کسی شخص کو قانونی چارہ جوئی کے بغیر گرفتار کرے اور قید کر دے۔ اس لئے انہوں نے تہیا کر لیا کہ اس سبھا میں شریک ہوں گے۔ جب اس کی اطلاع موتی لال کو ہوئی تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کیونکہ ان کے خیال میں حکومت سے اس قسم کا مقابلہ ایک بے معنی اور لغو فعل تھا۔ اور سوائے اپنے آپ کو قید کرانے کے کوئی اور مفید نتیجہ برآمد نہیں کرا سکتا تھا۔ علاوہ اس کے اپنے چہیتے لڑکے کو قید خانہ میں دیکھنا ان کے لئے ایک مستقل عذاب تھا جس کے خیال ہی سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے گاندھی جی کو الہ آباد بلایا اور سارے واقعات بتائے جس کی بنا پر گاندھی جی نے جواہر لال کو سمجھایا کہ وہ اپنے والد کو تکلیف نہ پہنچائے مگر جواہر لال جتنا سوچتے تھے اتنا ہی اپنے ارادہ میں مضبوط ہوتے جاتے تھے۔ موتی لال کی حالت یہ تھی کہ خواب و خور حرام تھا۔ اور وہ مستقبل کے خیال سے دل گرفتہ ہوئے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے عمدہ غذا نرم بستر اور آسائش سے کنارہ کشی اختیار کر لی محض یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ عنقریب جواہر لال کو قید خانہ میں کسی قسم کی تکالیف کا سابقہ پڑیگا۔ خدا نے موتی لال کی سُن لی اور ستیاگرہ سبھا کو بعض واقعات کی وجہ سے اپنی کارروائی موقوف کرنی پڑی۔

نان کوآپریشن | ۱۹۲۰ء میں کانگرس کا اسپیشل سشن کلکتہ میں ہوا۔ گاندھی جی کی تحریک نان کوآپریشن پیش ہوئی۔ اعتدال پسندوں کے سوا سبھوں نے مخالفت کی

لاجپت رائے اور سی۔ آر داس نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی۔ جناح جو سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں "ہندو مسلم اتحاد کے پیغامبر" ہیں علیحدہ ہو گئے۔ لیکن یہ تحریک عوام میں بے حد مقبول ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے طرف داروں کی ایک کثیر جماعت مکرر بستہ نظر آنے لگی۔ جواہر لال نے اس میں نمایاں حصّہ لیا اور گاندھی جی کے ساتھ مختلف مقامات کا دورہ کیا اور تبادلۂ خیال کیا۔ گاؤں اور قصبوں کا دورہ کرنا اور تقریروں کا ایک سلسلہ باندھنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔

پرنس آف ویلز کی آمد ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے اور کانگریس نے تصفیہ کیا کہ ان کا خیر مقدم نہ کیا جائے۔ کانگریس کو ان کی ذات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بلکہ حکومت ہند کے خلاف مظاہرہ مقصود تھا۔ بہر حال یہ موقع ایسا تھا کہ حکومت سخت پریشان اور انتشار کے عالم میں تھی۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے افراد نان کو آپریشن میں شریک تھے۔ علی برادروں کی کوششوں کی وجہ سے مسلمان علماء اور قائدوں کی ایک بڑی جماعت اس میں شریک ہو گئی اور اُن کے ساتھ عوام جوق در جوق اس میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔

جواہر لال کی پہلی گرفتاری حکومت نے نان کو آپریشن کا جواب گرفتاری سے دیا۔ ہر طرف گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ایک دن جواہر لال کانگریس کے دفتر میں تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ پولیس دفتر کی تلاشی کے لئے آئی ہے۔ جواہر لال کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سراسیمہ ضرور تھے۔ لیکن وضع داری کے مدنظر انہوں نے دفتر کے کارکنوں کو احکام دیئے کہ وہ بدستور کام میں مشغول رہیں اور پولیس کی کارروائی سے اپنی لاپروائی کا اظہار کریں۔ اسی اثنا میں انہیں اطلاع ملی کہ ان کا ایک دوست گرفتار ہو چکا ہے۔ اور وہ انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے کمرے کے باہر منتظر ہے۔ انتہائی متانت کا اظہار کرتے ہوئے گویا کہ یہ روز کا واقعہ ہے۔ انہوں نے پولیس اور دوست دونو سے کہا کہ وہ ان کے خط ختم کرنے تک انتظار کریں۔ دفتر سے اٹھ کر جواہر لال گھر پہنچے تو انہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہاں بھی خانہ تلاشی ہو رہی ہے اور نہ صرف ان کی قید کے احکام آ چکے ہیں۔ بلکہ ان کے والد کی گرفتاری بھی عمل میں آنے والی ہے۔ موتی لال نے کچھ ہی دن قبل نان کو آپریشن کے والنٹیروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا تھا۔ اس لئے انہیں بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء اور جنوری ۱۹۲۲ء میں گرفتاریوں کی تعداد تقریباً تیس ہزار ہو چکی تھی۔ مگر گاندھی جی ابھی گرفتار نہیں کئے گئے تھے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں قید خانے میں یہ خبر نہائت بد دلی کے ساتھ سنی گئی کہ گاندھی جی نے اپنی تحریک بند کر دی خواہ وہ کتنی ہی قلیل مدت اور کسی خاص مصلحتِ وقت کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن قیدیوں کو اس سے روحانی صدمہ پہنچا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاندھی جی کو بھی ایک طویل مدت کے لئے قید کر لیا گیا۔

دوسری گرفتاری جواہر لال کو تعجب ہوا کہ چھ مہینہ کی سزا سنا کر تین مہینہ بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ مارچ میں چھٹکارا ملا تو یہ فوراً گاندھی جی کے ہاں پہنچے مگر وہ اس وقت گرفتار ہو چکے تھے۔ چھ ہفتہ بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں انہیں دوبارہ قید کر لیا گیا۔ آٹھ مہینہ تک لکھنؤ جیل میں انہیں رکھا گیا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ جیل کے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی اور اسی سلسلہ میں جواہر لال بھی رہا ہوئے۔

مولانا محمد علی کے ساتھ دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سشن "کوکاناڈا" میں ہوا۔ مولانا محمد علی پریزیڈنٹ مقرر ہوئے اور انہوں نے جواہر لال کو معتمد بننے کے لئے اکسایا۔ ان دنوں محمد علی اور جواہر لال کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور مولانا کا خیال تھا کہ دوسرا معتمد ان کے ساتھ اس عمدگی سے اتحادِ عمل نہ کر سکے گا جیسا کہ جواہر لال کریں گے۔ جواہر لال مولانا کی تحریک کو رد نہ کر سکے اور یہ ذمہ دارانہ عہدہ انہوں نے پہلی دفعہ قبول کر لیا۔

جواہر لال نے محمد علی کے مشورہ کے بغیر اپنی معتمدی کے زمانہ میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ کسی کانگرسی کو پنڈت۔ مہاتما۔ مولانا۔ مولوی۔ مسٹر۔ اسکوائر یا اسی قسم کے کسی لفظ سے مخاطب نہ کیا جائے۔ لیکن محمد علی نے فوراً بحیثیت صدر انہیں حکم دیا کہ وہ گاندھی کو مہاتما لکھا کریں۔ اس کے علاوہ محمد علی سے مذہب کے بارے میں بھی کبھی کبھار بحث ہو جاتی تھی۔ مولانا کی عادت تھی کہ ہمیشہ لکھنے پڑھنے۔ بولنے میں ہر وقت خدا کے نام سے شروع کرتے خواہ دوسروں کے نقطۂ نظر سے اس کا موقع ہو یا نہ ہو۔ اس کے برخلاف جواہر لال کو اس قسم کی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی مولانا سے مذہبی بحث کرنا نہ چاہتے تھے۔ کیونکہ مولانا کا جوش و خروش دیکھ کر انہیں اندیشہ تھا کہ اس قسم کی بحث سے کہیں فائدہ کی بجائے نقصان نہ ہو۔

مولانا بھارت ماتا کی سیوا میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خطرے کے وقت لوگوں کو آگے کر کے خود پیچھے رہیں۔ ۱۹۲۹ء میں نامزد کانگرس پریزیڈنٹ کی حیثیت سے جب لاہور میں جواہر لال نے خطبہ پڑھا اور اس میں کئی مقامات پر انتہا پسندی کا اظہار کیا تو مولانا نے اس پر سخت

تنقید کی "میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں جواہر" انہوں نے کہا "کہ تمہارے موجودہ کانگرس کے ساتھی تم سے وفا نہ کریں گے۔ پریشانی کے وقت وہ تم سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ تمہارے کانگرس کے ساتھی ہی تمہیں سولی پر چڑھائیں گے۔" یہ اُن کی آخری نصیحت تھی کیونکہ اس کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

برسیلز کانگرس ۱۹۲۶ء کے اواخر میں جب جواہر لال یورپ میں تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ فروری ۱۹۲۷ء میں "مظلوم اقوام کی کانگرس" برسیلز میں ہونے والی ہے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو لکھا کہ اس موقع پر کوئی ان کا نمائندہ بھی شریک ہو تو اچھا ہوگا۔ کانگرس نے جواہر لال ہی کو اپنی نمائندگی کے اختیارات دیئے۔ میکسیکو، جاوا، انڈوچائنا، فلسطین، شام، مصر، شمالی افریقہ کے عرب اور حبشی اس کانگرس میں شریک ہوئے اور مباحثے سرگرمی کے ساتھ چھیڑے گئے۔ لانسبری نے اس کی صدارت کی۔

اس کانگرس کے علاوہ ایک لیگ شہنشاہیت کے خلاف بھی قائم ہوئی اور اس میں آئن سٹائن، رومن رولان اور مادام سن یت سن قابل ہستیاں شریک ہوئیں۔

جواہر لال ان دونوں انجمنوں کے جلسوں میں متعدد مقامات پر شریک ہوئے اور ۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں موتی لال بھی یورپ پہنچے۔ جواہر لال۔ ان کے والد۔ ان کی بیوی اور ان کی بہن سب کچھ دنوں تک یورپ میں ساتھ رہے۔ پھر سب مل کر ماسکو گئے جہاں سوویٹ کی دہ سالہ سالگرہ ہونے والی تھی۔ موتی لال کی عمر دستور سازی اور قانون سازی میں گزری تھی۔ اور انہیں انقلابات پر کچھ زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ باوجود اس کے ماسکو کے حالات سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ یہاں جواہر لال کو پہلی دفعہ سائمن کمیشن کے قیام کا علم ہوا۔ کچھ دنوں بعد موتی لال کو ایک پرانے زمینداری مقدمہ میں پریوی کونسل لندن میں پیروی کرنی تھی۔ سر جان سائمن بھی اس مقدمہ میں ان کے شریک کار تھے۔ اس لئے جب سر جان سائمن کے مکان پر وہ اور موتی لال باہم مشورہ کے لئے جمع ہوئے تو گو کہ جواہر لال کو اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن سائمن کے کہنے پر وہ بھی شریک ہوئے۔

۱۹۲۷ء کا سال قریب الختم تھا اور جواہر لال کو کانگرس کے اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے وہ اپنے والد کو چھوڑ کر مع اپنی بہن اور بیوی کے ہندوستان چلے آئے۔

کانگریس کی صدارت ۱۹۳۶ء میں جواہر لال کانگریس کے صدر دوسری مرتبہ منتخب ہوئے۔ عوام میں گاندھی جی کے بعد شائد سب سے زیادہ ہر دل عزیز جواہر لال نہرو ہیں۔ انکی مقناطیسی شخصیت، جادو بیانی اور آہنی عزم و استقلال نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے طرفدار پیدا کر دیئے۔ لیکن ان کے خیالات انتہا پسندانہ ہیں اور انتہائی آزادی کے سوا کوئی دوسری چیز لینے پر آمادہ نہیں۔ حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ خواہ اس سے ملک کا کوئی فائدہ ہی کیوں نہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔ ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اور حالیہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے اس کا جس طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا۔ خود کانگریس کے سنجیدہ طبقہ میں اشتراکیت پسندانہ خیالات ناقابل عمل قرار دیئے گئے اور اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔

کملا نہرو کی وفات ۱۹۱۶ء میں جواہر لال کی شادی کملا دیوی سے ہوئی تھی۔ اس وقت سے کملا کے انتقال تک دونوں میں غیر معمولی محبت تھی۔ حالانکہ جواہر لال نے ۱۹۲۱ء کے بعد سے اپنی زندگی کے زیادہ دن جیل میں گزارے۔ دراصل ان کی ایک رہائی دوسری گرفتاری کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اور دونوں کے درمیان اتنا کم وقفہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے گھر یا کام کاج کے لئے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ موتی لال ۱۹۳۱ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد سے جواہر لال کی والدہ کی صحت خراب ہونے لگی لیکن ان کی طبیعت درست ہوئی تو کملا کی صحت بگڑنے لگی۔ کئی دفعہ انہوں نے سخت بیماریاں جھیلیں۔ لیکن آخری دفعہ ۱۹۳۶ء میں جب جواہر لال المورا جیل میں تھے انکی حالت متغیر ہوئی۔ مئی میں علاج کے لئے وہ یورپ چلی گئیں۔ مگر جواہر لال کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے مرض میں کسی طرح افاقہ نہ ہوتا تھا۔ آخر جب حالت غیر ہوئی تو حکومت نے جواہر لال کو ۴ ستمبر کو قید سے رہا کیا اور وہ فوراً یورپ پہنچے۔ لیکن افسوس کہ کچھ عرصہ بعد کملا انہیں داغ مفارقت دے گئی اور اپنی اکلوتی لڑکی کو اندرا کو تنہا چھوڑ گئی۔

تصانیف چونکہ جواہر لال کی زندگی ۱۹۲۱ء کے بعد سے زیادہ تر قید میں گزری اور قید خانہ میں سیاسی قیدیوں کو بعض خاص حالات کے سوا لکھنے پڑھنے کی ممانعت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان ہی ایام میں جواہر لال نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ وہ خطوط جو انہوں نے قید خانہ سے بیٹی کے نام لکھے ہیں۔ کتابی صورت میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئے۔ "دو دھر انڈیا" ان مضامین کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ جو اس وقت اخباروں میں شائع ہوئے۔

اسی سال ۱۹۳۶ء میں انہوں نے اپنے خود نوشتہ سوانح شائع کئے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپریل سے جولائی تک اس کے پانچ اڈیشن شائع ہوئے۔

سید بادشاہ حسین

اے ابنِ آدم

جرأت سے عبارت ہے ترا قلب و جگر دیکھ
آدم کی جسارت کو ذرا بھر کے نظر دیکھ
لغزش نہیں جنبش ہے تری اصل سفر دیکھ
تو عزمِ سفر لے کے اٹھا تھا تو بڑھا چل

منزل ہیں جو دلچسپ تو دیکھ اور گزر جا
ہر راہ پر انوار سے فی الفور گزر جا
گزراں ہے جہاں اس سے بہر طور گزر جا
کچھ غم نہیں محروم تماشا ہی چلا چل

جنت کو جو چھوڑا ہے تو دوزخ میں سکوں کیا
یہ شیوۂ ہوش و خرد و خبط و جنوں کیا
یہ دائرۂ خیر و شر و زشت و زبوں کیا
اس سلسلۂ وہم سے دامن کو بچا چل

یہ حسن و محبت کے فسانے ہیں پرانے
یہ عشرت و کلفت کے خزانے ہیں پرانے
یہ نغمہ نواز اور یہ ترانے ہیں پرانے
اب اُن کی نہ سُن، اپنی سنا اور بڑھا چل

یہ قوم و وطن "مظہرِ تزویر سکوں ہے
یہ مذہب و مقصد "نہیں تدبیر سکوں ہے
یہ "نفع و ضرر" حلقۂ زنجیر سکوں ہے
زنجیر سکوں توڑ دے چل اور اُڑا چل

پنہاں تری منزل ہے نہ پیدا تری منزل
منزل ہے تری دیر نہ کعبہ تری منزل
دنیا تری منزل ہے نہ عقبیٰ تری منزل
نظروں سے دو عالم کے تماشے کو گرا چل!

ماحول کو الہام نظر دے کے بدل دے
ادیان کو اک تازہ خبر دے کے بدل دے
امکان کو امکانِ اثر دے کے بدل دے
ہمرہ نہیں کوئی تو اکیلا ہی چلا چل

پیغمبری و شعر کی حامل ہے تری ذات
ہر پہلو سے اے آدمی! کامل ہے تری ذات
ہر جادۂ کونین کی منزل ہے تری ذات
ہر راہ کو منزل میں کھپا اور بڑھا چل

ہر گام پہ اک جنتِ گم گشتہ بسا دے
ہر موت پہ اک زیست کا عنوان جما دے
انساں ہے تو انساں کو انساں بنا دے
ٹھہرا ہے بہت روز اب اے مردِ خدا چل

وقار

انبالوی

بھیڑیا

افراد تمثیل

جلال ـــــــــــ ڈاکوؤں کا سردار

اکبر
عبداللہ
ناصر
اکرم } ـــــــــــ ڈاکو

مبارک ـــــــــــ مُلّا

عباس ـــــــــــ شاگرد

منظر: ایک سنسان اور دشوار گذار پہاڑی سلسلہ۔ بلندیوں پر پہاڑ کی دراڑوں میں خار دار جھاڑیاں اور چیل کے درخت اُگے ہوئے ہیں زمین پر ایک خشک شدہ برساتی نالے کا پتھریلا راستہ ہے جس میں چٹانوں کے بڑے بڑے تودے بھی بکھرے پڑے ہیں۔ داہنے طرف ایک گہرا غار ہے جس میں سے پانی ایک نالے کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ اوپر والی جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بھیڑ کی پشت اور لمبے لمبے سینگوں والا سر نظر آرہا ہے۔ جونہی اکبر ہانپتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اوپر چڑھتا ہے بھیڑ کا سر اس کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اکبر بھیڑ جاتا ہے۔ اور اپنے دائیں بائیں نظریں دوڑا کر اپنے ہاتھ منہ کے ساتھ لگا کر بھیڑیے کی طرح چلاتا ہے۔

اکبر۔ واؤو، واؤو!۔۔ واؤو، واؤو!

عبداللہ (اوپر سے) آ آ!

اکبر۔ او اکبر! دوسرے کہاں ہیں؟

عبداللہ کہاں ہیں؟ مجھے کیا خبر۔ میں موجود ہوں

اکبر۔ ان کو سنانے کے لئے تازہ خبریں لایا ہوں۔

(وہ بیٹھ جاتا ہے اور اپنے تھیلے میں سے ایک خربوزہ نکال کر زور سے)

عبداللہ۔ (بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے نیچے جھانکتا ہے) ارے! یہ کہاں سے آگیا؟

اکبر۔ بڑی دُور سے۔ غزنی کے بازار سے۔ لو!

(اور خربوزہ کاٹ کر اوپر کی طرف پھینکتا ہے۔ عبداللہ اُچک کر کھانا شروع کر دیتا ہے)

عبداللہ تازہ خبریں؟ ہاں! سناؤ۔

اکبر۔ انسان کے لئے ایک دفعہ کہنا کافی ہوتا ہے۔ جلال کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً آئے۔

عبداللہ۔ (پہلے چیختا ہے اور پھر بھونکتا ہے) آؤو۔ واؤو! واؤو!

آواز۔ (دور سے) آؤو۔ واؤو! واؤو!

(اکبر اپنے تھیلے کو خالی کرنا شروع کرتا ہے۔ اس میں زیادہ تر فولاد اور چمڑے کے ٹکڑے ہیں۔ انہی میں لی ہوئی چند ایک خوب صورت پتلیاں ہیں)

اکبر۔ او خدا! دنیا میں کیسے کیسے بے وقوف ہیں۔ اگر میں چاہتا تو اس سے دگنا مال جمع کر سکتا تھا۔

عبداللہ۔ ہاں اتنی بڑی بھیڑیں بالکل آسان بات ہے۔ [illegible] انہیں

دیکھو۔ وہ نیچے، چیونٹیوں کی طرح اُس دروازے میں سے نکل رہے ہیں (سامنے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اکبر۔ اچھا! معلوم ہوتا ہے خرید و فروخت بند ہو چکی ہے۔ ان میں آج ایک واعظ ملا بھی آیا ہوا ہے۔ جب اس نے وعظ شروع کیا تو لوگ سحر سے ہو گئے . . . میرا کام بن گیا۔

عبداللہ۔ کیا وہی نہیں، ملا مبارک؟

اکبر۔ فاقہ زدہ شکل و صورت ـــــ تمام چہرے پر صرف آنکھیں اور منہ نظر آتا ہے۔ اوہ! بالکل دیوانہ! تم اس کی باتیں سنتے!

آواز۔ (قریب سے) واؤو! •

عبداللہ۔ باآ آ، ناصر؟ جلال سے کہو اکبر واپس آگیا ہے"

(ناصر اور اکرم داخل ہوتے ہیں)

اکرم۔ سناؤ، کچھ قسمت نے یاوری کی؟

اکبر۔ ارے بھیڑیا کہاں ہے۔ اسے جلدی بلاؤ، مجھے اس سے ضروری کام ہے۔

(جلال ظاہر ہوتا ہے، مضبوط جسم اور وحشیانہ بانکپن کا حامل۔ کانوں میں مرکیاں اور گلے میں اشرفیوں کا ہار پہنے ہوئے۔ چٹان پر کھڑا ہو کر شہر کی طرف دیکھتا ہے)

ناصر۔ لو! اپنے نیچے دیکھو، بھائی!

جلال۔ ذلیل کپڑو! دیکھنا ان کی طرف! لعنت، لعنت ہو تم پر!

اکبر۔ سردار! دیکھو، عقلمند بھیڑیا بننے کی کوشش کرو۔

جلال۔ ارے؟ یہ کون ہے؟

اکبر۔ "پاگل"۔ اس کے متعلق مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔

عبداللہ۔ یہ مبارک ہے، ملا!

(ایک ہمراہی چٹان پر بیٹھ کر تمام ڈاکو اکبر کے مالِ غنیمت کو تقسیم کرتے ہیں)

جلال۔ کیا دیوانگی اُسے اِدھر لا رہی ہے؟

اکبر۔ ہاں، سردار وہ تمہیں گرفتار کرنے آرہا ہے۔ اس نے تمام شہر کو اکٹھا کر کے قسم کھائی ہے۔ اور جس بلند آہنگی سے وہ بول رہا تھا تم تک بھی پہنچنی چاہئے تھی۔

جلال۔ ہاں، ہاں اکبر! اپنی بکواس کو مختصر کرو اور جلدی بتاؤ۔

اکبر۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں سردار! وہ آب زم لئے آرہا ہے۔ جس سے تم پر خوف طاری کر دے گا۔ پہلے تمہیں اندھا کرے گا، پھر بہرا کرے گا، پھر تمہاری عقل سلب کرے گا اور جب تمہارے تمام حواس سلب کر کے تمہیں قابو میں کرے گا۔ تو تمہارے ٹکڑے اڑا دے گا۔ تمہیں ایک تھیلے میں ڈال لے گا۔ تمہارے گوشت کو نمک لگائے گا اور شہر میں لے جا کر اذان دے گا اُس نے لوگوں سے کہا تھا "تم اذانیں دینا" پھر وہ ایک دعوت کریں گے اور مزے لے لے کر تمہیں کھائیں گے۔

جلال۔ کمینے چور! تم نشہ پی کر آئے ہو!

اکبر۔ میں کمینہ چور ہوں؟ ہاں میں نے بھنگ پی تھی ـــــ لیکن میرے کان کھلے تھے، اور اگر میں بھنگ نہ پیتا تو یہ خبریں تم تک نہ پہنچ سکتیں۔ جہاں میں نے بھنگ پی اسی قہوہ خانے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور جو کچھ میں نے کہا ہے سچ ہے۔ اور سنو بڈھے "واؤو"، واؤو" یہی تمہارا حشر ہونے والا ہے، جو میں بتا چکا ہوں۔

جلال۔ (غصے سے) کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ اٹھاؤ!!

(اکبر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اس کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے)

اب جو کچھ باقی ہے اُگل ڈالو، بولو!

اکبر۔ (خوف سے ہکلاتے ہوئے) سردار، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے بالکل حقیقت ہے اور اس کے عین مطابق جو کچھ میں نے سنا، اور اس کے بعد ملا خود بازار میں آگیا اور کہنے . . . (رکتا ہے)

جلال۔ کہنے لگا، ہاں، ہاں، کیا کہنے لگا؟

اکبر۔ میں ـــــ میں نہیں جانتا، سردار! مجھے تمام باتیں بھول گئی ہیں وہ بڑی دیوانگی کی باتیں کرتا تھا۔ کوئی عقلمند آدمی کس طرح ان باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ کچھ اس طرح تھا "ہمارا بھائی بھیڑیا" اور "ہمارا بھائی بھیڑیا" اور اگر تم اسے کھانے کی کوشش کرو گے تو وہ تمہیں پھاڑ کھائے گا۔ لیکن ہم اسے قابو کر لیں گے، اور پھر وہ کسی کو گزند نہ پہنچا سکے گا" اور لوگوں کا ایک انبوہ اس کے گرد کھڑا ہوا ہنس رہا تھا اور تالیاں مار رہا تھا، بے وقوفوں کے ایک گروہ کی طرح اور وہ اُن سے کہہ رہا

تھا کہ اگر میں اسے قابو کر کے دست بستہ لے آؤں تو کیا تم لوگ اسے میرے حوالے کر دو گے تاکہ جیسا میں چاہوں اس کے ساتھ برتاؤ کروں؟ اور وہ سب کہتے تھے "ہاں ہاں" اور پھر اس نے کہا "اس کی جان میرے حوالے کر دو، تم امن میں رہو گے"۔ وہ سب رضامند ہو گئے اور ——— (رک جاتا ہے) بس اتنی ہی بات تھی سردار! کیونکہ اس وقت میرا تھیلا بھر گیا اور مصلحت اسی میں تھی کہ میں رفوچکر ہو جاؤں۔

جلال۔ چہ خوب؟ قابو میں اور "دست بستہ" اور میری جان لیں گے؟

ناصر۔ سردار! تم نے بھی تو ان کی بے شمار جانیں لی ہیں۔

جلال۔ اور زیادہ لوں گا اندھی چمگادڑو! (گھونسہ تان کر شہر کی طرف ہلاتا ہے) ذرا صبر کرو اور میرے پتوں کو جوان ہونے دو! . . . عبداللہ! اپنے پہرے پر کھڑے ہو جاؤ!

(عبداللہ بھیڑ کی کھال پہن لیتا ہے اور اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے)

اکبر۔ جلال! وہ تم سے بہت ڈرتے ہیں۔

جلال۔ یہ ان کے لئے اچھی بات ہے۔

اکبر۔ اب کوئی شخص اکیلے دکیلے اور بغیر ہتھیار کے شہر سے باہر نہیں نکلتا۔

جلال۔ اس کے باوجود وہ میرے قہر و غضب سے محفوظ نہیں۔

ناصر۔ اور نہ اُن کے بھیڑوں کے گلّے۔

اکبر۔ اور اگر تم کسانوں کو اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں اور بکریوں کا ذکر کرتے سنو، ایک کی بجائے وہ دس کی تہمت لگاتے ہیں اور اب جبکہ ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، انہوں نے ہماری تعداد کا اندازہ پچاس لگا رکھا ہے۔

جلال۔ اور ہم انہیں پچاس ہی بن کر دکھائیں گے۔ اوہ، کتو، کتو! مجھے اپنا غول اکٹھا کر لینے دو، میں تمہیں حقیقی کتوں کی طرح بھونکنے پر مجبور کر دوں گا۔

تمام۔ باقی کہاں ہیں؟ سردار ہمارے باقی دوست کہاں ہیں؟

جلال۔ وہ آ رہے ہیں، آ رہے ہیں بھائیو، صبر کرو۔ تم پہلے آ گئے ہو وہ بھی تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ پھر ہم خون پئیں گے!

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ اور آگ اور تلوار لے کر پڑیں گے۔

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ اور چشم زدن میں غزنی، آتشزدہ آنکھوں اور بے چھت کی دیواروں کے ساتھ خوفناک تاریکی میں چمک رہا ہو گا۔

سب۔ غزنی، غزنی کو تباہ کر دو، واؤو، واؤو!

جلال۔ لوگو سنو، تم نے مجھے مارا، تم نے مجھے سنگسار کیا، تم نے مجھے پھینک دیا۔ ہاں تم نے مجھے جانوروں کی طرح شکار کیا۔ میں نے انصاف کے لئے درخواست کی تم نے انکار کر دیا تم نے میرا مضحکہ اڑایا۔ تم سنتے ہی نہ تھے۔

سب۔ آوو، واؤو، واؤو۔

(جلال اپنا خنجر بے نیام کر لیتا ہے)

جلال۔ میں نے چنغلوز کے گھر کو اس کے اوپر جلا دیا۔ میں اپنے تیز دانتوں کے ساتھ کاٹتا ہوا ان کے درمیان جا پہنچا۔ بھیڑیا، بھیڑیا، چلاتے ہوئے لوگ جاگ اٹھے اور میرے تعاقب میں دوڑے۔

سب۔ واؤو، واؤو، واؤو، واؤو۔

جلال۔ انہوں نے دروازے بند کر دیئے لیکن میں دیوار پھاند کر باہر آ چکا تھا۔ "بھیڑیا، بھیڑیا" وہ چلاتے رہے، لیکن اب موقع نکل چکا تھا میں باہر نکل گیا تھا اور آزاد تھا۔

سب۔ واؤو، واؤو۔

جلال۔ پھر تم آ گئے، بھائیو۔ کیونکہ تمہارے ساتھ بھی انہوں نے بُرا سلوک کیا تھا اور اب ہم نے مل کر انہیں ڈرنا سکھایا ہے۔ چیخو، چیخو، انہیں بھیڑیئے کی آواز سننے دو!

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ کتّے!

عبداللہ۔ ہا آآآ (اس آواز سے سب چوکنے ہو جاتے ہیں اور جلال چٹان پر چڑھ کر دیکھتا ہے)

جلال۔ ہٹو، ہٹو، سب اوٹ میں ہو جاؤ۔

(تمام ڈاکو غائب ہو جاتے ہیں۔ جلال اور ناصر غار میں داخل ہو جاتے ہیں اکبر ایک درخت کی جڑوں میں اور مارکم ایک چٹان کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ عبداللہ اپنی کھال میں لپٹا پڑا ہے۔ عباس ایک دام لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

عباس۔ اتنا تیز نہ چلو، خدا کے لئے اتنا تیز نہ چلو۔

مبارک۔ تھک گئے ہو بھائی؟

عباس۔ نہیں بابا تھکا تو نہیں۔ لیکن یہ جگہہ جہاں ہم آئے ہیں اچھی نہیں ہے۔

مبارک۔ کیوں بیٹا؟

عباس۔ میرا مطلب ہے، تاریک ہے۔

مبارک۔ ابھی آگے اور زیادہ تاریکی ہے بیٹا۔

عباس۔ ہاں، اور بابا ناہموار پتھر جن سے ٹھوکر لگنے کا امکان ہے اور گڑھے گرنے کے لئے اور پانی کے دھارے ڈبانے کے لئے اور غار ——— (وہ مڑ کر مبارک کی طرف دیکھتا ہے جو غار میں داخل ہو رہا ہے) اوہ خدا کے لئے بابا اس کے اندر نہ جانا اس کے اندر کوئی ہے۔

مبارک۔ میرا بھائی ہے پانی۔ اگر وہ مجھ سے نہیں ڈرتا تو میں اس سے کیوں ڈروں؟

عباس۔ لیکن بابا وہ بھی تو اپنی پوری قوت سے دوڑتا ہوا باہر آرہا ہے

مبارک۔ وہ رحمدل ہے بیٹا، اور وہ ہمارے ہی خیال سے دوڑتا ہوا آرہا ہے کیونکہ ہم پیاسے ہیں۔

(جھک کر پانی پیتے ہیں)

عباس۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) لیکن بابا اس میں تو خون ہے (ایک بھاری پتھر اور اس کے بعد کنکر اوپر سے گرتے ہیں) او خدایا، یہ کیا؟

مبارک۔ آؤ بیٹا پانی پیو۔ یہ پانی ٹھنڈا اور صاف ہے۔ تمہیں ضرور تفریح ہوگی۔ اس کے بعد شاید ہمیں نہ ملے۔

عباس۔ کیا ہم اور آگے جائیں گے؟ آگے؟ ہم آگے کیوں جائیں گے بابا؟

مبارک۔ اپنے بھائی بھیڑیئے کو ڈھونڈنے۔

عباس۔ خدا ہمیں اپنے حفظ و امن میں رکھے۔ اس غصیلے میں کیا ہے بابا؟

مبارک۔ کھانا میرے بیٹے! اور دودھ اور ٹکڑے۔

(وہ ایک صحیح چٹان پر کھانا رکھ دیتا ہے۔ جلال اور نامہ غار کے منہ پر نمودار ہوتے ہیں۔ باقی ڈاکو سننے کے لئے آہستہ سے اپنے ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہیں)

عباس۔ ڈاکو کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟

مبارک۔ اس کے جسم کے لئے اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

عباس۔ میں تم سے متفق نہیں ہوں بابا۔ اُسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، وہ خون، خوف، جبر اور ظلم جیسی چیزوں کا شیدا ہے۔ وہ انسانوں کو گرفتار کرتا ہے وہ ان کی کھال ادھیڑتا ہے، ان کے دانت نکالتا ہے، ان کے کان کاٹتا ہے اور ان کے دل پھاڑ نکالتا ہے۔ اوہ!

مبارک۔ میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کروں گا۔

عباس۔ تم، بابا؟

مبارک۔ آج دن ڈوبنے سے پہلے تم بھائی جلال کو گرفتار پاؤ گے۔ ہاں میں اس کی کھال اتار دوں گا، اور اس کے دانت نکالے کوئی گزند نہ پہنچائیں گے۔ میں اس کے ناک اور کان پکڑوں گا اور اس کا دل باہر نکال دوں گا۔

(یہ سن کر جلال اور اس کے ساتھی دانت پیستے ہیں۔ وہ مبارک کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں جو عباس سے تقاضے کر کھانا چن رہا ہے۔ وہ آرام لینے کے لئے چٹان پر بیٹھ جاتے ہیں)

عباس۔ اچھا بابا، اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو ہم جلد ہی رسیوں سے لٹک رہے ہوں گے۔

مبارک۔ عباس تم ایک بھیڑیئے کو بھیڑ کی شکل میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھو گے۔

اکبر۔ ہا آآآ

عباس۔ دیکھو بابا، ایک سمجھدار بھیڑ تمہاری بات کا جواب دے رہی ہے

(مبارک روٹی، دودھ اور گوشت چٹان پر چن دیتا ہے)

مبارک۔ دیکھو بیٹا، کیا یہ پُر تکلف دعوت نہیں ہے؟ کیا اسے دیکھ کر ہمارے بھائی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے گا؟

(جلال کھانے کی طرف دیکھتا بھی نہیں)

عباس۔ اس کی کیا حقیقت ہے بابا۔ وہ تو سڑ فاپر ڈاکا ڈال کر یہ کیا، اس سے بھی اچھی نعمتیں حاصل کر سکتا ہے۔

مبارک۔ میرا بھیڑیا بھائی بے وقوف نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکا ڈالتے وقت اس کا دل نہیں دکھتا؟ انسان اگر خود ضرورتمند نہ ہو تو وہ دوسرے سے کبھی نہیں چھینتا۔

عباس۔ صحیح ہے بابا۔ میں بھی کسی سے نہیں چھینتا۔

مبارک۔ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں تم سے بھی زیادہ بے وقوف کوئی ہستی ہے؟ بھائی بھیڑیے کی بھی آنکھیں میری تمہاری طرح ہیں، کیا

وہ تاریکی کے مقابلے میں روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے بھی کان ہیں، کیا اسے طعن و تشنیع کے مقابلے میں محبت بھرے الفاظ بھلے معلوم نہیں ہوتے، اس کا ایک دل بھی ہے بیٹا، کیا وہ دکھ دینے کے مقابلے میں رحم دلی کو تفوق نہ دے گا؟ اگر اس کے پاس اپنے لئے کافی خوراک ہوتی تو کیا وہ تم سے چھیننے کی کوشش کبھی کرتا؟

عباس۔ کیا معلوم بابا۔

مبارک۔ کیوں نہیں۔ اگر کوئی ڈاکو ہو تو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ تنہائی اسے دکھ دیتی ہے — لوگ اسے مارنے دوڑتے ہیں، اسے بھاگنا اور چھپنا پڑتا ہے وہ تنہا رہ جاتا ہے اور بے گھر ہو کر اس کا کوئی رشتہ دار، عزیز یا دوست نہیں رہتا۔ جس کی وہ کچھ خدمت کر سکے اور اگر یہ نعمت تمہارے پاس نہ ہو تو پھر وہ نام و دولت جو دوسروں سے جبراً چھینی گئی ہو کس کام کی؟

عباس۔ بابا میرا بھی کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں لیکن میرے پاس دولت بھی نہیں۔

مبارک۔ تمہارے تو خزانے بھرے ہیں بیٹا، رحم و کرم کے خزانے۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے تم دیتے ہو۔ اپنے بھیڑیے بھائی کو بھی دو اور اس پر رحم کرو۔ دیکھو وہ کس قدر پشیمان ہے۔

(جلال کے زور زور سے دانت پیسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی جو ذہنی طور پر چند جیائے ہوئے سے ہیں اپنے طور پر کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے اور اسی کے اتباع میں دانت پیسنے لگ جاتے ہیں)

عباس۔ حقیقت کو چھپانے سے کیا فایدہ؟ بابا!

مبارک۔ کچھ بھی نہیں بیٹا۔

عباس۔ کیا میں اپنے خیال کو صاف صاف بیان کر دوں؟

مبارک۔ ضرور، بیٹا!

عباس۔ تمہارے جذبات خواہ کتنے ہی پاکیزہ ہوں بابا، لیکن ان میں ایک دیوانہ پن ضرور ہے، اور اس کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے دعائیں مانگیں، بابا کئی دفعہ خدا سے التجائیں کیں کہ تمہارے عقل و حواس تمہیں واپس دے دے لیکن انہیں شرف قبولیت حاصل ہونے کے بجائے میرے حواس بھی چھین لئے گئے اور اب ہم دونوں، جن میں کچھ پکڑنے تک کا وقوف بھی نہیں —— ایک ڈاکو کو پکڑنے آئے ہیں اور اگر میرے عقل و خرد کلیتہً زائل نہیں ہو گئے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس وقت ہم خطرے میں ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ صرف میرے منہ پھیر کر دیکھنے کی دیر ہے اور سامنے کوئی کھڑا ہوگا۔

مبارک۔ بیٹا عباس، میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔

عباس۔ ہاں، بابا!

مبارک۔ ایک شاہین کا بچہ زخمی ہو کر اپنے گھونسلے سے نیچے گر پڑا وہ اڑ بھی نہ سکتا تھا۔ جب میں نے اُسے ہاتھ میں اٹھایا تو اس نے میرے ہاتھ کو کاٹ کر خون نکال دیا۔ میں نے اُسے مارا نہیں کیونکہ وہ مجبور تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ ہاں، اس کی چونچ بہت ہی تیز تھی۔

عباس۔ مجھے یاد ہے وہ نہایت خوب صورت پرندہ تھا اور تمہارے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔

مبارک۔ میں نے اس کے لئے ایک گھونسلہ بنایا اور اس کے لئے خوراک لے آیا۔ ہاں بیٹا، وہ چوہے، گوشت اور مرے ہوئے کیڑے کھایا کرتا تھا اور جب اسے اور کچھ نہ ملتا تو وہ میرا گوشت کھانا شروع کر دیتا اور اگرچہ میرا گوشت اسے پسند تھا لیکن میری ذات کے لئے اس کے دل میں کوئی محبت نہ تھی۔ چنانچہ جب اس کے بازو کا زخم مندمل ہو گیا اور وہ اڑنے کے قابل ہو گیا تو فوراً رخصت ہو گیا۔

عباس۔ ناہنجار پرندہ!

مبارک۔ شاہین، شاہین ہوتا ہے بیٹا۔ جب خدا شاہین کی تخلیق کر رہا تھا اُس وقت انسان اس کے پیش نظر نہ تھے اور جب وہ بھیڑیے پیدا کرنے لگا تو اُس وقت بھی اس نے انسانی جذبات کو مدِ نظر نہیں رکھا اور یقین رکھو کہ بھیڑیا کبھی انسان نہ بنے گا تو پھر انسان کس طرح بھیڑیا بن سکتا ہے۔

عباس۔ لیکن بابا شاہین نے بُرا کیا، تم نے تو اس کی جان بچائی تھی۔

مبارک۔ اسی طرح خدا نے مجھے بھی بچایا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں۔ اب جس طرح وہ محبت کے باوجود ہم پر ہماری بیچارگی واضح کرتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کی بے چارگی بھی ظاہر کرتا ہے اور اگر میں نے اسے [illegible] شاہین سے محبت

کی، اس کے باوجود کہ وہ میرا گوشت کاٹ کھاتا تھا کیا میں اپنے بھائی بھیڑیے کو محبت نہ کروں گا؟
(یہ تمام باتیں جلال اور اس کے ساتھیوں کے فہم سے بالاتر ہیں لیکن
کم از کم وہ اس کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ جلال اشارہ کرتا ہے اور
خاموشی کو ہاتھوں میں رسیاں لئے ہوئے اپنے شکار سے نزدیک تر
ہو جاتے ہیں لیکن مبارک اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے)

مبارک۔ ہاں۔ خواہ وہ مجھے رسیوں سے جکڑ لے اور میرے دانت نکال دے
اور خواہ وہ میری کھال ——

(عباس ڈاکوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو مبارک پر یک دم حملہ کیا
چاہتے ہیں)

عباس۔ بابا! بابا!!

مبارک۔ خواہ میرے کان کاٹ لے اور میری زبان کھینچ لے اور میری
آنکھیں ——

(جلال کے ایک اشارے پر ڈاکو یکدم ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں
رسیوں سے جکڑ لیتے ہیں۔ عباس بتقاضائے فطرت کچھ جارحانہ
جنبش کرتا ہے لیکن مبارک بلا اظہار تعجب اسے قبول کرتا ہے)

مبارک۔ تم ہو بھائی بھیڑیے؟

جلال۔ ہاں، ملّانے! میرے دانت تمہارے گوشت میں پیوست
ہیں اور تم نہایت عمدگی سے جکڑے ہوئے ہو۔

مبارک۔ تم نے ابتدا تو بہت اچھی کی ہے۔ ذرا ٹھیرو! دیکھو عباس،
بھائی بھیڑیا اپنے دانت میرے گوشت میں پیوست کر چکا
ہے اور تمہارے ہیں بھی اور اس کی نگاہوں سے ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے پرخچے اڑا دے گا لیکن اس کے باوجود
ہم اس سے محبت کریں گے اور وہ ہمیں اپنے سخت سے سخت
برتاؤ کے باوجود بھی محبت سے باز نہیں رکھ سکتا۔

جلال۔ (خنجر نکالتے ہوئے) اور اگر میں تمہیں قتل کر دوں؟ پھر؟

عباس۔ بابا، خدا کے لئے قرآن کی آیات پڑھئے۔ یہ مجھے مارنے لگے ہیں
(ڈاکو عباس کو دو تین مکے رسید کر کے خاموش کر دیتے ہیں)

مبارک۔ بھائی تم بھیڑیے سے بہت کچھ مماثلت رکھتے ہو لیکن بھیڑیا پچھلی
ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہوتا۔

جلال بے وقوف بڈھے، خاموش۔

مبارک۔ خدا تمہیں خوش رکھے بھائی!

جلال۔ (عباس کی طرف مخاطب ہو کر) کیا یہ شخص پاگل ہے؟

عباس۔ ہاں بھائی، مجھ سے بھی زیادہ پاگل۔ مجھے تو کبھی کبھی دیوانگی کا دورہ
پڑتا ہے لیکن یہ آٹھوں پہر یکساں رہتا ہے۔

مبارک۔ تمہارے چہرے سے کس قدر رحمدلی ٹپکتی ہے۔ تمہارا اصلی نام
کیا ہے، بھائی!

(جلال اور چڑ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے)

عباس۔ (مبارک کی مثال سے حوصلہ پکڑتے ہوئے) بھائی بھیڑیے، اسے
کاٹو، اور کاٹو! یہ تم سے اور زیادہ محبت کرے گا۔

جلال۔ چپ رہو، ورنہ میں تمہاری زبان کاٹ لوں گا۔

مبارک۔ بھائی پہلے میری زبان کاٹو، یہ اس سے زیادہ لمبی ہے اور
جتنی زیادہ کاٹو گے۔ تمہارے لئے اتنا ہی مفید ہوگا۔

جلال۔ یہ شخص صحیح الدماغ معلوم نہیں ہوتے۔

عباس۔ (یقین دلاتے ہوئے) ہاں بھائی ہم دیوانے ہیں۔

مبارک۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا دل پہلے حاصل کر لو۔ میری ہڈیوں پر
کافی گوشت نہیں ہے لیکن میرا دل گداز ہے۔

ناصر۔ سردار، یہ لوگ تمہارا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

جلال۔ ممکن ہے۔ لیکن ذرا صبر کرو، میں ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ ہاں
جی، تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟

مبارک۔ وہ سامنے نیچے سے —— غزنی سے۔

جلال۔ کیوں؟

مبارک۔ تم سے ملنے کے لئے بھائی۔

جلال۔ کس غرض سے؟

مبارک۔ تمہاری مدد کے لئے کیونکہ تم دکھ میں ہو۔

جلال۔ (اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے) اچھا!

مبارک۔ تمہارے جسم کے لئے (جو ایک حقیر سی چیز ہے) کھانا لایا ہوں۔

اکبر۔ سردار ہوشیار رہنا۔ اس نے کھانے پر جادو کر رکھا ہے۔

مبارک تمہاری روح کے لئے جو ایک عظیم الشان چیز ہے! آہ بھائی، تمہاری
روح، تمہاری روح خطرے میں ہے

اکبر۔ اور تمہاری زندگی بھی۔

(اپنا خنجر بلند کرتا ہے)

مبارک۔ بھائی بھیڑیے تمہارے اعمال اچھے نہیں۔ تم نے بہت ظلم کئے

ہیں۔

(اکبر حیرت زدہ سا ہو کر اپنا منہ جھکا لیتا ہے)

شرم کرو بھائی۔ شرم کرو۔

ناصر۔ سردار، اسے قتل کیوں نہیں کرتے؟

اکبر۔ خاموش، ناصر!

مبارک۔ تم نے بے دریغ ظلم کئے ہیں اور خون کی ندیاں بہائی ہیں۔ تم نے لوگوں کے مال چھین لئے اور اُن کی بستیوں کو نذرِ آتش کیا ہے، تم نے ہر چیز کو پامال اور ضائع کر دیا اور وہ نعمتیں جو خدا نے تمہیں عطا کیں تم نے بے پروائی سے ٹھکرا دیں۔

جلال۔ خدا نے مجھے نعمتیں عطا کیں؟

مبارک۔ کیا اس نے تمہیں دل جیسی نعمت عطا نہیں کی، اور آنکھیں اور دماغ کیا اس نے تمہیں جسم و کرم اور عقل عطا نہیں کی؟ کیا اس نے تمہیں بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے قوت عطا نہیں کی اور اس کے بجائے ـــــ تمہارے دل میں نفرت ہے، تمہاری آنکھوں میں کوری ہے۔ تمہارے دماغ میں جہنم جل رہا ہے اور تمہارے ہاتھ خون سے آلودہ ہیں اور کیا اس تمام دکھ میں تمہیں دیکھ کر میرا دل رنجیدہ نہ ہو؟

جلال۔ ملا، تم کتنے نڈر ہو، کیا تمہیں جان کا خوف بھی نہیں؟

مبارک۔ اپنے بجائے تمہاری جان کا خوف ہے بھائی، تمہارے سامنے گڑھا ہے اور اس میں آگ جل رہی ہے اور اس کے شعلے اُس روح کو لپیٹ رہے ہیں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ آہ بھائی! یہ آتشیں گڑھا اپنا خوفناک منہ کھولے ہوئے جہاں کہیں تم جاتے ہو تمہارے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے (جلال اور اس کے ساتھی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں) دیکھو اس کے شعلے تمہارے پاؤں کو چھو رہے ہیں، اور اب تمہارے ہاتھوں کو اور اب تمہارے گلے کو اور تمہارے دل کو۔

سب ڈاکو۔ سردار خدا کے لئے ہمیں اس عذاب کے فرشتے سے بچاؤ۔

مبارک۔ اور اب ـــ اور اب ـــ اور اب

(ایک زبردست گولہ ہنسنے پیدا ہوتی ہے، بلندی سے ایک چٹان ٹوٹ کر گرتی ہے اور اس کے ساتھ ٹکڑوں کا ایک انبارِ عظیم لڑھکتا ہوا اور اپنے ساتھ درختوں کو اکھیڑ کر بہاتا ہوا غار کے منہ پر سے گذر جاتا ہے)

سب ڈاکو۔ اوہ، اوہ، اوہ، پہاڑ ہم پر گر رہا ہے۔

(ڈاکو اِدھر اُدھر بھیچتے پھرتے ہیں۔ عباس، بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ لڑھکتا ہوا مبارک کے قدموں پر آن گرتا ہے، اور کانپ رہا ہے)

عباس۔ بابا، بابا، مجھے اپنے آغوش میں چھپا لو ورنہ میں بھی لڑھک جاؤں گا۔

مبارک۔ بیٹا ڈرو نہیں۔ یہ تو صرف میرے بھائی پہاڑ نے اپنے آپ کو ذرا جھنجوڑا ہے۔

عباس۔ کاش یہ پہاڑ کے بجائے کوئی اور بھائی ہوتا۔ اوہ، پھر وہی طوفان۔

(ایک اور چٹان ٹوٹ کر گرتی ہے، ڈاکو حالتِ اضطرار میں بھاگ نکلتے ہیں لیکن جلال اپنی جگہ پر گھٹنوں کے بل پڑا ہے۔ وہ مبارک کی طرف دیکھ رہا ہے جس کے ساتھ عباس اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے چمٹا ہوا ہے)

مبارک۔ لو ختم ہو گیا بیٹا۔

عباس۔ تو چلو بابا اب ڈاکوؤں کی واپسی سے پہلے بھاگ جائیں۔ میں تمہارے بند کھول دیتا ہوں اور پھر تم میرے کھول دینا۔

مبارک۔ لیکن بیٹا ہم بھاگیں کیوں؟ بھائی بھیڑیئے کو ہماری ضرورت ہے

عباس۔ واقعی بابا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام دانت جھڑ گئے ہیں

(عباس کا اندازہ صحیح نکلتا ہے کیونکہ جلال بڑھ کر دونوں کی رسیاں کاٹ دیتا ہے)

جلال۔ بابا، خدا کے لئے اپنی بددعا مجھ پر سے ہٹا لو اور اپنے قہر و غضب کا مورد مجھے نہ بناؤ۔ میں ابھی مرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

مبارک۔ بھائی میں نے تم پر کون سا غضب نازل کیا ہے۔

جلال۔ تو پھر یہ قیامت کیوں برپا ہوئی؟

مبارک۔ بھائی یہ تو تھوڑی سی مٹی گری ہے۔ بادِ ارض نے ذرا مٹھی کھولی تھی لیکن پھر اسے رحم آگیا اور اس نے کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔

جلال۔ تو پھر یہ کیوں گری۔

مبارک۔ مجھے کیا خبر بھائی۔ آؤ اب اپنے آدمیوں کو بلاؤ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

جلال۔ وہ سب بھاگ گئے ہیں بابا، اب میں اکیلا ہوں۔

مبارک۔ نہیں بھائی تم اکیلے نہیں ہو۔

جلال۔ بابا، تم کس قدر عجیب انسان ہو۔

مبارک۔ میں غزنی کا ایک بے وقوف باشندہ ہوں میرا نام جلال ہے کیا تم نے کبھی میرا نام نہیں سنا۔ لوگ میرا ذکر کرتے ہوئے ہنستے ہیں۔

جلال۔ کیا تم غزنی کے باشندے ہو،

مبارک۔ ہاں غزنی میری مادرِ وطن ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔

جلال۔ میری ماں بھی یہی ہے لیکن اس نے مجھے باہر نکال دیا۔ اس نے میرے لئے انصاف کے دروازے بند کر دئے، اس نے میرے ہی گھر میں مجھے لوٹ لیا، بازاروں میں میرا مضحکہ اڑایا، گلیوں میں مجھ پر پتھر پھینکے، اس نے مجھ پر لعنت اور نفرتیں بھیجی اور پھر میرے قتل کے درپے ہو گئی اور اب کیا میں اپنا انتقام نہ لوں؟

مبارک۔ ہاں پوری طرح انتقام لو بھائی ـــــ رحم و کرم کے ذریعے سے!

جلال۔ میں رحم کروں؟

(حیرت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے)

مبارک۔ اِدھر آؤ بھائی، میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو کیا وہ حسین نہیں ہے؟

(جلال دیکھتا ہے لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک نفرت اور غصہ ٹپک رہا ہے۔ اس کا ہاتھ خنجر کے قبضے پر ہے)

اس کے چہرے کی طرف دیکھو۔ وہ سورج کی روشنی میں تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے میناروں کی طرف دیکھو جو چمکیلی لکیروں کی طرح اس کی دیواروں پر کھڑے ہیں، اور اس کے چھت جو پروں کی طرح اس پر پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی کھڑکیاں متعدد آنکھوں کی طرح اس کے کان بھی ہیں، اور ہاتھ اور پاؤں اور ان سب کے علاوہ اس کا ایک دل بھی ہے اور اس دل میں تمہارا خوف۔ وہ نیچے دیکھو، گلیاں، دروازے اور بازار اور گھر امیر اور غریب دونوں کے لئے۔ اور ان گھروں میں مردوں کی آواز کی موسیقی اور بچوں کے قہقہے گونج رہے ہیں اور پھر آنسو، غمناک چیخیں اور غصہ۔ لیکن اس کے حسن کو دوبالا کرنے والا غم و غصہ نہیں اور نہ ان پر اس کے میناروں کی طاقت منحصر ہے اور تمہارا خوف اس کے دل کو مسرور نہیں کر سکتا۔

آؤ بھائی میرے دل کے ساتھ اپنے دل کو بھی اس شہر میں بھیجو۔ اِس مکان میں ایک عورت ہے جو اپنے ننھے بچے کو دودھ پلا رہی ہے بچہ اپنی ماں سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ایک مکان ہے جس میں ایک نوجوان اپنی دلہن کو لایا ہے۔ وہ دروازہ بند کر کے مڑتا اور اپنی دلہن کا منہ چوم لیتا ہے۔ اِن کے لبوں پر محبت کی چاشنی کتنی شیریں ہے اس مکان میں ایک آدمی بسترِ مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ وہ کسی وقت تنومند اور بہادر تھا لیکن اب کمزور اور بے چارہ ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے کئی افعال کئے۔ اکثر بُرے لیکن کبھی کبھی اچھے۔ اب موت آپہنچی ہے مگر اُسے کچھ نہیں سوجھتا لیکن اس کے اچھے اعمال اسے کسی قدر تسلی دے رہے ہیں۔

(جلال کے چہرے پر رحم کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں اور اس کا ہاتھ خنجر کے قبضے سے علیحدہ ہو جاتا ہے)

لیکن اس کے دل میں نفرت کے بجائے محبت تھی اس لئے وہ تنہا نہیں ہے۔

(مبارک اپنا ہاتھ جلال کے سینے پر رکھ دیتا ہے)

آہ۔ بھائی تیرے دل کو کون سی چیز حرکت دے رہی ہے کہ یہ اچھل رہا ہے۔ آؤ میں تجھے بتاؤں ـــــ ایک شخص ایک دفعہ بلندی پر کھڑا ہوا اس شہر کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس شہر میں بہت سے گناہ ہوئے تھے۔ اس شخص کے ساتھ خدا کا ایک فرشتہ بھی کھڑا تھا جو شہر پر عذاب نازل کرنے آیا تھا۔ اس نے فرشتے سے کہا "اگر اس شہر میں صرف پچاس نکو کار مل جائیں تو کیا تم پچاس کے لئے درگذر نہ کرو گے؟" اس نے کہا "ہاں میں پچاس کے لئے معاف کر دوں گا۔" پھر اس نے کہا "اور اگر اس میں سے پانچ کم ہوئے تو؟" "تو میں پانچ کی کمی کے لئے شہر کو برباد نہ کروں گا"، "اور اگر چالیس ہی ہوئے تو؟" "تو میں دس کی کمی کے لئے تباہ نہ کروں گا" "اور اگر تیس ہی نکلے تو؟" "تب بھی نہیں" فرشتے نے کہا "اور اگر بیس ہی نکلے تو؟" "تو بیس کے لئے بھی معاف کر دوں گا۔"

(جلال اپنی کمر سے خنجر اتارتا ہے)

پھر اس نے کہا "خدا بڑا ہی رحیم و کریم ہے، مجھے ایک دفعہ اور کہنے دو کہ اگر دس آدمی نکو کار نکل آئیں؟" فرشتے نے کہا "میں دس کے لئے بھی عذاب نازل نہ کروں گا۔"

(جلال کی پیٹھ اور خنجر زمین پر گر جاتا ہے۔ عباس دبی آواز میں دعائیں کر رہا ہے)

بھائی بھیڑیے تم گناہ گار ہو، میں بھی گناہگار ہوں۔ کیا اتنے گناہوں کے باوجود تم دوسروں کے گناہ معاف نہیں کر سکتے۔ دیکھو خدا بے گناہ ہونے کے باوجود دوسروں سے درگذر کرتا ہے۔

(جلال دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتا ہے ــــ دور سے اذانوں کی آواز آتی ہے)

عباس۔ سنو بابا! اذان کی آواز آتی ہے۔

مبارک۔ ہاں، ہاں غزنی میں اذانیں دی جا رہی ہیں۔ تمہارے لئے۔ آؤ میں تمہیں دس آدمی اس شہر میں ایسے دکھاؤں گا جو تمہارا خوف اٹھ جانے سے خوش ہوں گے، دس نہیں، بیس، چالیس، پچاس، سو . . . بھائی بھیڑیے!

(جلال سسکیاں لیتا ہوا اپنے ہاتھ مبارک کی طرف اٹھاتا ہے)

جلال۔ میں اندھا ہوں بابا، مجھے راستہ دکھاؤ ــــ میری زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا، ہاں، ہاں جاؤں گا۔

عباس۔ بابا میں کتنا بے وقوف ہوں۔ میں یہاں آتے ہوئے ڈرتا تھا۔

(مبارک خاموشی سے سنتا ہے اور کچھ جواب نہیں دے سکتا)

مظفر احمد

شعر

آپ کا اعتبار کون کرے
رات دن انتظار کون کرے

کون؟

شمیم زلف معنبر سنگھار رہا ہے کون؟
یہ جسم و روح کو بے خود بنا رہا ہے کون؟
یہ شکل نور مرے دل میں آ رہا ہے کون!
سیاہ خانے کو ایمن بنا رہا ہے کون؟
دل و دماغ میں میرے سما رہا ہے کون!
حواس و ہوش پہ قبضہ جما رہا ہے کون!
یہ میری لاش پہ پھر مسکرا رہا ہے کون!
یہ میرے جسم میں پھر جان لا رہا ہے کون!
یہ کس کا درد مجھے بے قرار رکھتا ہے
یہ میرے سینے میں نشتر چبھا رہا ہے کون!
الٰہی شب کی سکوں آفریں خموشی میں
یہ بار بار تصور میں آ رہا ہے کون؟
جو تھک کے بیٹھ گیا ہوں رہِ محبت میں
تو میرے عزم کو ہمت دلا رہا ہے کون
یہ اپنی دشمن صبر و سکون نگاہوں سے
دل و دماغ پہ بجلی گرا رہا ہے کون
یہ کون نظم میں شاہد کی کیف بھرتا ہے
یہ شعر بن کے تخیل میں آ رہا ہے کون!

شاہد رام پوری

مناظرِ فطرت

برسات

برسات کی دلفریبیاں عام ہوئیں
سورج کی گردشیں بھی ناکام ہوئیں
بادل کبھی کھل گئے کبھی گہرائے
دن بھر میں کئی صبح کئی شام ہوئیں

بھونرا

بھونرے پہ درد راگ گائے آئے
جذبات کے طوفان اٹھائے آئے
کلیوں نے حجاب سے جھکالی گردن
کس جوش سے درد دل سنائے آئے

پپیہا

آئی پھر پی کہاں کی آواز آئی
تسکین ہوئی صدائے دمساز آئی
مجھ کو بھی رہی عادتِ فریاد مدام
اس کی بھی طبیعت نہ کبھی باز آئی

[illegible]

نازک نوشگفتہ زرفشاں ہیں کچھ پھول
نیلے کچھ پھول ارغواں ہیں کچھ پھول
گلزار میں تتلیاں نہیں رقصاں ہیں
آغوشِ نسیم میں رواں ہیں کچھ پھول

جگنو

جگنو نہیں فلک سے ہے بارش نور
یا دوش نسیم پر رواں شعلۂ طور
یا سایۂ ماہ سے ہیں چھلکے قطرے
یا برق کے ذروں سے فضا ہے معمور

مور

نظارے کے واسطے ہیں زرکیب جلوے
یہ روح نواز حسن آگیں جلوے
سانے ہیں درختوں سے ہیں رقصاں طاؤس
یا ابر میں قوس سے ہیں رنگیں جلوے

کنول

پھولوں سے کنول کے بھر گئے ہیں تالاب
یہ حسن، یہ رنگ، یہ شباب
ہاتھوں سے کسی مست کے پھیلا دی ہے
بلوری پیالیوں میں کچھ سرخ شراب

ہنس

موجوں پہ ندی کی جگمگاں ہوتے ہیں
سینے تلے نہ ہوئے رواں ہوتے ہیں
ہنسوں کی خوشی دیکھ کے قابل ہے جب
جھنکار کے یہ گہر فشاں ہوتے ہیں

مرزا عباس بیگ

نواب حسین نواز جنگ مرحوم

اور

اُن کی شاعری

نواب حسین نواز جنگ بہادر مرحوم کا نام ان کے والد خان بہادر تاج الدین صاحب مرحوم جج لکھنؤ نے محمد معراج الدین رکھا تھا۔ مگر ان کے نانا مولوی محمد اکرام اللہ خان المخاطب بہ نواب یار جنگ مرحوم نے حسین یاور خاں نام رکھ دیا۔ اور یہ دونو نام مشہور ہو گئے۔ ابتداءً طغیانی رودِ موسیٰ (۱۹۰۸ء) سے پہلے یہ حیدر آباد آئے تو معراج الدین ہی تھے مگر اس کے بعد جب وطن جا کر دوبارہ حیدر آباد آئے تو حسین یاور خاں رہے۔ چنانچہ اسی نام نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مرحوم کاکوری کے مشہور اور ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے نانا نواب یار جنگ بہادر ابتداءً گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازم تھے۔ مگر بعد کو پنشن لے کر حیدر آباد آ گئے اور یہاں صوبیداری پر تقرر ہوا۔ مدت تک صوبہ گلبرگہ شریف پر رہے۔ گلبرگہ کی موجودہ آبادی گلزار حوض۔ چاروں کمانیں۔ دو دو تالاب اوّل تعلق داری اور صوبہ داری کا دفتر نواب یار جنگ مرحوم ہی کی حسنِ توجہ سے بنے ہیں۔

حسین نواز جنگ بہادر کی ولادت بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی۔ فارسی بھی جانتے تھے۔ عربی بھی پڑھی تھی۔ انگریزی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ لکھتے تو بالکل نہ تھے۔ مگر بولتے خوب تھے۔ اُردو کے کیا کہنے پہلے تو مادری زبان پھر کاکوری کے ذی علم اور شریف گھرانے کی پیدائش چونکہ کاکوری لکھنؤ ہی کا ایک محلہ کہلا سکتی ہے۔ اس لئے مرحوم کی زبان بالکل لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی۔ مطالعہ کا شوق بہت تھا۔ تقریر کی ادب (لائٹ لٹریچر) کا مطالعہ بہت کرتے تھے۔ اخبارات اور رسائل بھی دیکھتے رہتے۔ شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی شعر لکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ ذوقِ شعر بڑا اچھا تھا۔ خود اتنے اچھے شاعر نہ تھے۔ جتنے اچھے کہ نقاد تھے۔ اساتذہ کے چوٹی کے شعر لوکِ زباں تھے۔

ابتداءً (۱۹۰۸ء) تحصیلدار ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد مستعفی ہو کر وطن چلے گئے اور پھر دوبارہ ۱۹۱۶ء کے بعد آ کر پھر تحصیلدار ہوئے اور مددگار ناظم کورٹ آف وارڈز بھی رہے۔ اور دوم تعلقدار ہو کر مومن آباد پہنچے چونکہ گلبرگہ سے ایک قسم کا انس تھا اس لئے کوشش کر کے ڈویژن شورا پور پر تبادلہ کرا لیا۔ اور مدت تک وہیں رہے۔ شورا پور کو مالکِ محروسۂ سرکارِ عالی کا "ارضِ نغمہ" کہا جائے تو بے جا نہیں "بلدۃ الموسیقی" نہ صرف فردوسِ گوش ہی ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ جنتِ نگاہ بھی ہے۔ اس کی لطافتوں نے مرحوم کو ایسا لبھا لیا کہ گلبرگہ کے اول تعلقدار بھی ہو گئے تو شورا پور سے غافل نہ ہو سکے دورہ کے پروگرام میں شورا پور ہمیشہ نمایاں رہتا تھا اور جب وہاں پہنچتے تو واپسی مشکل ہو جاتی تھی۔ ان کے شاعرانہ جوہر اور لطائفِ طبع کچھ شورا پور ہی میں ظاہر ہوتے اس نغمہ زار میں وہ بُری طرح گم ہو جاتے تھے ———

چونکہ امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے کھانے۔ کھلانے۔ پہننے پہنانے کا شوق بھی بہت تھا۔ نہائت کم خوراک تھے مگر زبان ذرا چٹوری تھی۔ دو ہی نوالے کھاتے مگر لذیذ سے لذیذ اور عمدہ سے عمدہ۔ دنیا میں ان کے محبوب مشغلے دو ہی تھے۔ "کھانا اور گانا" بہترین کھانے پکواتے۔ خود کھاتے۔ دوسروں کو کھلاتے اور گانا سنتے۔ محض قسم قسم کے کھانے پکوانے اور لوگوں کو مدعو کرنے کی خاطر نیازیں ہوتیں فاتحہ ہوتے بعض دفعہ لوگوں کو کسی نہ کسی نیاز کا نام کہہ کر مدعو کر لیا جاتا مگر نہ تو نیاز دلوائی جاتی اور نہ فاتحہ۔ نیت ہی کافی سمجھی جاتی تھی۔ ہمیشہ دسترخوان پر دس بارہ آدمی رہتے۔ تنہا کھانے کے عادی نہ تھے۔ ایکیلے میں ایک نوالہ بھی ان کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ یہی حال گانے کا تھا۔ خود گاتے نہ تھے اور نہ گانا جانتے تھے مگر طبیعت کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ اچھے بُرے کی تمیز فوراً کر لیتے تھے۔ کسی نے گاتے ہوئے خدانخواستہ کسی اور انہوں نے ٹوکا۔ اچھی چیز کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ اس

خصوصیت کی وجہ سے لوگ انہیں بھی بڑا ماہر موسیقی سمجھتے تھے۔ مگر دراصل ایسا نہ تھا۔ اُردو بڑی اچھی لکھتے تھے اور برداشتہ قلم لکھنے کے عادی تھے۔ مگر لکھنے سے بہت جی چراتے تھے۔ لکھواتے بہت تھے۔ خط بڑا پاکیزہ اور خاصہ پختہ تھا حروف بڑے بڑے اور پھیلا کر لکھا کرتے اور شکستہ خط کے چوڑ پورے لکھتے تھے۔

کپڑوں کا شوق بھی بہت تھا۔ مگر طبیعت شوخ رنگوں کی طرف زیادہ راغب تھی۔ بیل بوٹی اور پھولدار کپڑوں کی رنگین شیروانیاں۔ دھاری دار ریشمی قمیص بہت پہنتے تھے۔ مگر سلوانی کے معاملہ میں کچھ زیادہ شوقین نہ تھے کبھی بہترین درزی کے پاس شیروانیاں سلوائی جاتیں تو کبھی معمولی درزی کے پاس مگر کپڑوں کے پہننے سے زیادہ تقسیم کرنے کا شوق تھا۔

اپنے ملنے والے دوستوں اور خاص خاص ماتحتوں سے سلوک کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ تحفے دینے کا بھی بہت شوق تھا۔ کٹا میں۔ قلم سگریٹ کیس۔ ڈبیاں۔ پان دان غرض مختلف قسم کے تحائف اپنے احباب اور ماتحتوں کو ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

میزبانی کا شوق بھی تھا۔ لوگوں کو بلا بلا کر مہمان رکھتے اور مہمانوں کی ہر قسم کی تکلیف کا خیال رکھتے تھے۔ باہر سے آنے والوں کو گلبرگہ کی مصنوعات اگر بڑیاں۔ مصالحہ۔ اگر بتیاں۔ نوار۔ شطرنجیاں وغیرہ منگوا کر ساتھ کر دیتے تھے۔

پان کا شوق کچھ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ پان اور اس کے لوازمات میں خاصا تکلف بلکہ مبالغہ کرتے تھے۔ پان بھی لکھنؤ سے منگوائے جاتے اور قوام اور کتھا بھی لکھنؤ ہی سے آتا۔ دن بھر پان ہی کا شوق ہوتا تھا۔ پندرہ بیس چھوٹے چھوٹے پکے پانوں کی تین چار گلوریاں۔ آدھی چھٹانک چھالیہ۔ اتنی ہی چکنی ڈلی۔ دس بارہ الائچیاں اور آدھا تولہ مشکی قوام ——— یہ سُنہ میں ٹھونس لیتے اور تقریباً آدھے گھنٹہ تک چباتے ——— غالباً اسی پان خوری کی وجہ سے تقریباً سامنے کے دانت پورے نکل گئے تھے۔ اس لئے مصنوعی دانت استعمال کرتے تھے۔

طبیعت میں نفاست اور صفائی بہت زیادہ تھی۔ کھانا۔ کپڑا۔ مکان ہر چیز نفیس رہتی تھی۔ عطر اور پھول بھی بہت پسند تھے۔ ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا عطر استعمال کرتے تھے اور عموماً عطر اصغر علی محمد علی کے پاس سے منگوایا کرتے تھے۔

خود تو وقت کے پابند نہ تھے مگر ماتحتوں کو ہمیشہ پابند وقت اور چست و چالاک دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے نوجوان ماتحتوں اور ملازموں کا انتخاب کرتے تھے۔

دفتری کام سے تفصیلی طور پر واقف تھے۔ مال کے کام کا تجربہ بھی خاصا تھا۔ مگر لکھنے سے جی چراتے تھے۔ اسی لئے لوگ انہیں ناواقف خیال کرتے تھے۔ صفحوں کے صفحے اور لمبے لمبے فیصلے کہہ کر لکھوایا کرتے تھے۔

اخلاق نہائت اچھے تھے۔ نماز کے پابند نہ تھے۔ مگر پڑھتے رہتے تھے بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت تھی۔ خواجۂ دکن حضرت گیسو دراز کی بارگاہ میں ہر ہفتہ حاضری دیتے تھے۔ ہر مہینے بزرگانِ دین کی نذر و نیاز ہوتی تھی۔ قلندریہ گھرانے میں بیعت تھی۔ اور اس سلسلہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کیرکٹر نہائت مضبوط تھا۔ میں نے تین ایک سال تک ماتحتی کی چونکہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے اور تقریباً تین ساڑھے تین سال تک مجھے مرحوم کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا مگر میں نے ان میں کوئی اخلاقی کمزوری نہیں پائی۔ اپنی وضعداری خاندانی وجاہت اور نسبی وقار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اور حد درجہ کے پاکباز تھے۔

جہاں اتنی خوبیاں تھیں۔ وہاں چند عیب بھی تھے۔ سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ کانوں کے کچے تھے۔ چونکہ بھولے بھالے سیدھے سادے مسلمان تھے۔ اس لئے ہر ایک پر اعتماد کر لیتے تھے۔ مردم شناسی نام کو نہ تھی۔ آج اس نے اُس کی شکائت کی اُس سے خفا ہو گئے۔ کل اُس نے اِس کی شکائت کی اسے نکال باہر کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مستقر کے عہدہ داروں سے اور ان سے صفائی نہ تھی اور ماتحت اور احباب بھی اس تلوّن اور ہنگامہ پسندی کی وجہ سے مشوش رہتے تھے۔ آخر میں طبیعت بہت زیادہ مائل بہ خوشامد ہو گئی تھی بعض زمانہ سازوں نے جھوٹی شکائتیں اور خوشامد کر کے اس طرح شیشہ میں اتار لیا تھا کہ دنیا بھر سے برائی مول لی۔ آخر میں اُنہی خوشامدیوں نے دغا کی اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ قدرت منتقم حقیقی ہے وہ بھلا ایسے لوگوں کو کہاں چین لینے دیتی۔ ایک شخص تو بلدہ آ کر نہائت بُری حالت سے صبح سرائے میں سپرد اجل ہوا مگر اب بھی دو ایک باقی ہیں۔ خدا اُن پر رحم کرے۔ بہرحال بعض ناسپاس گزاروں نے انہیں خاصا نقصان پہنچایا اور وہ وظیفہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر وطن گئے اور وہاں تقریباً نو سال رہ کر کاکوری ہی میں ۲۴ مئی ۱۹۴۵ء کو بعارضۂ سکتۂ قلب انتقال کیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضور بندگانِ عالی متعالی مدظلہٗ سے بڑی عقیدت اور دکن سے بہت محبت تھی۔ آخر وقت تک مجھ سے خط و کتابت رہی ہر وقت یہی لکھتے کہ قریب میں حیدرآباد آؤں گا۔ ممکن تھا کہ وہ پھر حیدرآباد آتے مگر موت سر پر کھڑی تھی۔

یہ تھے مرحوم کے مختصر حالات۔ اب شاعری کا حال سنئے۔ انہیں بچپن

سے شعر و سخن کا چسکا تھا۔ اور کہتے تھے کہ بچپن ہی میں انہوں نے شاعری شروع کی تھی خسرو تخلص کرتے تھے۔ غزل، قصیدہ، قطعہ سبھی کہتے تھے۔ مگر ان اصنافِ سخن میں سے غزل ہی ان کی اچھی ہوتی تھی۔ بعض دفعہ فکاہیہ رنگ میں بھی نظم یا غزل کہہ ڈالتے مگر اس میں کوئی خاص بات نہ ہوتی تھی۔ چونکہ طبیعت حاضر اور رگ رگ میں زندہ دلی بھری تھی۔ اس لئے یہ بے اعتدالی بھی کر گزرتے مگر فحش اور پھکڑپن پھر بھی پاس نہیں پھٹکنے پاتا تھا۔ شعر گوئی کا یہ حال تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک نشست میں دو دو غزلیں کہہ ڈالتے اور بعض دفعہ مہینوں کچھ نہیں کہتے تھے۔ عروض اور قافیہ پر عبور نہ تھا۔ مگر فطری موزونیت اور اساتذہ کے کلام کے غائر مطالعے اور ذوق کی وجہ سے عروض اور قافیہ کی غلطی شاذ ہی کرتے تھے۔ تین مجلد کتابوں میں غزلیں، قصیدے وغیرہ تھے۔ جنہیں میں نے مرتب اور مرتب کر کے ایک جگہ دیوان کی صورت میں خوش نویس سے صاف کرا دیا تھا۔ کم و بیش تین ہزار غزلیں دو چار سو قصائد اور ساقی نامے اور مخمس اور مسدس اور ترجیع بند اور قطعات ہوں گے۔ چند فارسی غزلیں بھی تھیں مگر فارسی کلام میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میرے پاس اس وقت مرحوم کی ڈیڑھ سو غزلیں ہیں جن میں سے کچھ انتخاب پیش ہے۔ سنا ہے کہ مرحوم کے کوئی عزیز دیوان طبع کرانے والے ہیں۔ خدا کرے اُن کا ارادہ پورا ہو۔ اگر وہ دیوان چھپوانے سے پہلے مجھ سے بھی تبادلۂ خیال کر لیتے تو بہتر تھا۔ مرحوم کے کلام کا معتد بہ حصہ افسوس ہے کہ ناقابلِ اشاعت ہے ———

گو نواب حسین نواز جنگ خسرو لکھنؤ اسکول کے شاعر اور لکھنوی شاعری کے متبع تھے مگر اور شعراء لکھنؤ کی طرح چولی، انگیا، مسی، دھڑی تک اُن کی شاعری محدود نہ تھی بلکہ شعر میں کچھ وزن بھی ہوتا تھا۔ ان کے تخیل کی وسعت سننے والے کو دعوتِ فکر و تعمق بھی دیتی تھی۔ چنانچہ اس رنگ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

ہر دل کو ہے آرزو تمہاری ✦ ہر پاؤں کو جستجو تمہاری

وہ تو ہوسی ہی تھے غش بھی ہوئے ہوش آ بھی گیا ✦ ہم تری آنکھ سے گرتے تو سنبھلتے کیونکر

بعض شعر اس قدر بلند کہے ہیں کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

کیا چیز ساتھ لائے ہیں کوئے حبیب سے ✦ ہاتھ آ گئی ہے درد کی دولت نصیب سے

زندگی مجسم امید ہے۔ یہی ایک چیز ہے جو زندگی کا سہارا ہے مگر یہ جب مبدل بہ یاس ہو جاتی ہے۔ تو پھر انسان میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ خسرو کی امید یاس بن کر ہائی رہ جاتی ہے۔ اور اس یاس آمیز ناامیدی کو وہ زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاس سی باقی ہے جو کچھ کچھ امید ✦ زندگی شاید اسی کا نام ہے

زندگی کا دارومدار صرف نفس کی آمد و شد پر ہے۔ مگر یہ نفس شماری انسان کب کرنے لگتا ہے۔ مقصدِ حیات کی عدم تکمیل ناامیدی اور نامرادی یاس و حرماں اور دل شکستگی کے بعد آرزوؤں۔ ارمانوں کو چھوڑ کر ——— ان دنوں جب کہ وہ اس آلام کدۂ عالم سے بالکل کنارہ کش ہونا چاہتا ہے تو پھر کہتا ہے۔

صرف اک تارِ نفس پر ہے مدار ✦ سچ تو یہ ہے کچھ نہیں انسان میں

انسان کی شوخی اور شرارت اسی وقت تک رہتی ہے جبتک کہیں آنکھ نہیں لگتی۔ دھڑ آنکھ لگی اور ادھر زندہ دلی، شوخی، شرارت سب غائب۔ ہائے، یہ سب کرتوت ہیں شباب کے، اس کے آتے ہی آنکھ بھی لڑ جاتی ہے شوخی بھی چلی جاتی ہے۔

شباب اس کو کیا ساتھ لیتا گیا؟ ✦ میرے دل میں شوخی تھی کیا ہو گئی؟

شاعری واقعہ یہ ہے کہ خاصی مصوری ہے۔ مصور اپنے مُوقلم سے لکیریں کھینچ کر آنکھوں کے سامنے ایک ہیولا پیش کر دیتا ہے۔ جو دعوتِ چشم کا سامان ضرور پیدا کر دیتا ہے مگر لذتِ تخیل سے کم مصور کسی کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔ یہ کام کسی شاعر ہی کا ہوتا ہے جو اپنے مُوقلم سے انہیں مانوس الفاظ میں ایک آدھ شعر ایسا لکھ دیتا ہے کہ آپ کا تخیل اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ آپ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو اس شعر کے کہتے وقت اس شاعر پر تھی اور آپ بھی وہی منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ جو اس نے دیکھا۔ دیکھئے حسین صیاد نظریں ملا کر بھنویں تان کر کس طرح ع

مرغِ دل کا شکار کرتا ہے

شکار اس کو منظور ہے مرغِ دل ✦ ملا کر نظر وہ بھنویں تانتا ہے

ہجر کی بے کسی سے لحد کو غنیمت وہی جانتا ہے جو ہجر کے آلام میں مبتلا ہو کر مجبور اور ناامید ہو چکا ہے۔

لحد ہجر کی بے بسی سے ہے اچھی ✦ اے موت اس زندگی سے ہے اچھی

مصرع ثانی کو پڑھئے ایک دیوان کا دم بھر کر تھک چکتے ہیں۔ یہی تو کہتے ہیں۔ اور انہیں پر کیا منحصر ہے۔ ہر سمجھ دار یہی کہتا ہے۔

قیدی قفس سے چھوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کا دھیان نہیں رہتا کہ قفس سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ اگر کوئی کہتے بھی کہ آشیاں زندہ

اجل ہو چکا تو وہ مانتا نہیں اور اپنے دل کو یہی کہہ کر سمجھاتا ہے۔

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مگر جب قفس سے چھوٹتے ہی آشیاں کے لئے چننے پڑتے ہیں تو قدرِ قفس معلوم ہوتی ہے۔

یہ خبر یارب نہ تھی کنجِ قفس سے چھوٹ کر ✦ تنکے ہم چنتے پھریں گے آشیانے کے لئے

حرماں نصیب اور ہجر زدہ طالب کا وصل بھی ہوتا ہے تو اُسے یقین نہیں آتا کہ واقعی وصل ہی ہوا یا خواب تھا۔

کیا اور کہوں میں وصل کا حال ✦ رات ایک مزے کا خواب دیکھا

باتیں ہزاروں ہوتی ہیں مگر کہنے کی کونسی ہوتی ہیں اور نہ کہنے کی کونسی۔ یہ وہی جانتا ہے جو آدابِ عاشقی سے واقف ہو۔ ہر بوالہوس اس کو نہیں جان سکتا۔

جسے تم سن نہیں سکتے جسے ہم کہہ نہیں سکتے ✦ وہی سننے کی باتیں ہیں وہی کہنے کی باتیں ہیں

یہ سچ کہ انسان عاشق ہوتے ہی صاحبِ دل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شب بیداری اور سحر خیزی کی دولت بیک وقت اسے نصیب ہو جاتی ہے۔

دل جب سے پڑا ہے کسی بے درد کے پالے ✦ ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کے کیا کرتے ہیں نالے

پھر وہی امید کا رونا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی "دھوکے" میں انسان اپنی عمر گزار دیتا ہے۔

یونہی امید امید میں عمر تمام ہو گئی ✦ شام سے صبح ہو گئی صبح سے شام ہو گئی

زبان کے شعر خسرو بہت صاف کہتے تھے۔ روزمرہ نہائت فصیح تھا تیور تو بس بلا کے ہوتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بت اپنے آپ کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں ✦ خدا کی مار سمجھ پر خدا سمجھتے ہیں

ادا پہ جو نہیں مرتے وہ کیا سمجھتے ہیں ✦ وہ اور کچھ ہے جسے سب قضا سمجھتے ہیں

بنے جو راحتِ جاں پھر وہی آزارِ جاں کیوں ہو ✦ الٰہی مہرباں ہو کر کوئی نامہرباں کیوں ہو

نہ مہندی ہو نہ افشاں ہو نہ مسی ہو نہ کاجل ہو ✦ جب ایسی سادگی ہو تم سو کوئی بدگماں کیوں ہو

دو قدم چلنا تمہارا ناز سے ✦ لاکھ چالیں چھم چھم نیلی فام کی

ہے وہی جنت یہاں مل جائے آج ✦ ایک بوتل بادۂ گل فام کی

جب تم نہ ہو تو عیش میں کیا خاک مزا ہو ✦ جنت بھی مرے واسطے دوزخ سے سوا ہو

غیروں کے سنانے کو مجھے کوس رہے ہیں ✦ اور دل میں یہ کہتے ہیں کہ مر جائے تو کیا ہو

جب سے پہلو میں وہ نگار نہیں ✦ چین دل کو نہیں قرار نہیں

مر کے بھی انتظارِ محشر ہے ✦ قبر میں بھی مجھے قرار نہیں

بڑھایا باغباں نے ربط پھر صیاد گلچیں سے ✦ بہار آئی چمن میں پھر شگوفے کھلنے والے ہیں

گلے میں باہیں باتیں پیار کی تیور خوشامد کے ✦ بغیر اب دل لئے پہلو سے وہ کب اٹھنے والے ہیں

بلا سے گالیاں دیتے ہیں وہ دعا نہ سہی ✦ زباں سے نام تو لیتے ہیں بار بار مرا

بات دل کی کہہ گئے وہ کان میں ✦ اب ذری جان آئی میری جان میں

عاشقوں کے لئے منزل کی ضرورت کیا ہے ✦ پاؤں پھیلا کے جہاں سو گئے منزل ہے وہی

نہ آنسو پھر کریں گے صورتِ شمع ✦ مجھے چھیڑو سرِ محفل سمجھ کر

حسینوں کا زیور ہے یہ بے نیازی ✦ تری تمکنت عاجزی سے ہے اچھی

اک نالہ ترا اے دلِ ناکام بہت ہے ✦ خاموش کہ نازک وہ گل اندام بہت ہے

شبنمِ گل برق و باراں جام و مینا کا ہی ساتھ ✦ کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

اس شعر کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ کیا کہا ہے۔

کل اپنی سرِ عرش تھی منزلت ✦ تجھے لے زمیں آج دو بھر ہیں ہم

محبت ہے و معشوق چھوڑ دیں خسرو ✦ خطا معاف یہ ہم سے تو ہو نہیں سکتا

یہ بجا غیر سے ملے جھک کر ✦ یہ غلط آپ ہیں خلیق بہت

مرا مکتوب سہل طولانی ✦ ان کا خط مختصر دقیق بہت

ایک کیا سو ملیں نہالے سے ✦ تم سلامت رہو رفیق بہت

مرحوم کی یہ غزل غالباً شوراپور کی طوائفوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ مدت ہوئی کہ ریکارڈوں میں بھی آ چکی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پہلو سے اٹھ گئے ہیں وہ جی مرا مانتا نہیں ✦ صبر و قرار کیسے ہو دردِ جگر کو کیا کروں

باغ و بہار ہے تو کیا ساقیٔ لالہ رو نہیں ✦ جام و سبو سے کیا غرض شمس و قمر کو کیا کروں

رات دن رہتی ہے دشنام کی مجھ پر بھرمار ✦ اسی انداز کو کیا کم سخنی کہتے ہیں

صدہا مجھ ایسے جن کو ہزاروں بُرا کہیں * ایسا ہے ایک تو کہ سب اچھا کہیں جسے

اسی کے ساتھ ساتھ ہم بعض ایسے شعر بھی نقل کئے دیتے ہیں جن سے مرحوم کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

خدا کرے کہیں موقع سے مجھ کو مل جائیں * مجھے حسین بہت پارسا سمجھتے ہیں

مرے پہلو میں جب تک وہ حسیں ہے * غم کونین کا خدشہ نہیں ہے

وہ اور ہی کچھ لطف ہے کچھ اور ہی لذت * صحبت میں حسینوں کی مزا اور ہی کچھ ہے

ہم نے دیکھے ہیں بہت ناز و ادا کے پُتلے * لے بتو اپنے یہ انداز و ادا رہنے دو

خوبرویوں نے بگاڑا ہے ہمارا بھی مزاج * چار پریوں میں جہاں بیٹھے سلیماں ہو گئے

خسرو کو بحر طویل میں شعر لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ افسوس ہے کہ اس وقت مرحوم کا جس قدر کلام میرے پاس ہے۔ ان میں طویل البحر اشعار نہیں ہیں حافظہ کی مدد سے چند شعر نقل کئے دیتا ہوں۔

یونہی جو اے دلستانِ عالم ادا تری جاں ستاں رہیگی
قضا کو پوچھے گا کون آخر اجل کہاں یہاں رہیگی

اگر یونہی کروٹیں بدلتا رہے گا تا حشر یہ زمانہ
نہ انقلابِ زمیں رہے گا نہ گردشِ آسماں رہے گی

ہزار مرجھائے غنچۂ دل رہیں گے گلہائے داغ تازہ
یہ وہ چمن ہے ہمیشہ جس میں بہار بن کر خزاں رہیگی

نہ پوچھ صیاد فصلِ گل میں کہ کیا اسیروں کا حال ہوگا
تڑپ تڑپ جائیں گے قفس میں نظر سوئے آسماں رہیگی

ہے آج بُلبُل کا پوچھنا کیا غضب سرِ شاخسار باتیں
ادھر لبِ غنچہ وا ہوا کیا نکل پڑیں بس ہزار باتیں

کسی کی حوریں کسی کی جنت ہمیں کسی اور سے محبت
سمجھ میں واعظ کے کیسی آئیں ہماری پروردگار باتیں

یہ چوری چوری نگاہ کرنا یہ دل میں چھپ چھپ کے راہ کرنا
یہ چپکے چپکے تباہ کرنا یہی تو ہیں ہو نہار باتیں

عجب مزے کی یہ زندگی ہے کہ میری قسمت سنور گئی ہے
ہوئی ہیں ان سے جو چار باتیں تو دل میں ہیں بیشمار باتیں

صبا ہو گلزار پُر فضا ہو شراب کا دَور چل رہا ہو
چمن ہو خسرو ہو مہ لقا ہو سناؤں پھر خوشگوار باتیں

سیّد تمکین کاظمی

رباعی

اخلاص و وفا کو عام کر دے یارب
ہر ایک دل میں اور بھر دے یارب
ہر چیز میں دیکھے جو تیرا جلوہ
ہر دیدہ و دل کو وہ نظر دے یارب

اثر صہبائی

جامِ صہبائی

(۱)

فطرت کا رباب ہو گیا ہے خاموش
نغموں سے مگر ابھی فضا ہے مدہوش
الہام کی کیفیت ہے طاری دل پر
خاموشیٔ شام ہے کہ پیغامِ سروش

(۲)

جو انجمِ ماہ میں ہے تابان و خموش
کہسار میں بھی وہی ہے حیران و خموش
انساں کے وجود میں ہے جو نغمہ و نور
ہے پیکرِ دہر میں وہ پنہاں و خموش

(۳)

دوشیزۂ کائنات اے حورِ بہشت
آئی ہے کہاں سے تو صبوحی پی کر
ہر سانس تری ہزار مستی بردوش
ہر جلوہ ترا ہزار جنت در بر!

(۴)

ساغرِ حسن کے ہیں گلہائے بہار
اک قلزمِ ہستی ہے روزِ زیبائے بہار
ستارۂ بزم ہے اک خیالِ رنگیں
ہے سے لدی ہوئی ہے غذائے بہار

اثر صہبائی

خوشبودار خط

لاہور سے اُن دنوں ایک ہفت روزہ اخبار "ماہتاب" نکلتا تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ اپنی رہائش کا انتظام میں نے مغلپورہ میں کر رکھا تھا۔ میرے ایک عزیز بہ سلسلۂ ملازمت وہاں مقیم تھے اور میں اور وہ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ لاہور میں مکانوں کے خوفناک کرائے، قیام و طعام کے بے اندازہ مصارف اور دیگر اسباب معیشت کی گرانی نے ہم ایسے کم استطاعت لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ کام کے مقررہ اوقات تو لاہور میں بسر کریں اور سر چھپانے کے لئے لاہور کے مضافات میں کوئی گوشہ تلاش کیا جائے۔ صبح ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے میں لاہور آجاتا اور شام کو چار، پانچ بجے واپس چلا جاتا تھا۔ ڈیڑھ سال تک یہی معمول جاری رہا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مغلپورہ سے گاڑی کے جس ڈبے میں میں سوار ہوتا تھا اُس میں باقی مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان ہر روز موجود ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے خیال نہ کیا لیکن چند ہفتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کی شکل و صورت سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ یہ نوجوان لاہور کے اسٹیشن پر اُتر جاتا تھا اور شام کو غالباً واپس چلا جاتا ہوگا۔ آہستہ آہستہ رُوشناسی بڑھتی گئی اور پھر خود بخود علیک سلیک شروع ہو گئی۔ دفتر جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت میرے پاس مختلف اخبارات و رسائل کا ایک پلندہ ہوتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے کبھی کوئی مسافر گھڑی بھر کے لئے اخبار مانگ لیتا تھا۔ اسی طرح یہ نوجوان بھی گاہے گاہے ایک آدھ پرچہ اٹھا کر پڑھ لیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارے درمیان ملک کے سیاسی حالات اور عام اقتصادی مسائل کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ ہماری ملاقات کی میعاد ہر روز صرف دس منٹ ہوتی تھی۔ ادھر گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر پہنچی اور ہم خدا حافظ کہہ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پھر یہ صورت ہو گئی کہ جس طرح روزمرہ معینہ پروگرام کے مطابق بعض باتیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں اور ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کا منتظر رہتا ہے۔ ہم بھی ہر روز صبح ساڑھے نو بجے ایک دوسرے کی ملاقات کے منتظر رہنے لگ گئے لیکن لاہور آیا اور پھر نہ ملاقات کی یاد باقی رہی اور نہ انتظار۔ میرے نام سے وہ واقف ہو چکا تھا اور میرے مشاغل کی نوعیت بھی اُسے معلوم تھی لیکن میں نہ اس کے نام سے واقف تھا اور نہ کام سے۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ہر روز امرتسر سے آتا اور شام کو واپس چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک نظر نہ آیا اور میں نے اپنی غلطی کا احساس کیا کہ کم از کم اُس کے نام اور پتے سے تو آگاہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ پانچ، سات روز غائب رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ ملا تو معلوم ہوا کہ اُسے بخار کی شکایت تھی۔ اس کا نام اشفاق تھا اور وہ ایک بیمہ کمپنی کے دفتر میں کسی اچھی جگہ ملازم تھا۔ چار بجے کام سے فارغ ہو کر واپس امرتسر چلا جاتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی تھا جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے اُس کے خدوخال میں کوئی موزونی نہ تھی لیکن اس کے بشرے کا مجموعی اثر بہت دلپذیر تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو شائد اُسے خوبصورت کہنا روا نہ ہوگا لیکن اُس کی شکل میں ایک ایسی نرمی اور اس کے چہرے پر ایک ایسی ملائمت تھی کہ دل خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ ایسا عزلت پسند اور خاموش انسان تو نہ تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جس کیفیت کا اظہار ہوتا تھا اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تصور و تخیل کی دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بعض اوقات یونہی فضا میں حرکت کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اُس کے اندرونی اضطراب کا عکس اُس کے چہرے پر پڑتا تو اُس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی اور پھر فوراً ہی اُس کے ہونٹوں پر تبسم اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ شائد اُس کے دل کی لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی حالت کے اثرات تھے۔ وہ علیگڈھ کا تعلیم یافتہ تھا اور شائد یہی وجہ تھی کہ اُس کے لب و لہجہ میں کرختگی نام کو نہ تھی۔ ادبیات سے اُسے بہت شغف تھا اور ہمارے درمیان جلد ربط و ضبط قائم ہو جانے کا باعث بھی یہ تھا کہ ہماری گفتگو سیاسی اور اقتصادی مسائل سے ہٹ کر ادبیات پر آ ٹھیری تھی۔ وہ علیگڈھ کی روشن خیالی اور تجدد پسندی کے باوجود شعر و سخن کے معاملے میں کسی حد تک قدامت پرست واقع ہوا تھا اور پنجاب کے شعراء کی خیال آرائیوں کو چنداں استحسان کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ میں اکثر مذاق کے طور پر اُس سے کہتا کہ "جدید تحریکِ ادب کو یوپی میں کبھی فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"وہ حیران ہو کر پوچھتا "کیوں؟"

میں جواب دیتا "جب آپ کے مذاق کا یہ عالم ہے کہ علیگڈھ جیسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درس گاہ میں چار سال بسر کرنے کے بعد بھی آپ اسی روش کو سراہتے ہیں۔ جو لکھنؤ میں ناسخ اور دہلی میں وقتی قائم کر گیا ہے تو پھر اُن لوگوں کا ذکر ہی جانے دیجئے جن کا خمیر سراسر یوپی کی سرزمین سے اٹھا ہے۔"

وہ ناسخ کا نام سن کر ہنس دیتا "آپ خواہ مخواہ مجھے ناسخ کا مداح بنا رہے ہیں۔ میں تو اُس رنگِ سخن کا سخت مخالف ہوں جس نے لکھنؤ کی شاعری کو اساتذۂ دہلی کے کلام سے الگ کیا ہے لیکن میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ زبان کے مسئلے کو پس پُشت ڈال دیا جائے۔ نظم ہو یا نثر صحتِ زبان ہر صورت مقدم ہے۔ اور جو شخص زبان پر قدرت کاملہ نہیں رکھتا وہ نہ اچھا شاعر بن سکتا ہے اور نہ اچھا ادیب۔ آج یہ حالت ہے کہ ہر مبتدی محاورے کی خلاف ورزی اور اصولِ زبان سے انحراف کو ادبی اجتہاد کے نام سے پکارتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عہدِ حاضر کا لکھنؤ عہدِ انیس کا لکھنؤ نہیں اور موجودہ زمانے کی دلی بھی میرو غالب کے وقت کی دلی نہیں لیکن زبان کے وہ محاورے اور ادب و انشاء کے وہ قواعد جو ہمارے اُن بزرگوں کی دائمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کا وجود آج بھی ہمارے ادب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے کیونکر نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ مرکزیت کے مٹ جانے سے یہ مراد نہیں کہ اب زبان کے مروجہ و مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہر بغاوت کو اصلاح پسندی اور روشن خیالی سے تعبیر کیا جائے۔ اگر یہ رَو چل نکلی تو نااہل لوگ اپنی بے مائگی کو چھپانے کے لئے زبان پر ہر قسم کے ظلم روا رکھیں گے۔"

ایک دن وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر سہ پہر کے وقت میرے دفتر میں آ گیا اور کہنے لگا "کل اتوار ہے چھٹی کا روز ہے۔ میری صلاح ہے آج امرتسر نہ جاؤں۔ رات کو سینما دیکھیں اور کل تمام دن سیر و تفریح کی نذر کیا جائے۔ کیا رائے ہے آپ کی؟"

میں نے کہا "مجھے اتفاق ہے۔ رات سینما دیکھ کر مغلپورے چلئے۔ وہاں غریب خانہ حاضر ہے اور کل دن بھر سیر سپاٹا کیا جائے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ ہفتے بھر کی کوفت رفع کرنے کے لئے اتوار کو مکمل تفریح ہونی چاہیئے۔"

ہم رات کو ۹ بجے سینما سے فارغ ہو کر جب گھر کی طرف چلے تو فلم کے حسن و قبح پر بحث شروع ہو گئی۔ اشفاق کہنے لگا "میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک عورت محبت کے معاملہ میں مرد کو کیونکر بے وقوف بنا سکتی ہے۔ مانا کہ دورِ حاضر کی ہندوستانی عورت نے تہذیبِ مغرب سے متاثر ہو کر کسی حد تک متلوّن مزاجی، وفا ناآشنائی اور ظاہر پرستی سیکھ لی ہے لیکن ہندوستان کے مرد نے بھی تو یہ خصوصیات حاصل کرنے میں کمی نہیں کی۔ پھر جب فریقین کی حالت یکساں ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ عورت مرد کو فریب دے جاتی ہے۔ اس فلم میں بھی عورت کے مزاج کا یہی پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت اور مرد دونو تعلیم یافتہ ہیں۔ دونو جدید معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور دونو نے مشرق و مغرب کے اتصال سے جو خوبیاں یا برائیاں پیدا ہوئی ہیں اختیار کر رکھی ہیں۔ مرد سب کچھ جان بوجھ کر دیکھ بھال کر، عورت سے محبت کرتا ہے۔ اور عورت اُسے دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتی ہے۔ کیا مرد ایسا ہی معصوم اور عورت ایسی ہی فریب کار ہے؟"

میں نے کہا "عورتیں نیک بھی ہوتی ہیں اور بد بھی۔ اسی طرح مرد شریف بھی ہوتے ہیں اور مکار بھی۔ افسانہ نگار نے فلم میں اپنے ذاتی خیالات و تجربات کا اظہار کیا ہے اور ہم غلطی سے اُسے ایک عالمگیر صداقت سمجھ رہے ہیں۔ عشق و محبت کی دنیا میں ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اور جب اُس تجربے کو رنگ آمیزی کے ساتھ ایک کہانی کی شکل میں بیان کیا جائے تو لوگ اُسے اِس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے کہ وہ محض ایک شخص کی ذاتی روئداد ہے بلکہ وہ اُسے ایک مسلّمہ حقیقت یقین کر لیتے ہیں۔"

ارادہ تو یہی تھا کہ اتوار کو جی بھر کر آوارہ گردی کریں گے لیکن ہوا یہ کہ صبح اٹھے، ناشتہ کیا اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو ایک نہیں، دو نہیں اٹھتے پانچ گھنٹے ہم نے اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا اور گفتگو جاری رہی۔ دو بجے سے چار بجے تک ہم نے چھاؤنی کی سڑکوں اور صدر بازار کا ایک چکر لگایا اور ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے اشفاق صاحب واپس امرتسر چلے گئے۔ آج اشفاق نے اپنے متعلق بہت سی باتیں بتائیں اُس کے والدین کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کے بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ امرتسر میں اس کا ایک جدّی مکان تھا جس میں وہ اپنے چند قرابت داروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے لدھیانہ میں ختم کی تھی جہاں سے وہ علیگڈھ چلا گیا اور بی۔ اے تک وہیں رہا۔ لاہور میں اس [illegible] حیثیت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اپنے دفتر کے آدمیوں کے سوا اور کسی سے [illegible] کی راہ و رسم نہ تھی۔ سالہا سال سے ایک ہی قسم کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے [illegible] تنہائی کا عادی ہو گیا تھا۔ تاہم وہ اپنی بے آب و رنگ زندگی میں کیف [illegible] پیدا کرنے پر آمادہ تھا اور کیف و تنوّع کا اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی [illegible] متارا،

زندگی اختیار کرلی جائے۔ شادی کے متعلق اس کے خیالات مبہم، غیر معین اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ چونکہ تنہا تھا اور خاندانی علائق اور گھر بار کی پابندیوں سے بے نیاز تھا اس لئے شادی کے رسم و رواج سے بھی بے خبر تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنی شادی کے متعلق کچھ فیصلہ کرچکا ہے لیکن اُس کے اظہار سے گریز کرتا ہے۔ میرے استفسار پر کہ آیا شادی کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اُس نے کہا "ہماری معاشرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کر ہر زن و مرد کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیئے ورنہ اُس حدِ عمر کے بعد ناکتخدا رہنے والوں کو سوسائٹی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کنواروں پر شکیں عائد کیا جاتا ہے اُن کے اخلاق اور چال چلن کو خواہ مخواہ متشبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں شہر کے آباد محلوں اور گلی کوچوں میں رہنے کو مکان نہیں دیئے جاتے بھلے آدمیوں کے ہاں اُن کی آمد و رفت معیوب خیال کی جاتی ہے۔ اِن باتوں سے تنگ آکر لوگ شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور پھر ستم ظریفی دیکھو کہ ہر شادی شدہ شخص کو دنیا بڑی فراخ دلی سے نیک چلنی کا پروانہ دے دیتی ہے۔ اعمال و افعال کی چھان بین ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کے ماضی اور ماضی کے ساتھ تعلق رکھنے والے عیب و ثواب کی پوچھ گچھ بھی ترک کردی جاتی ہے۔ گویا عزت و اعتبار اور قدر و منزلت کے حصول کا بہترین ذریعہ شادی ہے۔"

میں نے کہا "جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ شادی کا رسمی پہلو ہے۔ لیکن اُس شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو عشق و محبت کا کامیاب ثمر ہوتی ہے"۔

اشفاق خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

اُس نے آب دیدہ ہو کر کہا "یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو ہندوستان میں کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے"۔

ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ ایک آدھ مرتبہ میں بھی امرتسر گیا اور اشفاق کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ گاڑی میں ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ اشفاق کی جیب میں چمڑے کا ایک نہائت خوبصورت بڑا سا بٹوا رہتا تھا جس میں روپے پیسے کی بجائے وہ کچھ کاغذات رکھتا تھا۔ ایک روز اتفاقیہ وہ بٹوا جیب سے گر گیا اور تمام کاغذات زمین پر بکھر گئے۔ اُن میں چند گلابی رنگ کے نرم و نازک حسین لفافے بھی تھے جن کے کونوں پر بہت خوشنما پھول بنے ہوئے تھے۔ ہر لفافے پر خوبصورت زنانہ خط سے اشفاق کا پتہ مرقوم تھا اور اندر سے عطر کی خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ میں نے وہ لفافے اٹھا کر اشفاق کو دیئے تو اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا "ان لفافوں کا لکھنے والا بھی ایسا ہی معطر و حسین شخص ہوگا؟"

اشفاق جھینپ سا گیا اور بٹوا اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھ سے رازداری کے لہجے میں کہنے لگا "میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے کا ہر روز ارادہ کرتا ہوں لیکن جرأت نہیں ہوتی"۔

میں نے کہا "فرمائیے۔ وہ کیا ضروری بات ہے"؟

اشفاق نے کہا "انہی لفافوں کے متعلق"۔ اور پھر احتیاط سے ایک لفافہ جیب سے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کھولا تو وہ ایک خط تھا، کسی عورت کی طرف سے، جس نے اپنا پورا نام لکھنے کی بجائے صرف "س" لکھا ہوا تھا۔ میں نے خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ حسن و عشق کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ فراق کی کاہشیں، فلکِ کجرفتار کے مظالم، جورِ اعدا کے گلے، دلِ غم نصیب کے سنسلنے کی دُعائیں، غرضکہ صحیفۂ عشق کے تمام باب قلمبند کئے گئے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ "مجھ پر آپ نے جو اعتماد فرمایا ہے اُس کا بے حد شکریہ لیکن یہ بتائیے کہ یہ خاتون کون ہیں"؟

اشفاق نے پھر بٹوا کھولا اور تمام خطوط نکال کر میرے حوالے کر دیئے۔ بھینی بھینی، مست کردینے والی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "عورتوں کو خوشبو استعمال کرنے میں بھی غضب کا سلیقہ حاصل ہے۔ ہم چاہے پوری شیشی خالی کر ڈالیں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی"۔

اشفاق کے چہرے پر خوشی اور کامیابی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

میں نے وہ تمام خطوط پڑھے۔ وارداتِ عشق کی ایک رنگین روداد تھی لیکن میں نے ایک نامعلوم طریقے سے محسوس کیا کہ خطوں میں محبت کی حقیقی گرمی موجود نہیں۔ جگہ جگہ اشعار استعمال کئے گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جذبات کی کمی ہے اور لکھنے والی اپنی سرد مہری کو اشعار کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"اب ان خطوں کی تفسیر بھی کر دیجئے"۔

اُس نے ہنس کر جواب دیا "ہر تصنیف کا بہتر شارح خود اُس کا مصنف ہوتا ہے"۔

میں نے کہا "لیکن اس تصنیفِ لطیف کے مصنف کی بارگاہِ نازنیک مجھے اپنے ہمراہ لے چلنے کے لئے آپ تیار ہیں"۔

اشفاق نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "فکر نہ کیجیے۔

وہ دن بھی قریب آ رہا ہے"۔ اور پھر اس نے مزے لے لے کر کہنا شروع کیا "س" سے مراد سکینہ ہے۔ یہ ایک نہائت حسین وجمیل اور شائستہ خاتون ہیں۔ اپنی والدہ کے ہمراہ لاہور میں رہتی ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اُن کی خدمت میں شرفِ نیازمندی حاصل ہے اور میں کس مُنہ سے کہوں کہ عنقریب میری ان سے شادی ہونیوالی ہے"۔

میں نے متعجب ہو کر کہا "خوب۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ چپکے چپکے شکار مار لیا۔ لیکن اگر آپ میری جرأت کو قابلِ مواخذہ تصور نہ فرمائیں تو کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خاتون کس خاندان سے ہیں؟"

اشفاق گھبرا سا گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا "مجھے اس سوال کا جواب دینے کی ممانعت ہے اور یوں بھی یہ معیوب سی بات ہے کہ میں اس وقت ان کے گھربار کا پتہ آپ کو بتا دوں تاہم آپ کی تشفی کے لئے اتنا کہے دیتا ہوں کہ وہ ایک نہائت ذی عزت گھرانے کی چشم وچراغ ہیں اور اُن کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے پوری شفقت ومحبت اور بے حد حزم واحتیاط سے اُن کی پرورش کی ہے"۔ پھر وہ مجھے اپنی شادی کے اہتمام والصرام کی تفصیلات سنانے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ "میں تنہا ہوں اور رسم ورواج سے ناواقف ہوں۔ اس لئے میں نے سکینہ کی والدہ سے کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی شادی کا انتظام وہی مکمل کر دیں۔ میں نے بذریعہ آٹھ سو روپیہ انہیں دیا ہے اور اب ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے ستر روپے ان کو اور بھیج دیتا ہوں۔ وہ خود ہی زیور اور کپڑے وغیرہ تیار کر رہی ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ نکاح جلد ہو جائے لیکن سکینہ کی والدہ نہیں مانتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں اپنی لڑکی کا رخصتانہ دھوم دھام سے کروں گی"۔

اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے روز اشفاق نے پھر وہ بٹوا جیب سے نکالا اور کہنے لگا "اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ میں آپ کو سکینہ کی تصویر دکھاتا ہوں"۔ اُس نے بٹوا کھول کر ایک باریک سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر نکالی اور میں نے سخت اضطراب سے وہ تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی میرا رنگ فق ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا چند لمحوں کے لئے میرے دل کی حرکت رُک گئی ہے۔ اشفاق حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر میرے شانے کو ہلا کر بولا "کیا ہوا آپ کو، خیر تو ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ مجھے دل کا عارضہ ہے۔ کبھی کبھی یک لخت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دل ڈوب رہا ہے"۔

یہ تصویر شمشاد کی تھی جو اس سے قبل کم از کم چھ نوجوانوں کو تباہ کر چکی تھی۔ اُس کی ماں زینت ایک سخت عیار اور آوارہ عورت تھی جس کا پیشہ ہی یہ تھا کہ اپنی لڑکی کے ذریعے سے سادہ لوح نوجوانوں کو لوٹنے۔ ان کے ترکش کا زخم خوردہ میرا ایک دوست لطیف احمد بھی تھا لیکن اُس وقت یہ دونو ماں بیٹیاں راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ لطیف کو شمشاد کی شادی کا چکمہ دے کر انہوں نے مختلف بہانوں سے اُس سے بارہ سو روپیہ وصول کیا اور پھر راولپنڈی سے غائب ہو گئیں۔ میں لطیف سے کہتا رہا کہ پولیس میں اطلاع کر دو لیکن اُس نے اپنی رُسوائی کے ڈر سے اور کچھ اس خیال سے کہ اس کے پاس ثبوت نہیں تھا۔ پولیس میں خبر نہ کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ شمشاد نے اپنی ایک تصویر لطیف کو دی تھی اور وہ تصویر مدت سے میرے پاس پڑی تھی۔ میں گھر آ کر سوچتا رہا کہ اشفاق کو اس خطرناک سازش کی خبر کس طرح کر دوں تاکہ اُس کی حساس طبیعت کو زیادہ صدمہ نہ پہنچے۔ وہ بچارا خوشبودار خطوں، شمشاد کے حسن وجمال کی دلفریبیوں اور زینت کی طرحدار باتوں کے جال میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔ اور اب اگر اُسے معلوم ہوا کہ یہ سب فریب تھا تو خدا جانے وہ اپنا کیا حال کر بیٹھے۔ میں نے اُسے ایک مفصل خط لکھا جس میں شمشاد اور زینت کی عیاری کی تمام داستان درج کی اور اپنے بیان کو زیادہ موثق بنانے کے لئے شمشاد کی تصویر بھی اُسے بھیج دی۔ دوسرے روز خط پہنچتے ہی وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ خود سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا "کیا آپ نے یہ خط لکھا تھا؟"

میں نے جواب دیا "ہاں"۔

"کیا یہ ساری داستان صحیح ہے؟"

میں نے عرض کیا "اس کا ایک ایک لفظ درست ہے"۔

"تو پھر میں اب کیا کروں؟"

میں نے جواب دیا "میری رائے ہے کہ آپ اس واقعہ کی پولیس میں اطلاع کر دیں"۔

وہ کہنے لگا "میں پولیس میں اطلاع نہیں کروں گا۔ دنیا میں اس طرح اپنی تشہیر کرنا مجھے گوارا نہیں۔ میرے پاس روپے کا کوئی ثبوت نہیں۔ لے دے کے یہ چند خطوط ہیں۔ ان سے بھی کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مجھ سے اتنی رقم وصول کی ہے"۔

آدھ پون گھنٹہ ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور اشفاق اُس طرز کار کے متعلق کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد دو روز مسلسل

وہ مجھے گاڑی میں نظر نہ آیا۔ میں نے اُس کے دفتر سے خبر منگوائی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ میں خود اُسے دیکھنے کے لئے امرتسر گیا۔ اُس کو بہت تیز بخار تھا اور ساتھ ہی تمام بدن میں شدید درد تھا۔ میں نے کہا "آپ بیمار کیونکر ہو گئے؟"

اُس نے بہت کمزور آواز میں جواب دیا "اُس روز آپ سے مل کر جب میں واپس آیا تو سر میں سخت درد تھا۔ رات بھر ایسی بے چینی رہی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ صبح ہوئی تو بخار ہو گیا۔"

میں نے اُس کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ آپ کے اعصاب میں کچھ ایسی ذکاوتِ حس ہے کہ ہر ناگوار واقعہ آپ پر غیر معمولی گہرا اثر ڈالتا ہے۔"

اُس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا اور خاموش ہو گیا۔

اشفاق کا بخار تپ محرقہ کی صورت اختیار کر گیا اور غریب پورے اکیس روز چارپائی پر پڑا رہا۔

عاشق بٹالوی

طلسمِ گفتار

افسانہ چاہتے تھے وہ، افسانہ بن گیا
میں حُسنِ اتفاق سے دیوانہ بن گیا

وہ اِک نگاہ دیکھ کے خود بھی ہیں شرمسار
ناآگہی میں یُونہی اِک افسانہ بن گیا

موجِ ہوا سے زُلف جو لہرا گئی تری
میرا شعور لغزشِ مستانہ بن گیا

حُسن ایک اختیارِ مکمّل ہے آپ نے
دیوانہ کر دیا جسے، دیوانہ بن گیا

ذِکر اُس کا گفتگو میں جو شامل ہُوا عدمؔ
جو شعر کہہ دیا وہ پری خانہ بن گیا

سیّد عبدالحمید عدمؔ

سرودِ ہندی

کیا راہ ہے راہِ محبت کی سانس آتے آتے ٹوٹ گئی
کیا بار ہے بارِ محبت کا دو گام میں ہمت چھوٹ گئی

وہ در وہ چوکھٹ کیا چھوٹی اے ہمدم قسمت پھوٹ گئی
چاہا تھا دل کو سمجھا لیں کچھ سوچ کے ہمت چھوٹ گئی

زنداں کی حقیقت ہی کیا تھی ہمت ہی یکایک ٹوٹ گئی
دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا، دیوانوں کی قسمت پھوٹ گئی

تسکین کی باتیں کرتے ہو ہم جانتے ہیں جو ہونا ہے
جب عشق کے ہاتھوں جینا ہے تو یارو قسمت پھوٹ گئی

تم نزع میں دیکھ کے آئے ہو ہم دفن کئے آتے ہیں اُسے
کچھ تم کو خبر ہے کتنی دُور اک جاتی دنیا چھوٹ گئی

اے دوست ترے جلنے والے جلتے ہیں جیسی مصیبت سے
دوزخ کی بھڑکتی آگ اس پر سو مرتبہ چھاتی کوٹ گئی

انصاف کسی کا کیا چاہیں کیا عشق کی رسم نرالی تھی
جو اپنے ساتھ کسی نے کیا اے مالک قسمت پھوٹ گئی

ہمراز نہیں دمساز نہیں اللہ کوئی آواز نہیں
کیا عشق کی دنیا میں آتے ہی رہتی دنیا چھوٹ گئی

ہے درد سا درد محبت کا ہے چوٹ سی چوٹ محبت کی
دیکھا بھی نہیں جاتا بھی نہیں اور منہ پہ ہوائی چھوٹ گئی

متوالے ہوش میں رہتے ہیں یہ بھید اس وقت کھلا ہم پر
ارمان بھرے دل کی محفل وہ مست آنکھ جب لوٹ گئی

محشر کا دن جب ڈوب چلا انگڑائی لے لے کے اُٹھے
ان آنکھوں کے اے متوالو نیند اتنی جلدی ٹوٹ گئی

آگے شاید پڑتا ہے عدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراقؔ یہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

فراقؔ گورکھپوری ایم اے

مسرّت

سمندر کے کنارے بلند جگہ پر وہ مکان کھڑا تھا۔

چائے کا وقت تھا۔ چراغ ابھی روشن نہیں ہوئے تھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق مغرب کی سنہری روشنی نے آسمان کو لاکھوں بنارکھا تھا بحیرۂ روم کا پانی بالکل ساکن تھا اور ڈوبتے ہوئے دن کی سرخی میں چمکیلی دھات کی ایک چادر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

دُور دائیں جانب پست و بلند پہاڑیاں افق مغرب کی ارغوانی جھلک کے سامنے اپنی کالی کالی چوٹیاں اٹھائے کھڑی تھیں۔

وہ محبت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور ان ہی پرانی باتوں کو بار بار دُہرا رہے تھے جو پہلے کئی بار کہی جا چکی تھیں۔ بڑھتی ہوئی اداس تاریکی ان پر مسلط ہو رہی تھی اور ان کے دلوں پر ایک خوش گوار اثر پیدا کر رہی تھی "محبت" کا لفظ کبھی مرد کی مضبوط آواز سے اور کبھی عورت کے دل کش صاف لہجے سے بلند ہوتا ہوا اس چھوٹے سے کمرے کی فضا میں گونج رہا تھا۔

"کیا مسلسل کئی سالوں تک کوئی محبت کر سکتا ہے؟" یہ تھا زیر بحث سوال!

کچھ کہنے لگے "ہاں"

کچھ بولے "نہیں"

کئی کئی مثالیں پیش ہوئیں اور سب مرد اور عورتیں خون کو کھولا دینے والے وہ وہ واقعات سن دھن کہہ ڈالنے پر آمادہ ہو گئے جن کے بیان سے وہ ہمیشہ گریز کرتے تھے اور جو ان کے ہونٹوں تک کئی دفعہ آ آ کر رہ گئے تھے۔ غرض کہ انھوں نے اس عام مگر ارفع چیز کو ——— یہی دور دور کی پُراسرار قرابت ——— بڑے جوش اور بے حد دلچسپی کے ساتھ بیان کیا۔

ان میں سے ایک جس کی آنکھیں دور کے ایک منظر پر جمی تھیں یکایک بول اٹھا۔

"خدا! دیکھو وہ اس طرف کیا چیز ہے؟"

سمندر کے اُس جانب دھندلی فضا میں ہلکے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بے ڈول تودا سر نکالے کھڑا تھا۔

عورتیں اٹھ اٹھ کر اس مبہم سی چیز کی طرف دیکھ رہی تھیں جو اس سے پہلے انھیں کبھی دکھائی نہ دی تھی۔ ایک نے کہا "یہ کورسکا ہے۔ یہ سال بھر میں صرف دو یا تین مرتبہ۔ خاص خاص فضائی کیفیتوں میں نظر آتا ہے یعنی جب ہوا نہایت شفاف ہو اور کہر اُسے دھندلا نہ کر سکے۔"

اب وہ کسی حد تک پہاڑ کی چوٹیاں بھی دیکھ سکتے تھے اور یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ان کی بلندیوں پر برف کے بڑے بڑے تودے جمے ہیں ہر ایک اس نئی دنیا کے اچانک ظاہر ہو جانے پر حیران و مبہوت ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے وہی حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے جس نے کولمبس کو عجیب و غریب سمندروں میں پریشان کیا تھا۔

ایک بوڑھا امیر جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا "خوب تو اسی جزیرے میں جو ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا مجھے اپنی حقیقی محبت کا ایک واقعہ پیش آیا جو حیرت انگیز طور پر کامیاب تھی۔

پانچ سال گزرے، میں نے کورسکا کا سفر کیا۔ یہ ویران جزیرہ ہم سے بہت دور واقع ہے اور ہمیں اس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں، گو آج کی طرح بعض اوقات فرانس کے ساحلوں سے یہ نظر آتا ہے۔

کورسکا کو دنیا کی ابتدائی حالت فرض کیجئے۔ جہاں بہت سی ایسی گھاٹیاں پہاڑیوں کے وسیع سلسلے کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں جنہیں کف انگیز ندیاں بہتی ہیں۔ وہاں زمین کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جو ہموار ہو۔ ہر طرف بھربھرے پتھروں کی چٹانیں اور خوفناک نشیب و فراز جھاڑیوں یا اونچے اونچے شاہ بلوط کے جنگلوں سے گھرے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بے کاشت زمین ہے جو ابتدا ہی سے ویران پڑی ہے۔ چوٹیوں پر کہیں کہیں کوئی گاؤں دیکھنے میں آتا ہے جو دور سے چٹانوں کے ایک انبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ وہاں نہ تہذیب کا کوئی نشان ہے۔ نہ دستکاری ہے اور نہ کوئی فن۔ زمین کا چپہ چپہ

جہاں مارو تم کو نہ کہیں تراشیدہ لکڑی ملے گی۔ اور نہ کندہ کئے ہوئے پتھر کا کوئی ٹکڑا جس سے کسی اونٹے یا اٹلے پرانے مذاق کا پتہ چل سکے۔ یہاں "اس طلسمی حسن" کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ جسے آرٹ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور شاید یہی اس سرزمین کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اٹلی "شاہکاروں کا شہر" یہاں کا ایک ایک محل بجائے خود ایک شاہکار ہے۔ جہاں سنگِ مرمر، لکڑی، پیتل، لوہا غرض کہ ہر دھات اور پتھر کا ایک ایک ٹکڑا انسانی آرٹ کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ یہاں پرانے گھروں کا حقیر سے حقیر تر کمرہ بھی لوگوں کے حسن مذاق پر شاہد ہے۔ ہماری نظروں میں ایک مقدس اور محبوب سرزمین ہے۔ کیونکہ اسی کے کارناموں سے ہم وہ تحریک۔ قوت اور مسرت محسوس کرتے ہیں جو اختراع و ایجاد کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس کے سامنے کورسکا کا جزیرہ اسی طرح ویران پڑا ہے جس طرح وہ پرانے زمانے میں تھا۔ وہاں انسان انھیں کچے مکانوں میں رہتے ہیں انھیں صرف ان ہی امور سے غرض ہے جو ان کی بے کیف زندگی اور اس کی محدود ضروریات سے تعلق ہوں۔ مگر ان میں جہاں غیر متمدن اقوام کے نقائص ——— بے رحمی۔ فتنہ انگیزی۔ خوں آشامی ——— پائے جاتے ہیں وہاں ——— یہاں نوازی۔ فیاضی۔ رحم دلی جیسی خوبیاں بھی موجود ہیں اور ان کے دروازے ہر مسافر کے لئے کھلے رہتے ہیں اور ذرا سی ہمدردی کے صلے میں وہ حقیقی دوستی کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

تو ایک ماہ تک میں اس عالی شان جزیرے میں سیر کرتا رہا۔ اس عرصے میں مجھے یوں محسوس ہوتا رہا۔ جیسے میں دنیا کے آخری کنارے پر پہنچ گیا ہوں وہاں نہ کوئی سرائے تھی نہ شراب خانہ اور نہ کوئی سڑک۔ پگڈنڈیاں ان گاؤں تک چلی گئی تھیں جو پہاڑیوں کے دونوں طرف آباد تھے۔ ندیوں کا پانی چیخ چیخ کر خلیجوں کی گہرائیوں میں گرتے وقت شام کے سکوت میں ایک مسلسل شور برپا کرتا رہتا تھا۔ سازدہاں مکان کا دروازہ کھٹکھٹا کر اگلی صبح تک رات بسر کرنے یا کھانے کے لئے اہلِ خانہ سے بے تکلف درخواست کرتا ہے۔ وہ ایک غریبانہ میز کے سامنے بیٹھتا ہے اور غریبانہ چھت کے نیچے رات بسر کرتا ہے۔ صبح ہوتے ہی اپنے میزبان کے گرم جوش ہاتھ سے ہاتھ ملا کر چل پڑتا ہے میزبان عزت افزائی کے لئے اسے گاؤں کے باہر تک چھوڑنے جاتا ہے۔

دس گھنٹوں کی مسلسل سیر کے بعد ایک شام میں ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ جو ایک تنگ وادی کی گہرائی میں تنہا کھڑا تھا۔ یہ وادی ایک لیگ کے فاصلے پر سمندر سے جا ملی تھی۔ پہاڑیوں کی دو گہری ڈھلانوں سے جن پر جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت اُگے تھے۔ یہ افسردہ جگہ گھری ہوئی تھی۔

مکان کے گرد انگور کی چند بیلیں اور ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ دور فاصلے پر شاہ بلوط کے بلند درخت کھڑے تھے۔ جو اس برہنہ غریب جزیرے کی دولت شمار کئے جاتے ہیں۔

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا جس کے چہرے کے نقوش کو بڑھاپے نے بدنما کر دیا تھا۔ لیکن جو غیر معمولی طور پر صاف اور اجلی تھی۔ اندر بید کی کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سلام کو اٹھا اور کچھ کہے بغیر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا "اسے معاف فرمائیے یہ بہرہ ہے۔ اس کی عمر بیاسی ۸۲ سال ہے۔

وہ نہایت خوبی سے فرانسیسی بول سکتی تھی اور میں اس بات سے حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم کورسکا کی رہنے والی ہو؟"

اس نے جواب دیا "نہیں ہم برِاعظم سے یہاں آئے ہیں اور پچاس برس سے یہاں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پچاس سال کے خیال نے مجھ پر ایک خوفناک احساس طاری کر دیا ——— پچاس سال جو انھوں نے اس تاریک جگہ میں آبادی اور شہروں سے دور رہ کر گزار دیئے تھے ——— بوڑھا گڈریا اندر داخل ہوا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانا نہایت سادہ تھا یعنی گوبھی اور گوشت اور گاڑھا سا شوربا!

جب یہ مختصر سا کھانا ختم ہو چکا تو میں باہر جا کر دروازے کے قریب جا بیٹھا۔ بیرول اس افسردگی سے بیٹھا جاتا تھا جو اس سرزمین کے مناظر سے ٹپک رہی تھی۔ اس وقت میں کچھ ایسی وحشت میں گرفتار تھا جیسی ویران جگہوں پر شام کے وقت ایک مسافر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام چیزیں حتیٰ کہ زندگی اور سارا جہان ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہا ہے۔ زندگی کے خوفناک مصائب۔ عناصر کا انتشار اور بالآخر ان کا معدوم ہو جانا اور ہمارے دلوں کی تاریکی جسے ہمارے دلنواز خواب زندگی کے آخری لمحوں تک خوشگوار بنائے رہتے ہیں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو رہے تھے۔

بڑھیا میرے پاس آ بیٹھی اور تحقیق کے ایک [illegible] جذبے کے ماتحت تسلیم و رضا اختیار کئے ہوئے لوگوں کے دلوں میں بھی [illegible] رہتا ہے مجھ سے پوچھنے لگی "تو آپ فرانس سے آئے ہیں؟"

"ہاں میں تفریح کی خاطر سفر کر رہا ہوں۔"

"شاید پیرس سے تشریف لائے ہوں۔"

"نہیں ننیسی سے!"

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرے آخری فقرے نے اس پر ایک غیر معمولی اضطراب طاری کر دیا ہے۔ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ یہ تغیر میں نے کس طرح دیکھا یا محسوس کیا۔

اس نے آہستگی سے پھر دہرایا "اچھا تو آپ ننیسی سے آرہے ہیں۔"

اس کا شوہر دروازے میں کچھ اس طرح بے خیال سا ہو کر کھڑا تھا جس طرح بہرے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔

وہ بولی "کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ سن نہیں رہا"

پھر کچھ منٹوں کے بعد وہ مجھ سے دریافت کرنے لگی "تو آپ ننیسی کے باشندوں کو جانتے ہوں گے؟"

"ہاں تو تقریباً ہر ایک کو"

"سینٹ لالینز کے خاندان کو بھی"

"کیوں نہیں، اچھی طرح۔ وہ میرے باپ کے دوست تھے"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اور صاف آواز سے جس میں پرانی یاد کے جذبے نے ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ پوچھنے لگی "اور ہربسن کا خاندان۔ ان کے متعلق کچھ کہئے"

وہ تمام مر چکے ہیں۔

"اور سرتوں، ان کی بابت کچھ بتائیے"

"ہاں سب سے چھوٹا جرنیل ہے"

یہ تذکرہ فرو اشتیاق کا نپنے لگی مجھے معلوم نہیں کہ وہ کونسا بے چین کر دینے والا گہرا جذبہ تھا۔ وہ کونسا پراسرار خیال تھا جو اسے اس وقت وہ تمام راز بے نقاب کر دینے پر مجبور کر دیا۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اب تک مقفل تھے۔ جانے ان لوگوں سے اس کا کیا تعلق تھا جو ان کے ناموں نے اس کے دل کو اتنی اذیت پہنچائی۔

وہ بولی "ہاں نہیری سرتوں۔ میں اسے خوب جانتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہی تو ہے"

میں نے وحشت کے عالم میں غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یکایک مجھے یاد آگیا کہ ان کے علاقے میں ایک ناخوشگوار واقعہ ظہور میں آیا تھا جب سوزان سرتوں۔ ایک خوب صورت نوجوان لڑکی اس ولائتی سواروں کے رسالے کے ایک افسر کے ساتھ نکل بھاگی تھی جس میں اس کا باپ کمانڈر تھا۔

یہ بڑا خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کے والدین کسان تھے مگر یہ شجاعت کا نیلا نشان لگائے رہتا تھا۔ اس لڑکی کو اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے کس طرح نوجوان کے دل میں اپنی محبت کا اعتبار بٹھایا تھا۔ کسی کو مطلق خبر نہ تھی کہ اچانک ایک شام یہ نوجوان سپاہی اپنی خدمات کا عرصہ گزار لینے کے بعد اس لڑکی کو ساتھ لے کر کہیں روپوش ہو گیا۔ تجسس کی گئی مگر ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب دیر تک ان کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تو لوگوں نے سمجھا کہ لڑکی مر چکی ہے۔

تو اس طرح میں نے اس الگ تھلگ وادی میں اسی لڑکی کو دیکھا۔

میں نے کہا "ہاں مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے کہ آپ مادموزیل سوزان ہیں"

اس نے سر ہلا کر کہا "ہاں" اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر بوڑھے آدمی کی طرف دیکھ کر وہ کہنے لگی "یہ وہی ہے!"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی اور جب اس نے اس کی طرف دیکھا تھا تو اس کی نظروں میں بے پایاں محبت چھلک رہی تھی میں نے پوچھا "تو آپ بہت خوش ہوں گی"

اس نے ایسی آواز میں جواب دیا جو اس کے دل سے نکل رہی تھی "ہاں بہت خوش ہوں۔ مجھے کوئی فکر لاحق نہیں ہوا"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا میں اس وقت محبت کی حیرت انگیز قوت سے متعجب ہو رہا تھا کہ کس طرح یہ امیر لڑکی اس آدمی۔ اس کسان کے ساتھ ساتھ پھرتی رہی۔ اور کس طرح اس نے ایک بے کیف اور بے رونق ادنیٰ سی زندگی بسر کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کر لیا۔ کس طرح اس نے اس ایک بے وقوف شہری کی بیوی بننا پسند کیا جسے پہننے کے لئے معمولی سی ٹوپی اور کمینوس کے بوٹ ہی میسر آتے ہیں اور کس طرح اب وہ بید کی سیٹ والی کرسی پر بیٹھ کر آلو۔ گوبھی اور شوربا ایک معمولی سی میز آگے رکھ کر مٹی کے برتن میں سے کھا لیتی ہے۔

اس کے دل میں اس انسان کے سوا کبھی کوئی خیال نہ آیا تھا۔ زر و جواہر خوشنما کپڑے۔ بازوؤں والی کرسیاں۔ رنگین پردوں والے کمرے کی معطر آسائش اور وہ نرم نرم گدیلے جن پر جسم کو ایک ابدی راحت محسوس ہوتی ہے ان میں سے کوئی چیز اسے میسر نہیں تھی اور نہ ان کی طلب اسے کبھی افسوس ہوا تھا۔ اسے اپنے شوہر کے علاوہ اور کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔ بس وہی وہ تھا جسے وہ چاہتی تھی۔

جوانی کے آغاز ہی میں اس نے ناز و نعم کی زندگی اور ان سب عزیزوں کو خیرباد کہہ دی تھی جن کی آغوش میں اس نے پرورش پائی تھی اور جنھیں اس سے حد درجہ محبت تھی۔ وہ ان کو چھوڑ کر اسی ایک انسان کے ساتھ یہاں اس ویرانے

میں آگئی یہی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا یہی اس کے خوابوں کی تعبیر تھی اور یہی وہ ایک ہستی تھی جس کے ساتھ اس کی امیدیں وابستہ تھیں اور اب بھی ہیں اس شخص نے نہ جانے کیسے اس کی ہستی کو آغاز سے انجام تک ایک نہ زائل ہونے والی مسرت سے بھر دیا تھا!

بھلا وہ اس سے زیادہ خوش کہیں رہ سکتی تھی۔

دوسری صبح میں ان دونوں سے ہاتھ ملا کر چلا آیا۔"

کہانی بیان کرنے والا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ایک عورت بولی:۔

"تو گیا ہوا۔ اس کا مقصد نہایت سہل الحصول تھا کیونکہ اُسنے بے حد سادہ زندگی پر اکتفا کر لی تھی۔ وہ ضرور کوئی نادان لڑکی ہوگی!"

دوسری عورت آہستہ سے بولی: "نادان ہی سہی، مگر وہ خوش تو تھی!"

دنیا کے اُس پار دُور فاصلے پر کوہِ کارات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ چھپتا ہوا پھر سمندر میں غائب ہو گیا۔ اور اس کا وسیع سایہ بھی جو زبانِ حال سے محبت کے ان حقیقی پرستاروں کی کہانی بیان کر رہا تھا، ساتھ ہی چھپ گیا!

(موپاساں)

طاہر قریشی بی۔ اے

قطعات

(۱)

دامانِ دل کے چاک سیو اور خوش رہو
جیسی ملے شراب پیو اور خوش رہو
مجبوریوں کا ذکر ہے سامانِ زندگی
جب تک نہ آئے موت جیو اور خوش رہو

(۲)

غم اپنی زیست کا نہ کرو اور خوش رہو
آفاتِ دہر سے نہ ڈرو اور خوش رہو
ہاں خوش رہو کہ نام اسی کا ہے زندگی
بے آئی موت غم نہ کرو اور خوش رہو

ضیاء فتح آبادی

ہر سائز کے کوٹ اور پتلون کے لئے کپڑا جو کفایت، عمدہ اور پائدار ہو
ملنے کا پتہ
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
مکمل فہرست مفت
طلب کریں۔

پریتم کو ڈھونڈنے

پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

پھولوں کے رنگ میں
جل کی ترنگ میں
کرنوں کی جنگ میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

بھونرے کی تان میں
کلیوں کی آن میں
نرگس کے دھیان میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

چپنے کے جھاڑ میں
بوندوں کی آڑ میں
بن میں پہاڑ میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

اندرجیت شرما

شریکِ سفر

مجھے نہیں معلوم کہ ہم میں سے پہلے کون ٹرین پر سوار ہوا۔ بلکہ کافی عرصہ تک میں نے اس کے وجود کو بھی اپنے ڈبہ میں محسوس نہیں کیا۔ مگر وہ میرے ساتھ تھا.....

.....میرا شریکِ سفر!

میں شب کی اخیر گاڑی میں سفر کر رہا تھا ——— بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کی بمبئی سے بارولی جانے والی وہ سست رفتار سپیجر ٹرین جو تمام اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی جاتی ہے جس کی مسافت کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور جس میں سفر کرنے والے کو "بقائے دوام" کا لطف آجاتا ہے۔ روانگی کے موقع پر میرا کمپارٹمنٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن ہر آنے والے اسٹیشن پر دو چار چار مسافر اترتے گئے۔ بالآخر میں اکیلا رہ گیا۔ یا محض مجھے گمان ہوا کہ میں اکیلا ہوں۔

رات کے وقت ریل کے پُرشور ڈبہ میں تنہا سفر کرنے سے دل میں آزادی کا ایک خوش گوار خیال پیدا ہونے لگتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی قیاس کیا ہے کہ ایسے موقع پر آپ کو کس قدر آزادی مل جاتی ہے؟ اس وقت آپ بالکل آزاد ہوتے ہیں مکمل سوراج کے مالک!! آپ بلا کسی روک ٹوک کے جو آپ کا جی چاہے کر سکتے ہیں۔ آپ خود کو مخاطب کر کے جس قدر بلند آواز سے چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی سننے والا نہ ہوگا۔ اگر آپ چاہیں تو کسی فرضی مخاطب سے مباحثہ حجت بلکہ ہاتھا پائی بھی کر سکتے ہیں۔ بلا کسی مخالفت کے آپ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ کوئی آپ کو اس حالت میں دیکھنے نہ آئے گا۔ آپ ناچ سکتے ہیں۔ آپ گا سکتے ہیں۔ آپ ہاکی اور گولف کی مشق کر سکتے ہیں۔ آپ ڈبہ کی ناہموار زمین پر گولیاں کھیل سکتے ہیں، بلا خوف تردید آپ اپنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کھول سکتے ہیں اور پھر بند بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی اس حرکت پر ناک بھوں نہیں چڑھائے گا۔ آپ اپنے قریب کی دونوں کھڑکیاں کھول سکتے ہیں اور کھولنے کے بعد بند کر سکتے ہیں بلکہ اگر آپ چاہیں تو اپنی آزادی کی خوشی میں کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں کھولتے اور بند کرتے رہیں جب تک کہ آپکے ہاتھ تھک نہ جائیں۔ آپ جب خواہش ڈبہ کے کسی گوشے میں آرام کر سکتے ہیں بلکہ چاروں گوشوں کو یکے بعد دیگرے آزما سکتے ہیں۔ آپ خوب پھیل کر بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ اپنی چادر سے لمبی ٹانگیں پھیلا کر لیٹ سکتے ہیں۔ آپ ایک بنچ پر دو مسافر والے قانون کو توڑ کر ایک پر بیٹھ کر دوسرے پر پیر تیسرے پر بستر، چوتھے پر تکیہ اور پانچویں پر اسباب رکھ سکتے ہیں۔ غرض کہ ایسے موقع پر آپ آزاد ہوتے ہیں اپنے نفس کے مختار!

آزادی کی اس رات کو میں نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ جو کچھ میں نے کیا۔ وہ ان سے کہیں زیادہ معمولی حرکت تھی جب میرے درجے کے آخری مسافر نے اپنا اسباب سمیٹ کر کمپارٹمنٹ کو خیرباد کہا تو میں نے اپنے ہاتھوں سے اخبار رکھ دیا۔ اور جمائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا کھڑکی کے باہر گرمیوں کی خاموش رات کو دیکھا جس میں میں سفر کر رہا تھا۔ ڈبہ کی دوسری جانب گیا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر بلاوجہ اسے بند کر دیا سگریٹ روشن کر کے چمنی کی طرح منہ سے دھواں خارج کرتا ہوا اپنی نشست پر آ کے بیٹھ گیا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہاں پر میں نے اپنے شریکِ سفر کے وجود کو محسوس کیا۔ وہ آیا اور میری ناک پر بیٹھ گیا!!

وہ اُن پروالے صاحب پیش کیڑوں میں سے ایک تھا جنھیں ہم "مچھر" کہتے ہیں میں نے اسے اپنی ناک پر سے اڑا دیا۔ اس نے ڈبہ میں چکر لگا کر فضا کا معائنہ کیا۔ یکے بعد دیگرے تمام کھڑکیوں میں حاضری دی لیمپ کے گرد طواف کیا اور آخر میں شاید اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس گوشے میں بیٹھے ہوئے "عظیم الجثہ جانور" سے زیادہ پُرلطف ڈبہ میں اور کوئی شے نہیں ہے چنانچہ اس نے مراجعت کی۔ اب اس کی نظرِ عنایت میری گردن پر تھی۔

میں نے اسے دوبارہ اڑا دیا۔ اس نے ڈبہ کا ایک اور طواف کیا۔ لوٹا اور نہایت ڈھٹائی سے میرے ہاتھ کی پشت پر بیٹھ گیا۔ بس بس! میں نے کہا "آخر بلند حوصلگی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دو بار میں نے تمھیں بتلا دیا کہ میں معمولی آدمی نہیں ہوں میرے غصہ کے آگے کوئی گستاخی کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میں تمھیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں تمھیں پھانسی کا حکم سناتا ہوں۔ یہ عدالت کا فیصلہ

اور انصاف کا تقاضا ہے۔ تمھارے خلاف کئی الزام ہیں۔ تم آوارہ ہو تم ابنِ عائمہ کے دشمن ہو۔ تم دفعہ ۱۴۴ کی زد میں ہو۔ تم بلا ٹکٹ سفر کر رہے ہو۔ تم . . . . . دیکھیں میں کہتا ہوں یہ تمام جرائم تمھیں تختۂ دار پر لے جانے کے لئے کافی ہیں۔ تم سُن رہے ہو۔ اب تمھیں موت کا جام پینے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ تم نے سُنا؟

وہ یہ سب کچھ سُن رہا تھا۔ مگر ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو کہ اس پر میرے غصّہ سے تمتماتے ہوئے چہرے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ بدستور میرے ہاتھ کی پشت پر بیٹھا رہا۔ میں نے پھُرتی کے ساتھ دایاں ہاتھ گھما کر اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا لیکن وہ نہایت آسانی سے کترا کر نکل گیا۔ کیا میں زک اٹھا سکتا تھا؟ اور وہ بھی ایک مچھر سے؟! میری خودداری نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں نے اخبار سے اسے مارنا چاہا لیکن وہ وار خالی دے کر اڑ گیا۔ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ اپنی نشست سے اچھل کر میں نے لیمپ کے گرد اس کا تعاقب کیا۔ میں نے ہر پھُرتی اور چالاکی سے کام لیا۔ پہلے اسے ایک جگہ بیٹھ جانے دیا۔ پھر آہستہ سے آ کر یکبارگی دھاوا بول دیا۔ مگر نتیجہ معلوم!

وہ مجھے بندروں بھر سے کھیل رہا تھا۔ ایک ماہر سانڈھ مار کی طرح۔ ایک عظیم الجثہ ہستی سے۔ خیال فرمایئے۔ اس نے اپنی تفریح طبع کے لئے انتخاب بھی کیا تو کسے؟ اپنے پیچھے اچھے خاصے پُرن چکی کے سے انسان کو لگا رکھنا بھی عجیب مذاق تھا۔ اس نے مجھے تختۂ مشق بنایا اور میں بنا رہا۔ کیا کرتا۔ مجبور تھا۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے ڈبہ میں تنہا نہیں ہوں بلکہ یہ مچھر میرا شریکِ سفر ہے۔ نصف ڈبہ کا حق دار اور مساوی حقوق کا مالک!! اب مچھر میرے لئے محض ایک کیڑا نہ تھا بلکہ اس کی وقعت میری نگاہوں میں بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اسے اپنا ہم رتبہ سمجھنے لگا۔ اور خود کو اس سے اعلےٰ و افضل سمجھتا تو کس برتے پر۔ جب کہ میں ایک معمولی اور سب سے پہلے ہی مقابلہ میں اس سے شکست کھا چکا تھا۔

میں نے اسے موت کا حکم سنا دیا تھا اور اسے مارنے کی کوشش بھی کی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ یہ میری طاقت سے باہر ہے۔ یہ میرے لئے بڑے شرم کی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں رحم دلی سے کام لوں۔ کیونکہ یہ بندۂ نازک سلف کی صفت رہی ہے۔ اور اس سے میں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتا ہوں۔

"میں اپنا سُنایا ہوا پھانسی کا حکم واپس لیتا ہوں" میں نے اپنی نشست کی طرف مراجعت کرتے ہوئے اپنے شریکِ سفر سے کہا۔ "میں تمھیں موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا۔ مگر ہاں معاف ضرور کر سکتا ہوں۔ اور میں نے تمھیں معاف کیا۔"

میں اخبار سنبھال کر عزت کے ساتھ اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ میرا ہم سفر اڑتا ہوا آیا اور اخبار پر بیٹھ گیا۔ "بے وقوف" میں نے کہا "تم خود ہی جال میں پھنس گئے۔ اگر میں اخبار کو دونوں جانب سے تہ بند دوں تو تم اس پسندوں کے انعامی مقابلہ میں گاندھی جی کی شرکت اور آئندہ جنگِ عظیم کے امکانات کی سرخیوں کے درمیان پس کر آتا ہی تو ہو جاؤ۔ مگر نہیں میں ایسا نہیں کرونگا۔ میں نے تمھیں ایک بار معاف کر دیا ہے اور میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں جو منہ سے کہتا ہوں اسے کر دکھاتا ہوں۔ میں تمھیں مارنا بھی نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں نے تمھیں خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میرے خیالات تمھاری طرف سے تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا میں کہہ دوں کہ . . . . . کہ مجھے تم سے محبت ہو چلی ہے۔ بہر حال تقدیر نے آج کی شب ہمیں ہم سفر بنا دیا۔ میں تمھارے لئے باعثِ تفریح بنا۔ اور تم میرے لئے۔ غرض دونوں برابر رہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی غیر فانی نہیں ہے۔ ہماری زندگیاں یکساں ہیں۔ شاید تم اپنے سفر کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور میں بھی اپنے سفرِ زندگی کے متعلق مکمل معلومات نہیں رکھتا۔ تم اندھیری رات میں اَن دیکھی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ٹرین کے روشن ڈبہ میں داخل ہو گئے ہو۔ اور کچھ عرصہ لیمپ کے گرد چکر لگانے کے بعد بھیانک فضا کی مہیب تاریکی میں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ میں بھی عدم کی اَن دیکھی منزلیں طے کرتا ہوا عالمِ وجود میں آ گیا ہوں۔ کچھ عرصہ دنیاوی لذّتوں کے حصول میں کوشاں رہنے کے بعد نہ معلوم کب اور کہاں چلا جاؤں گا۔ ہم اچانک نمودار ہو جانے والے بھوت کی طرح عالمِ شہود میں آ جاتے ہیں اور اسی طرح معدوم ہو جانے کے بعد اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ شاید . . . . . .

"تو آپ اسی اسٹیشن پر اتر جائیں گے جناب؟" ایک قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے مجھے منزلِ مقصود سے آگاہ کر دیا۔

"شاید میری آنکھ جھپک گئی تھی" میں نے مسافر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھا کر ڈبہ سے باہر نکل آیا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر سے آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں دیکھا کہ میرا ہم سفر لیمپ کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔

(گارڈنر) **غلام عباس "مولوی"**

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں اپنے گاؤں سے ان کے شہر میں رہنے کے لئے گئی۔ اس وقت میری عمر گیارہ یا بارہ برس کی تھی۔ جب میں اپنے گاؤں میں تھی تو ان کو جانتی تک نہ تھی۔ ان کے شہر میں میرے ایک عزیز بھی رہتے تھے۔ پہلے پہل میں اپنے عزیز ہی کے گھر اتری، وہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے عزیز کے عزیز تھے مجھ سے تو کوئی خاص رشتہ داری نہ تھی۔

وہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صبح اپنے عزیز کے یہاں آئی۔ بس اسی وقت ان کو پہلی بار دیکھا۔ میں نے رسمی سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ دوپہر کو کھانے سے فراغت پا کر گھر کے سب لوگ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ساری فضا خاموش ہو گئی۔ دھوپ کی وجہ سے کمروں کے دروازے بند کر دئے گئے تھے۔ اس لئے کچھ اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ وہ عمر وہ قیامت کا زمانہ۔ پھر میری شوخ طبیعت بھلا مجھ سے بستر پر خاموش کیسے لیٹا جاتا! اٹھ کر سارے گھر کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے میں ان کے پاس پہنچی۔ کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کے بالوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا: "اخاہ! آپ کا خط تو بہت اچھا ہے۔ کیا لکھ رہے ہیں؟"

انھوں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میری بے باکی اور بے تکلفی پر کچھ مسکرائے پھر کہا: "میرا خط تو بہت معمولی ہے کچھ نہیں ایک کہانی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ آؤ، بیٹھو۔" میں کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے ان کو نہایت غور سے دیکھا۔ کوئی بیس۔ بائیس برس کا سن چھریرا جسم میانہ قد، پتلی کمر، سانولا نمکین رنگ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پتلی سی ناک مسی کے رنگ کے ہونٹ۔ کشادہ پیشانی۔ سیاہ گھنی ابرو۔ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد مجھے ان کی صورت اچھی معلوم ہوئی۔ میں مسکرا دی۔ انھوں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی تھیں؟ کیوں ہنسیں؟ تم تو بڑی شریر معلوم ہوتی ہو۔"

میں نے کہا: "کچھ نہیں۔ آپ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ صبح اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ ہوں! میں تو بالکل شرارت نہیں کرتی۔ لیکن آپ کی طرح سب لوگ کہتے ہیں کہ میں شریر ہوں۔ میں نے تو بہت دن سے شرارت کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

اس پر وہ مسکرائے۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

چند روز بعد انھوں نے مجھے اپنی سنگیتر کی تصویر دکھائی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ان کی رشتے کی بہن کی تصویر ہے لیکن میں سمجھ گئی کہ ان کی سنگیتر ہوں گی۔ رشتے کی بہن ہوئیں تو کیا ہوا۔ بہرحال مجھ ان کی سنگیتر پسند آئیں میرے ہی صوبے کی لڑکی صوبے کا مخصوص لباس۔ وہی نزاکت میں نے کہا: "اچھی تو ہیں لیکن آپ کا گھر کب آباد کریں گی؟"

انھوں نے کہا: "دیکھو! پھر وہی شرارت کی باتیں۔ یہ تو میرے رشتے کی بہن ہیں۔"

میں نے کہا: "ہاں! ہوں گی لیکن ساتھ ہی ساتھ "وہ" بھی تو ہیں۔"

اس پر وہ مسکرا دیئے۔ اُسی روز میں اپنے گھر چلی آئی۔

میرا گھر اُن کے مکان سے بہت دور نہ تھا۔ وہ اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں علطانہ پریشانیوں میں مبتلا رہتی تھی۔ وہ مجھے بہت تسکین دیتے تھے۔

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ موسم گرما واپس جا رہا تھا۔ امنگیں پیدا کرنے والی برسات آ رہی تھی کبھی کبھی ایک دو بادل برس جاتے۔ جھڑی تو نہ لگی تھی میرے گھر میں سنترے کا ایک باغ تھا۔ کچھ سنترے پک چکے تھے کچھ پک رہے تھے اور چند پکنے کی آرزو کر رہے تھے۔ سنتروں کی خوشبو آہستہ آہستہ جذبات بیدار کر رہی تھی۔ بیلے کی کلیاں قاصد بن کر جانے کے لئے مچل رہی تھیں۔ آسمان پر کالے کالے اور بھورے بھورے بادل چھائے رہتے تھے۔ سنترے کے درختوں اور بادلوں کا افق عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ عرصے سے وہ میرے گھر نہ آئے تھے۔ ایک دن شام کو میں رعائی تھالی لئے پہنچی۔ سب معمول سنترے کے باغ میں

بیٹھی تھی (اس عرصے میں میں ایک شہری لڑکی ہو چکی تھی۔ شہر کی لڑکیوں کی طرح شام سنگھار کر کے باغ میں جا بیٹھتی۔ اگر اکیلی ہوتی تو کسی کتاب یا رسالے کا مطالعہ کرتی، اتنے میں دیکھا کہ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی چکن پہنے چلے آ رہے ہیں مسکراتے ہوئے اور اپنی ترکی ٹوپی کا پھندنا ہلاتے وہ میری طرف بڑھے میں استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا "آیئے۔ آیئے!"

روز کی حرف و حکایات تھی وہ بھی نہ رہی
گاہے گاہے کی ملاقات تھی وہ بھی نہ رہی

لیکن ذرا کسی دوسرے کا بھی خیال کر لیا کیجئے۔ میں تو آپ کو اتنا یاد کرتی ہوں اور آپ تو ایک نہ دو اتنے اتنے دن بعد آتے ہیں کچھ تو انصاف کیجئے۔"

وہ کہنے لگے "ماشاء اللہ تم تو خوب بولنے لگی ہو۔ یہ باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟"

میں نے کہا "باتیں تو حالات سکھا دیتے ہیں۔ ہاں، شعر ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ اس وقت یاد آ گیا۔ اس لئے آپ پر صرف کر دیا۔"

وہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ آج وہ خلافِ معمول مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا "کچھ گاؤ۔ تمھیں گانا تو آتا ہو گا؟"

میں نے کہا "آتا وا تا تو نہیں۔ ابھی تو سیکھتی ہوں۔"

غضب کا موسم سنترے کی خوشبو۔ گھٹا چھائی ہوئی۔ پھر ان کا اصرار میں گانے کے لئے تیار ہو گئی۔ کچھ شرما کر ہاتھوں میں منہ چھپا کر ملہار کی ٹھمری سنائی گیت کے الفاظ بڑے پُر درد تھے۔ میں نے ذرا سی دیر کے لئے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ اس وقت یہ نہ جانتی تھی کہ الفاظ کے درد سے انسان رو بھی سکتا ہے۔ حیران ہو کر پوچھا "کہئے کیوں طبیعت ہے؟ آپ کیوں رونے لگے تھے؟" انھوں نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور سمجھ گئے کہ میں ان کے رونے کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ بات ٹالنے کے لئے بولے کچھ نہیں ایک بات یاد آ گئی تھی اس لئے آنسو نکل آئے۔ "شاباش! تم بہت اچھا گاتی ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ اس روز وہ خلافِ معمول رات تک بیٹھے رہے۔ جاتے وقت بھی کچھ اپنے اوپر جبر کر کے گئے۔ اس دن کے بعد سے وہ میرے پاس قریب قریب روز آتے۔ غریب باتیں کرتے۔ اس عرصے میں میں بھی ان سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ باہر سے بھی لوگ آتے تھے بعض اشخاص کو آتے دیکھ کر وہ مجھ سے اندر جانے کو کہتے۔ میں باوجود اس کے کہ ان لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتی تھی اٹھ کر چلی جاتی اور مجھے ذرا بھی ناگوار نہ گزرتا۔

ایک دن حسبِ معمول وہ شام کو آئے۔ تھوڑی دیر ہوئی بارش ہوئی تھی اور اب دھوپ نکل آئی تھی۔ کیسا اچھا وقت تھا۔ مٹی سے ملگجی سی موندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ نیم کے درخت نہائے ہوئے کھڑے تھے۔ درختوں سے پانی کے قطرے کبھی کبھی ٹپک پڑتے تھے۔ پپیہا الگ چہک رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کالے کالے بادل بھاگے پھر رہے تھے کہیں ہلکے سے بادل میں سورج مسکرا رہا تھا کبھی بادل ہٹ جاتا تو بالکل بے نقاب ہو جاتا۔ غرض بڑا اچھا سماں تھا میں ان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آ گئے۔ میری خوشی نہ پوچھئے۔ وہ میری آسمانی ساڑی کو دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ کہا "آج تو بہت تر و تازہ اور خوش خوش نظر آ رہی ہو۔ میں نے کہا "خوب! خوش کیوں نہ نظر آؤں؟ میں انتظار کروں آپ آ جائیں۔ اور پھر بھی اداس ہی بیٹھی رہوں؟"

انھوں نے کہا "اچھا! شکریہ۔ آج تو کہیں سیر کو جانے کو دل چاہتا ہے" میں نے کہا "بازار تو مجھے بھی جانا تھا۔ دور کے راستے سے آہستہ آہستہ چلئے تو سیر بھی ہو جائے گی۔" وہ راضی ہو گئے۔ میں والدہ سے پوچھ کر ان کے ساتھ ہو لی۔

راستے میں انھوں نے پوچھا "کیا کیا خریدو گی؟"

میں نے بتایا "چار کریٹ بسکٹ کا ڈبہ۔ چوٹی میں ڈالنے کا فیتہ اور باقی چیزوں کی فہرست ہے۔"

انھوں نے پوچھا "فیتہ کس رنگ کا لو گی؟"

میں نے کہا "اودا یا سبز"

انھوں نے کہا "تمھیں سب سے زیادہ کون سا رنگ پسند ہے؟"

میں نے کہا "سبز"

انھوں نے پوچھا "آسمانی نہیں اچھا لگتا؟"

میں نے کہا "جی ہاں! وہ بھی اچھا ہوتا ہے۔" اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے بازار پہنچ گئے۔ سب چیزیں خریدیں اور واپس ہوئے۔ فیتہ میں نے آسمانی رنگ کا خریدا تھا۔ راہ میں وہ کہنے لگے "فیتہ تو تم نے آسمانی ہی خریدا!" اس پر میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی۔ ہم لوگ گھر پہنچے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے گھر چلے گئے۔ رات کو میں بستر پر لیٹے لیٹے آسمانی رنگ کے متعلق سوچنے لگی۔

"آسمانی رنگ واقعی ہوتا اچھا ہے۔ انھیں کیوں پسند ہے؟ مجھے سبز کیوں پسند ہے؟ آسمان تو آسمانی رنگ کا ہے اور تمام رفعت سبز ہوتے ہیں۔ اللہ میاں کو تو دونوں رنگ پسند ہیں۔"

انھیں خیالات نے مجھے تھپکنا شروع کیا اور میں دل سے باتیں کرتے کرتے سو گئی۔

چند روز تک وہ اسی طرح آتے رہے۔ پھر ہم لوگ ایک دوسرے مکان میں چلے گئے۔ نئے مکان میں وہ ایسے وقت آتے کہ میں اسکول میں ہوتی۔ والدہ سے باتیں کر کے چلے جاتے۔ والدہ نے مجھے بتایا کہ وہ میری کاپیاں اور کتابیں دیکھ جایا کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ "بچاری اپنی عمر کے لحاظ سے تو بہت کچھ کرتی ہے ڈرائنگ تو غیر معمولی طور پر اچھی ہے"۔ میں نے والدہ سے کہا "ان کی قدر دانی ہے"۔

ایک روز شروع رات پڑھنے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی میں ایک انگریزی ناول کا آخری باب پڑھ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ میز سے پاؤں ٹکائے کرسی پر جھول رہی تھی۔ اتنے میں وہ آ گئے۔ پیچھے سے میری کرسی روک لی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو مسکرا دئے اور قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی تھیں؟" میں نے کتاب پیش کر دی۔

کہا "اخاہ! یہ تو میں نے بھی پڑھی ہے۔ کیا تم نے ختم کر لی؟"

میں نے کہا "جی! ابھی ابھی ختم کی ہے"

پوچھا "پسند آئی؟ ہیروئن کا کیریکٹر کیسا تھا؟"

میں نے کہا "کتاب تو اچھی خاصی ہے۔ ہیروئن کے کیرکٹر کے متعلق کیا کہوں؟ عشوہ بشوخی۔ ناز و انداز و ادا سب ہی تو تھا۔ اور یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے کہ جہاں حسن ہوتا ہے وہاں تغافل بھی ہے"

اس پر وہ کہنے لگے "SO YOU HAVE GOTA ROMANTIC HEART"

اس پر میں جھینپ سی گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ میرے چہرے سے میرے خیالات کو پڑھنے لگے۔ اسی وقت کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ میں نے خنکی محسوس کرتے ہوئے اور بات ٹالنے کے لئے بھی کہا "سردی ہو رہی ہے چائے بنوا لوں؟"

میں نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ سمجھ گئے کہ میں بات ٹالنے کیلئے کہہ رہی ہوں۔

کہنے لگے: "مجھے تو اس وقت سردی نہیں محسوس ہو رہی۔ نہ چائے پینے کو طبیعت چاہتی ہے"۔ اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے میز پر سر رکھ دیا اور ان کی طرف ایک بار دیکھا۔ پھر تو ہائی درسری طرف دیکھنے لگی۔ باہر سے درختوں کی سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی کبھی کبھی کوئی چڑیا آہستہ آہستہ بولنے لگتی۔ میرے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے میں ان کے سامنے آتی تو تھی مگر پہلے کی طرح نہیں اب سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ آتی۔ ان کی نظر بچا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھتی اور جب وہ مجھے مخاطب کرتے تو دوسری طرف دیکھنے لگتی۔ ان کے پاس بیٹھنا بھی چاہتی تھی اور جھجکتی بھی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ میرے ساتھ ان کی گپیاں بڑھتی گئیں۔ آہستہ آہستہ ملاقات کے دن وہ میرے ساتھ ایک مسئلہ حل کر رہے تھے۔ مجھے اس زمانے میں مسئلے حل کرنے کا بڑا شوق تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ میں دوسرے شہر میں چلی آئی۔ میں نے سنا کہ ان کی سنگیتہ کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہوئی ایک دن وہ میرے کسی دوست کے یہاں مجھ سے ملنے آئے لیکن میں اس وقت وہاں نہ تھی۔ ان کے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا۔ اس لئے چلے گئے۔ مجھے ان سے نہ ملنے کا بڑا افسوس ہوا۔ ایک دن میں ان کے شہر گئی ہوئی تھی۔ سڑک پر سے انھیں گزرتے دیکھا لیکن بلا نہ سکی۔

ایک سال بعد میں نے سنا کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ بہت غمگین رہتے ہیں۔ مجھے ان کی بیوی سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہوا۔ سنا تھا کہ ہر لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔ بیچاری شادی کے بعد صرف ایک سال زندہ رہیں۔

اب مجھ سے ان سے کبھی ملاقات ہوئی اور میری بہت پڑی (کیونکہ اب مجھ میں وہ پہلی سی بے باکی نہیں رہی) تو پوچھوں گی کہ آپ کو وہ زمانہ اور وہ باتیں بھی یاد ہیں کہ نہیں؟

دیکھوں پھر وہ کیا کہتے ہیں!

سلیمہ سلطانی بیگم لکھنوی

ملنے کا پتہ
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
مکمل فہرست مفت
طلب کریں۔

اتنے بڑے شہر میں صدہا مارے پھرنے کے لئے اور صرف ایک وقت کی سادہ خوراک حاصل کرنے کی مسلسل بے فائدہ جستجو کے لئے مجھے کوئی چیز نہ روک سکے گی۔ میں جانتا تھا کہ لندن کی گلیوں میں پھرنے والے فقیر اگر مشاہیر ہوں تو اچھی روزی کما لیتے ہیں۔ شہر ان سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی اور نہ مجھ سے یہ ہو سکے گا۔ بعض نے اپنے آپ کو کسی طرح جیل تک بھی پہنچایا جہاں انھیں تین وقت کا کھانا میسر ہے لیکن یہاں بھی میری خودداری سدِ راہ بنے گی۔ میں نے مصمم ارادہ کرتے ہوئے فیصلہ کر دیا کہ میں سوسائٹی پر بار بن کر نہیں رہوں گا۔ ان حالات میں اور ایسے طریقِ پرخودکشی کا ارتکاب نہ صرف قابلِ احترام و عزت ہوگا۔ بلکہ کسی پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اور اس میں صرف تھوڑی سی گیس خرچ ہوگی۔ اگرچہ میرے جسم کی تجہیز و تکفین کا کام ضرور باقی رہ جائے گا لیکن اس کے لئے بھی میں کسی ہسپتال کے نام خط چھوڑ جاؤں گا۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میرا اعتقاد اور زیادہ پختہ ہوتا گیا کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل کبھی بھی نہیں ہوئی اور اس کو چھوڑ دینے کے بعد ہی میں مطمئن ہو سکتا ہوں۔ میں نے دنیا میں آتے وقت کسی سے اجازت طلب نہیں کی تھی اس لئے یہاں سے جانے کے لئے بھی میں کیوں خود مختار نہ ہوں؟ اور اس کے بعد اگر مجھے معلوم ہوا کہ اگلا جہان بھی ہے، اور مجھے اس خدا کے سامنے جانا بھی پڑا جس میں اعتقاد رکھنے کے لئے میرے والدین مجھے سکھاتے رہے تو میں یہ حالات پیش کر دوں گا جو مجھے یہاں پیش آ رہے ہیں۔ میں یقیناً صحیح راستے پر ہوں گا۔ اور اس کا انصاف میرے تجربے میں بالکل نئی چیز ہوگا۔

میں نے دو مختصر سے خط لکھے اور انھیں میز پر رکھ دیا۔ جہاں سے وہ بآسانی مل سکتے تھے اور اخبارات کے لمبے چوڑے اوراق پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے بنائے اور اپنے جیبی چاقو کی نوک سے انھیں دروازے اور کھڑکی کے سوراخوں میں اس طرح بھر دیا کہ کوئی سوراخ باقی نہ رہا۔ یہ کام میں نے بہت اچھی طرح کیا۔ کیونکہ میں اپنے ارادوں میں ناکامیاب نہیں رہنا چاہتا تھا۔ بالآخر کوئی گیس سونگھ لے اور مجھے جسم و جان کا تعلق منقطع ہونے سے پہلے بچا لے یہ کام ختم کرنے کے بعد میں نے گیس کا بٹن کھول دیا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا میں نے اپنے ہاتھ پاؤں آرام سے پھیلا دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور انتظار کرنے لگا کہ موت سے مقابلہ کرنے والے دروازے میں سے گزر کر کسی خوشنما دنیا میں پہنچ جانے کی مانند ہے یا کسی پہاڑی پر سے ابدی خلا یا لاموت میں کود پڑنے کی طرح۔

میں دونوں کے استقبال کے لئے تیار تھا۔ میں نے چند سانس کھینچ کھینچ کر لئے۔ لیکن گیس کافی تیزی سے نہیں پھیل رہی تھی اور ابھی تک مجھ پر اثر نہ کر سکی تھی۔

دفعتہً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے رگ و ریشے میں ایک خوفناک سی لہر دوڑ گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مالکِ مکان ہوگا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور میرے دروازے پر دستک نہیں دیتا تھا۔ یہ مجھ سے اگلے ہفتے کا کرایہ وصول کرنے آیا ہوگا۔ اس دفعہ وہ ایک دن پہلے آ گیا ہوگا۔ میں دروازہ کھولنے پر مجبور تھا کیونکہ دوسری صورت میں اس کے پاس جو نکہ چابی تھی وہ اندر آ سکتا تھا اور میرے ارادوں کو درہم برہم کر سکتا تھا۔ میں بستر سے کود کر باہر نکلا۔ گیس کا بٹن بند کر دیا۔ اور جلدی سے دروازے کی طرف اس ارادے سے بڑھا تاکہ تھوڑا سا کھول کر اس بڈھے سے کہوں کہ کرائے کے لئے کل آئے۔ میں نے دروازہ ایک انچ یا اس سے زیادہ کھولا اور دیکھنے لگا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ باہر ہال میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ چونکہ وہ میرے ارادوں میں مخل ہو چکی تھی۔ میں نے غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ احساس نے عاجزانہ طور پر ایک طاقت میری طرف بڑھا دی جو بوٹوں کے بہت سی قسم کے نقشوں اور فیتوں سے پُر تھی۔ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"جناب مجھے آپ کو تکلیف دینے کا بہت افسوس ہے لیکن میں نے خیال کیا شاید آپ کو نقشوں کی ضرورت ہو۔ انکی قیمت صرف دو پنس فی جوڑی ہے میرے پاس ہر قسم کے اور ہر سائز کے جیسے آپ چاہیں موجود ہیں"

میں اپنی زندگی پر نفریں بھیج رہا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے یہ بتانے میں کوئی فائدہ نہیں کہ میں مفلس اور قلاش ہوں میرا خیال ہے کہ اس نے میری حالت کو غلط سمجھا۔ کیونکہ جلدی سے اس نے وہ طاقت میرے سامنے سے ہٹالی اور پہلے سے بھی زیادہ کانپتی آواز میں کہنے لگی:۔

"براہِ مہربانی پولیس کو نہ بلائیے۔ میں جانتی ہوں کہ ہم لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں لیکن مجھے چونکہ یہ ضرور کہیں نہ کہیں کچھ بیچنے ہیں..... میں ابھی چلی جاؤں گی مجھے ان سے نہ نکلوائیے"

اب یہ دیکھتے ہوئے کہ میں اس کی طرف غصے سے نہیں دیکھ رہا اس نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے اور انگلیوں سے اپنے بازو کو کھجانا شروع کیا۔

جب میں دوسری منزل پر کام کر رہی تھی تو ایک آدمی نے مجھے زینے پر سے دھکا دے دیا۔ شاید وہ مجھے گرانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نیچے گر پڑی

اس سے مجھے یہ زخم آیا۔"

ایک لمحے کے پس وپیش کے بعد اس نے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔

"اگر آپ ان فنیتوں کو خریدنا نہیں چاہتے تو مجھے کچھ رنج نہیں۔ دنیا میں شاید کسی کو ان کی ضرورت نہیں لیکن کیا میں کچھ دیر کے لئے آپ کے کمرے میں آسکتی ہوں؟ اور ذرا آرام لینے کے لئے بیٹھ سکتی ہوں۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ میں اس وقت بڑی تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میں چند لمحوں کے بعد بالکل درست ہو جاؤں گی۔"

میں نے گونگوں کی طرح اسے اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ اس نے کمرے کی حالت کا اچھی طرح جائزہ لے لیا اور میرے بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ ایک نظر اس کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کی عمر انیس بیس برس کے قریب ہوگی۔ اگر اسے کھانے کے لئے اچھا کھانا اور پہننے کے لئے اچھا لباس ملتا تو وہ ضرور حسین معلوم ہوتی۔ اب غربت میں اس کی زندگی تباہ تھی لیکن میری زندگی بھی تو تباہ ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کی اس حالت کا فکر بے سود تھا۔

اس دوران میں جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ اس نے میری خودکشی کی تیاریوں کو بھانپ لیا۔ میرے خیال میں اس نے سب معاملہ اسی وقت سمجھ لیا ہوگا جب اس نے دروازے پر دستک دی تھی اور جب میں زندگی کی الجھنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"کیوں ——— تم ——— تم ———؟"

"ہاں" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تم نے یہ بھانپ لیا۔ اگر تم دس منٹ بعد آتیں تو میں تمھاری آواز بھی نہ سن سکتا۔ جب تم نے دروازے پر دستک دی گیس مجھ پر اثر کر رہی تھی۔ اب جوں ہی تم جاؤ گی میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں گا۔ اس پر بحث کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔" اس نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا تم محبت کے ستائے ہوئے ہو؟ کیا تمھیں کسی عورت سے تکلیف پہنچی ہے؟ میری اس بات پر یقین کرنا۔ عورتیں کسی توجہ اور تشویش کی مستحق نہیں ہیں۔"

میں نے انکار کے طور پر اپنا سر ہلایا اور کہا۔

تمھارا خیال غلط ہے۔ میں عورتوں کے جھگڑے میں کبھی نہیں پڑتا۔ میرا قصہ اس سے زیادہ دردناک ہے۔ صرف ایک چیز کے لئے میری زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ گزشتہ دو دن سے مجھے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ کل مجھے یہ کمرہ خالی کرنا ہوگا۔ میں کہاں جا سکتا ہوں؟ کہیں نہیں۔ اس دنیا میں کوئی انسان نہیں جسے میری فکر کرنے کی ضرورت ہو۔ میں کسی طرح بھی کوئی کام حاصل نہیں کر سکا اور اب میں تلاش کرتے کرتے بھی تنگ آ گیا ہوں۔ شاید میں اس قابل نہیں لیکن میں کبھی بھی ان مصائب کو آسان کرنے کے لئے غیر شریفانہ طرز زندگی اختیار نہیں کروں گا۔ اور اس سے بیشتر کہ زندگی مجھے اور اذیت دے میں اپنے آپ کو ختم کر رہا ہوں۔"

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مایوس ہونے کی کونسی وجہ ہے۔ تم نوجوان ہو!

میں نے جواب دیا "نہیں امید میرے لئے نہیں؛ میں نے اب تک پچیس سال گزارے ہیں ان میں بہت کم خوشگوار لمحات میرے لئے آئے ہیں۔ اور اب کیا یقین ہو سکتا ہے کہ آیندہ پچیس سال بھی ایسے نہیں گزریں گے میں کیوں اس دکھ دینے والی دنیا میں رہوں جہاں مجھے زبردستی رکھا جا رہا ہے حالانکہ میں گیس کا بٹن دبا دینے سے ابدی نیند سو سکتا ہوں ——— ابدی ——— ہمیشہ کی۔"

میں اس سخت، کرخت اور ناقابلِ تردید منطق کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جو انسان میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب زندگی کے مصائب اسے انتہائی حالات تک پہنچا دیں اور وہ زندگی کے متعلق کچھ ان امید افزا خیالات کے ساتھ جو میرے دلائل کے مقابل شکستہ ہو کر رہ جاتے تھے بحث میں مصروف تھی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ تم صحیح راستے پر ہو۔" آخر کار اس نے تسلیم کر لیا "زندگی فی الحقیقت بہت تکلیف دہ ہے۔"

ایک لمحے کے لئے ہم خاموش رہے۔ پھر اس نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی کے متعلق تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے بالکل صحیح ہے۔ میری گزشتہ زندگی میں بھی ایسے مواقع آئے ہیں جب میں بھی ایسا محسوس کرتی رہی ہوں۔ مجھے بھی اس کمرے میں رہنے کی اجازت دو۔ اور مجھے بھی اپنی زندگی کو اسی طرح ختم کرنے دو جس طرح تم کر رہے ہو، اس دنیا میں کوئی انسان نہیں جسے میرے متعلق تشویش ہو۔ کل سے کھانے کیلئے مجھے صرف ایک بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی ملی ہے۔ آج ابھی تک ایک فنیتہ بھی نہیں بکا اور اب رات کو بھی میرے پاس کچھ نہیں۔ میں ———— میں

بھوکی بھی ہوں۔ لیکن اس جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ایک ایسا طریقہ ضرور ہے جس سے میں اپنی روزی کما سکتی ہوں لیکن میں وہ کبھی اختیار نہیں کروں گی۔ کیا تم یہاں مجھے اپنے ساتھ ٹھیرنے کی اجازت دوگے؟ اور اس اذیت وہ دنیا کو اسی طرح چھوڑ دینے کی بھی جس طرح تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ براہ مہربانی ضرور!"

میں پہلے تو نہیں چاہتا تھا لیکن آخر کار متفق ہو گیا۔ کیونکہ ذلت اور اذیت کی حالت میں رفاقت عزیز ترین ہوتی ہے۔ آخر جس طرح مجھے اپنی زندگی ختم کر دینے کا حق تھا اسی طرح اوبھی تھا، اور گیس اس کا بہترین علاج تھی موت کے بعد جب ہمارے مردہ جسم پائے جائیں گے۔ دنیا جو بھی چاہے خیال کرے، اخبارات بڑے بڑے جلی عنوانات سے یہ خبر شائع کریں گے :-

خودکشی کا معاہدہ!

محبت کا انجام!

لیکن ہمیں کیا پروا ہے۔ ہم دونوں سے اس وقت اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہم نے دروازے کے سوراخوں کو اخبارات کے پرزوں سے پھر بند کیا وہ بستر پر دراز ہو گئی اور میں نے گیس کا بٹن کھول دیا۔ میں کرسی پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے مجھے بستر پر آجانے کے لئے کہا۔ کیونکہ وہاں کافی جگہ تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس اذیت بخش دنیا میں زندگی کے یہ چند آخری لمحے تو ہم آرام سے گزار سکیں۔ میں بھی اس کے قریب ہی بستر پر دراز ہو گیا اور سوچا کہ ہم دونو کے مردہ جسم اکٹھے پائے جانے سے لوگ کیا خیال کریں گے لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی اور نہ اس نے۔ ہم دونو اسی طرح لیٹے رہے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ گہرے سانس لینے لگے اور کمرہ آہستہ آہستہ گیس سے بھر گیا۔ اگرچہ گیس آہستہ پھیل رہی تھی لیکن پھیل ضرور رہی تھی۔

یک لخت اس نے مجھ سے کہا :-

"میں ——— میں ——— چونکہ میرا خیال ہے مجھ پر گیس اثر کر رہی ہے ——— مرنے سے پہلے اس کمرے میں یہ چند لمحے گزارنے کی اجازت دینے کے لئے تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جب سے دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ صرف تم ہی ایسے انسان ہو جس نے مجھ سے یہ ہمدردی کی ہے میں تمھاری بہت ممنون ہوں ——— خدا حافظ!"

میں ہمدردی کے لہجے میں بولا۔ اس لئے کہ اپنے ساتھ اسے بھی موت کے منہ میں لئے جا رہا تھا۔

"خاتون! میں تمھارے کسی شکریے کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے ہمدردی کا نام نہ دوگی۔ کاش میں کوئی ایسا کام کرتا جس کیلئے تم شکریہ ادا کر سکتیں لیکن میں ——— میں ——— میں بھی تم سے ایک چیز کی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ کسی قدر مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے لیکن میں تمھیں چومنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرصۂ دراز سے نہ کسی عورت سے باتیں کی ہیں اور نہ کسی کو چوما ہے۔ کیا میں تمھیں چوم سکتا ہوں۔ اس سے پیشتر ——— کہ ہم ———"

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

——— "ہاں ——— اگر تم واقعی ایسا چاہتے ہو"

میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنی طرف کھینچا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور میرے لب اس کے نرم لبوں سے جا ملے۔ ان میں حرارت تھی۔ اس نے میرے بوسوں کا جواب بھی ایسے پرجذبات طریق پر دیا کہ میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا ہم ایک دوسرے سے زور سے چمٹے ہوئے تھے میں اسے چومتا رہا لیکن آخر کار اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ کیونکہ گیس اس پر کافی اثر کر چکی تھی۔ بدہوشی کی سی حالت میں میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بے ہوش میری آغوش میں لیٹی ہوئی تھی . . . . . .

یک لخت مجھے احساس ہوا کہ میں قاتل بننے کے قریب ہوں۔ اس قسم کی عورت کو دنیا میں رہنا چاہئے۔ زندگی کے متعلق امید افزا خیالات رکھنے میں وہ صحیح راستے پر ہے۔ میری سخت۔ کرخت اور ناقابل تردید منطق مصائب اور تنہائی سے تنگ آئے ہوئے پریشان آدمی کے خیالات ہیں لیکن ——— تنہائی؟ ——— کیوں! اب میں تنہا نہیں رہوں گا۔ اگر وہ ———

اسے آہستہ سے الگ رکھتے ہوئے میں بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا۔ کمرہ گیس سے بھر چکا تھا میرا خاتمہ ایک لمحے میں ہی ہوا چاہتا تھا۔ سانس لینے کی سخت کوشش کرتے ہوئے اور ایک شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے میں نے گیس کے بٹن تک پہنچنے کی کوشش کی۔ موت کے منہ میں پہنچے ہوئے انسان کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے میں نے آخر بٹن بند کر دیا۔ اور فرش پر گر پڑا۔ اور اپنے آپ کو کھڑکی کی طرف گھسیٹنے لگا۔ میں نے سوچا شاید میں کبھی وہاں تک نہ پہنچ سکوں گا۔ لیکن آخر کار پہنچ گیا اور میں نے ایک مکہ مار کر شیشہ توڑ دیا۔ پھر میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

شاید چند منٹ مجھ پر بے ہوشی طاری رہی۔ آخر کار تازہ ہوا سے مجھے کچھ ہوش آیا۔ اور جوں ہی مجھے یہ خیال آیا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ میں بستر کے قریب پہنچا اور جلدی سے اس لڑکی کو اٹھایا۔ میں ہراساں ہو رہا تھا۔

اگر وہ مرجاتی تو کیا ہوتا! یہ کتنا ظلم ہوتا! میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور اسے کھڑکی کے قریب لے گیا۔ اور بے چینی سے دیکھنے لگا کہ وہ سانس لے رہی ہے یا نہیں۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہوچکا تھا۔ لیکن اس کا سینہ سانس کی خفیف سی آمدرفت سے ابھی تک آہستہ آہستہ اٹھ اور بیٹھ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے بچ رہنے کی امید باقی تھی۔ اس حالت میں میں ذہبت سی حرکتیں اس وقت اس قسم کی کیں جیسی انسان اس وقت کرتا ہے جب وہ یک لخت کسی خاص زبردست جذبے کے ماتحت ہو۔ میں نے اس سے معاف کردینے کی التجا کی اور کہا کہ میں بے وقوف تھا۔ جوں ہی میں اس غم سے چیخ اٹھنے کے قریب تھا کہ وہ مرچکی ہے اور جب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کی لمبی لمبی پلکوں میں جنبش ہوئی اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھنے لگیں۔

اگرچہ کچھ دیر کے لئے اسے سر درد کی شکایت ضرور رہی لیکن گیس کی اثرات اس پر سے زائل ہوچکے تھے۔ اس کے ساتھ مجھے بھی سر درد کی شکایت پیدا ہوئی لیکن اب میں اگر تنہا ہوتا تو شاید میں اور زیادہ بیمار ہوجاتا۔ اگلے دن میں اپنا سوٹ کیس اور اپنی چند اور چیزیں ایک دکان پر لے گیا۔ جہاں مجھے ایک حقیر سی رقم مل گئی جس میں سے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے بعد چند شلنگ باقی بھی بچ رہے۔ ہم ایک چھوٹے سے درمیانہ درجے کے ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ جہاں ہم نے گرم گرم خوراک حاصل کی جو ہم سے پہلے تو کھائی نہیں جاتی تھی لیکن جب ہم نے کھانے کا تہیہ کرلیا تو چبا چبا کر کھا گئے۔

اگلے روز میں نے اور اس نے فیتوں کو دو طاشوں میں سجایا۔ اور دن بھر میں ہم نے خاصے فیتے بیچ لئے۔ یہ ہماری ابتدا تھی۔ اگلے دن اس سے بھی بہتر

اب میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاتی جب تک وہ زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔ آہستہ آہستہ ہماری آمدنی بڑھتی گئی۔ اگرچہ ایسے دن بھی آتے تھے۔ جب ہماری فیتوں کی ایک جوڑی بھی نہیں بکتی تھی اور ہم بہت مایوس ہوجاتے تھے لیکن کوئی ایک دن مجھے گیرج میکینک کی جگہ مل گئی۔ اور اب ہم پر فاقے کی نوبت نہیں آتی۔ ہمارا مستقبل اب کسی قدر محفوظ ہے۔

قطعاً مایوس ہوجانا انتہائی بے وقوفی ہے۔ کیونکہ زندگی کا بہاؤ نہایت تیز ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا اس ندی کے اگلے خم کے پیچھے کیا کچھ ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ایف۔ ایم ساقی

غزل

جنونِ مدعا ہے اور میں ہوں
دلِ غم آشنا ہے اور میں ہوں

جفائیں ہیں تمھاری اور تم ہو
تقاضائے وفا ہے اور میں ہوں

خرد اور ہوش میں محوِ تحیر
جنوں کی انتہا ہے اور میں ہوں

حجاباتِ تعین کا گماں کیا
نظر کی انتہا ہے اور میں ہوں

نہ تسکیں ہے، نہ تسکیں کی تمنا
غمِ راحت فزا ہے اور میں ہوں

خیالِ ماسوا سے دور حاجی
بتاؤں کیا کہ کیا ہے اور میں ہوں

حاجی سرحدی

کوئل

اے درد کے پیمبر! اے نوحہ خوانِ ظلمت،
ظلمت فغاں ہے تیری، یا تو فغانِ ظلمت!

افسردگی ہے نالاں اُجڑے ہوئے گلوں کی
کلیوں پہ رو رہی ہے یا رُوح عبرتوں کی،

ماتم ہوا ہے پرّاں شیون کے پَر لگا کر،
یا جاگ اٹھی ہے غم کی تقدیر بلبلا کر

تصویر بولتی ہے اندوہ کی شجر پر،
یا سانپ لوٹتا ہے گلزار کے جگر پر

شبنم کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سحر ہے،
ناسور ہو گیا ہے، جو شاخ پر ثمر ہے

سہمی ہوئی ہیں کلیاں اِس شورشِ حزیں سے
منہ ڈھانپتی ہیں اپنا پتّی کی آستیں سے

گُل کا جگر ہوا ہے اس لَے سے ٹکڑے ٹکڑے
لالے کی ہے صراحی، اس مَے سے ٹکڑے ٹکڑے

لائی ہے حلق میں کیا دوزخ کی آگ بھر کر
برسا رہی ہے ظالم، جس کو تُو آب چمن پر،

گلزار اس صدا سے ماتم کدہ ہے سارا
خاموش ہو خدارا! خاموش ہو خدارا!!

مسعود شاہد

غزل

عشق بے چین رکھے گا مجھے معلوم نہ تھا
درد رہ رہ کے اُٹھے گا مجھے معلوم نہ تھا

نام سنتے ہی نکل آئے گا آنسو بن کر
رازِ الفت نہ چھپے گا مجھے معلوم نہ تھا

اُس کے غم سے کبھی فرصت نہ ملے گی مجھ کو
ہاتھ دِل سے نہ ہٹے گا مجھے معلوم نہ تھا

میرے احساس کی دُنیا ہی نرالی ہوگی
اِک جہاں اور بنے گا مجھے معلوم نہ تھا

راہِ مقصود میں غیرت کو مٹانا ہوگا
مجھ سے یہ ہو نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا

مختلف ہوگی مری بات سے جس کی ہر بات
سابقہ اُس سے پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا

میرے جذبات سمجھ لے مجھے اپنا کرلے
کوئی ایسا نہ ملے گا مجھے معلوم نہ تھا

عرضِ مطلب پہ پشیمان نہ ہوتا لیکن
دِل پہ قابو نہ رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

جیتے جی اُس سے ملاقات نہ ہوگی سیفی
یہ بھی ارمان رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

سیفی نوگانوی

مینارِ غزالاں

چین کے عہدِ قدیم کی ایک فسوں گر حسینہ کی لرزہ خیز داستان

باب ۱

پُر اسرار چین

چین اپنی قدامت کے اعتبار سے صنعتی وساحرانہ بستکاریوں کے باعث تاریخ عالم میں ایک بہت بلند و پُر اسرار درجہ رکھتا ہے۔ ماقبل تاریخ ——— یا کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح سے ——— انسان چین کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر اس کی قدامت، کثرتِ نفوس اور پُر اسرار تہذیب اسے سمجھنے نہیں دیتی۔ اگرچہ جدید دنیا چین سے کہیں قریب تر ہو گئی ہے مگر پھر بھی پُر اسرار چین کے سربستہ رازوں کا سمجھنا دشوار ہے۔

۳ ہزار سال قبل مسیح سے چین کی اپنی تہذیب اور اپنا تمدن موجود ہے۔ اور غالباً کوئی قدیم تہذیب اس قدر سختی کے ساتھ اپنی قدامت اور جمود پر قائم نہیں رہی ہے جس قدر چین کی تہذیب چینی تہذیب کے تحفظ میں ایک بڑا عنصر یہ کام کر رہا ہے کہ اہل چین کسی نئی چیز کو اپنے وجود اور اپنے تمدن میں مشکل ہی سے جگہ دیتے ہیں، زندگی کے نہایت سخت اصول جو بعید ترین ماضی میں بنائے گئے تھے ان کو مذہبی و روحانی عظمت حاصل ہونے کی وجہ سے کبھی اضمحلال نہ ہوا۔ تو تہم پرستی، سخت گیری جسمانی مشقت و اذیت صنعتی اور ہنرمندی اور اپنی قدامت کو ہوا بند حالت میں رکھنے پر اصرار، یہ ہیں وہ اسباب جس نے چین کے جمود و تعطل کو اس کی تہذیب اور مملکت کے تحفظ کو ہمارے لئے ایک وجہ حیرت بنا رکھا ہے ——— !

چین جیسے خشک، سخت گیری پر قائم جمود پر نازاں اور توہم و قدامت کے مقید ملک میں رومان اور شعری زندگی کا بھلا کیا کام ——— !

عورت

چین جیسے جامد و سرشارِ قدامت ملک میں عورت کی حیثیت سوائے جائداد و منقلہ کی حیثیت کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ پیدائش ہی سے عورت کے لئے ذلیل زندگی، محکومی اور دائمی خواری مقدر ہو جاتی تھی۔ ادب و شعر سے نسبت تو کجا۔ اسے معمولی نوشت و خواند کی نعمت بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ عشق و آزادی حیات کی سربلندی اسے کہاں نصیب۔ اسے اس کی مرضی کے خلاف جس کے ساتھ چاہا بیاہ دیا جاتا تھا۔ سخت پردہ اور پابندی اس کی زندگی کا شیوہ قرار پاتا تھا۔ چلنے پھرنے کی قوت و آزادی سے بھی محروم کر دی جاتی تھی۔ تمام عمر کا شدید غلامی اور سخت قسم کی قید و بلا میں اسے گزارنی ہوتی تھی۔ ہاں مرنے سے پہلے چند سالوں کے لئے اسے کسی قدر آزادی اس معنی میں مل جاتی تھی کہ وہ ایک ساس ہو کر اپنی بہو پر گھر میں حکم چلا سکتی تھی اور بس !!

ان پابندیوں اور رسوم و قیود کی سرگشتیوں کے باوجود ہمیں تاریخ میں بعض نمایاں و درخشندہ چینی خواتین کے نام ملتے ہیں جنھوں نے قدامت کی حصار بندی توڑ کر اپنی نسوانی حیات کے باوجود شعر و حکمت۔ ادب و انشا، نقاشی و مصوری، سیاسی رتبے میں نمایاں درجے حاصل کئے۔ فنونِ سپاہ گری میں یکتا باغیوں کے سر کچلنے۔ فوجوں کے پرے کے پرے زیر و زبر کر دینے والی بہادر خاتون کے نام بھی اسی سرزمین چین کی تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

اخلاق و عصمت کے حصار کو توڑنا ناممکن تھا اور بغاوت کرنا تو خیال

میں بھی ناممکن تھا۔ اخلاق وعفت کے قوانین نہایت سخت تھے۔ ان ضوابط کی ہلکی سے ہلکی تبدیلی اور شکست کی سزا موت کے مترادف تھی۔ اہلِ چین نے انسانی جان لینے کے لئے جو تیامت آفریں عذاب اور لرزہ خیز اذیت دینے والی ترکیبیں ایجاد کر رکھی تھیں ان کا ذکر یہاں کرنا ضروری نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ اہلِ چین اذیت دہی اور عذاب دہی کے معاملہ میں ایسا وحشیانہ بلیغ تصوّر لے کر آئے ہیں کہ شاید دنیا کی کوئی قوم ان کو شرمندہ نہیں کر سکتی۔

خواہ عورت حرم شاہی کے زرّیں قفس میں بنا ہوئی معمولی حالت میں کمرے بچے پالنے سے سڑک یا کھیت پر کام کر رہی ہو سب کے لئے نسوانی قیود کی پابندیاں قدامت سے بھی قدیم رسوم کی شدید صورتوں پر عامل ہونا مقدر و مختص ہو گیا تھا۔

۳ ہزار سال قبل مسیح میں شہنشاہ فون حی نے شادی کے جو ضوابط بنا رکھے تھے وہی تمام زمانۂ قدیم و جدید میں چین کے لئے قابلِ عمل رہے۔

یہاں بہ سبیل راہ اس کا تذکرہ کرنا مناسب ہو گا کہ شادی کے جو اصول اس وقت منضبط کئے گئے تھے ان کا معیار بعض حالتوں میں جدید تہذیب اور مغربی تہذیب والوں کے لئے بالخصوص قابلِ رشک ہے۔ مثلاً یہ کہ شادی سے پہلے دونوں کو یعنی میاں اور بیوی کو ایک ایک بیان ایک دوسرے کو دینا ہو گا کہ اس کی صحت کیسی ہے۔ تندرستی کی معمولی سے معمولی خرابی اور جسمانی نقائص کا شادی سے پہلے ایک دوسرے پر کامل طور پر اظہار لازمی شرائط میں سے تھا۔ آج کل اندھا دھند شادیوں کے باعث جو سانحات ہماری زندگیوں میں رونما ہوتے ہیں یہ قابلِ قدر قانون انھیں کسی حالت میں پیدا نہ ہونے دیتا۔

عفتِ نسوانی کا تصوّر اہلِ چین میں بے حد بلند تھا۔ عصمت کے حصار کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ایک عورت کو اپنے خاوند یا والدین کے سامنے بھی اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ غیر مرد کے ہاتھ سے کوئی چیز لے لے اگر کسی غیر مرد سے کوئی چیز کسی عورت کو لینی ہوتی تھی تو اس کے لئے ایک قاعدہ تھا۔ یہ چیز میز پر رکھ دی جاتی تھی اور عورت اپنے لمبے کرتے کی ڈھیلی آستینوں سے اس چیز کو ڈھانکتے ہوئے اٹھا لیتی تھی۔

رومہ کے زوال کے آخری ایام میں ایک خوب صورت اور زہریلی ناگن مسالینہ ہماری نظر کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اسے سرزمینِ رومہ کی "مل بہا" شہزادی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ——— کون یقین کرے گا کہ چین جیسے ملک میں بھی ایک مسالینہ ہو گزری ہے ———

ایک عیش پرست شہوت رانی کی ملکہ عفت و عصمت کے خراج سے مملکت کو تاخت و تاراج کرنے والی ایک افعی صفت حسینہ ——— ایک سمِ قاتل ——— ایک بے حد و شہوت ناک "دوزخی حور" جس کے حسن کی دمک اور عیش پرستانہ کارفرمائیوں سے چین کی تاریخ کا ایک باب سیاسی انقلاب اور حسن و جمال کی برق پاشیوں سے رزم بزم کا ایک نہایت پُر تکلف نظارہ پیش کرتا ہے۔

باب ۲

قصّہ کا شروع

ہمارے قصّہ کی ابتدا ۱۱۴۷ء میں ہوتی ہے۔

۱۱۴۷ء میں چین کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا اس کا تصوّر کیجئے۔ الگ تھلگ ایک سنسان مگر بے حد آباد و عظیم الشان آبادی۔ آج کل جو تہذیب چین میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت اس سے کچھ زیادہ ممیّز حالت نہ تھی۔ لباس میں۔ زرہ بکتر و آلاتِ حرب میں تعمیرات میں۔ غرض جس چیز میں دیکھیں وہی حالت قائم ہے۔ جو صدیوں پہلے تھی۔ عجائب خانوں میں ہم چین کی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر چین کا جو تصوّر اپنے دماغ میں پیدا کر سکتے ہیں بس سمجھ لیجئے کہ ۱۱۴۷ء میں بھی چین ایسا ہی تھا۔

کچھ عرصہ سے ایک قزاق میوروچی نام کا مملکت میں لوٹ مار کر رہا تھا اور اس نے اپنی خونناک ترک تازیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ اسے بجھانے کی سب کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ اسے اگر چین کا "ابن ہڈّیا" فرضی قصّوں کے بہرام کا اوتار سمجھ لیا جائے تو شاید معاملہ پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سریع الفہم ہو جائے گا۔

بس ایک ایسا ہی قزاق جیسا "بہرام" تھا۔

شہنشاہ وقت، شیوسین کو ایک رات محلِ خاص میں یہ اطلاع ملی کہ ایک نوجوان حسینہ باریابی کی کوشش کر رہی ہے۔ اور قاعدے کے مطابق اسے روکا جا رہا ہے۔ وہ بادشاہ سے کوئی نہایت پُر اسرار بات کہنا چاہتی ہے۔ کوئی خفیہ پیغام ——— ! اس سے سوالات کئے گئے کہ وہ بادشاہ کے پاس کیوں جانا چاہتی ہے۔ کیا کام ہے۔ دوسرے لوگوں کو وہ کام کیوں نہیں بتاتی وغیرہ۔ مگر اس نے سب سوالوں کا جواب یہی دیا کہ "میں صرف شہنشاہ کے حضور میں جا کر ہی کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے روکو نہیں" اس لڑکی نے اپنا نام طاؔ کی بتایا۔

اس عورت کو آخر کار حاکم عدل کے سامنے پیش کیا گیا جسے "منترین" کہتے تھے۔ منترین نے اس عورت سے بہت سے سوالات کئے اور یہ بتایا کہ شہنشاہ چین سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی معمولی آدمی اس کے دربار میں بھیجا جائے۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس شخص کی اصلیت اور معاملہ کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا جانا شہنشاہ کے لئے غیر ضروری تھا اور اس نے جا کر کوئی معقول بات نہیں کی تو اس کے لئے عذاب الیم تیار رکھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے اسے تمام عذابوں اور اذیت ناک سزاؤں کا نقشہ آنکھ سے دکھا دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے ارادہ سے باز آجائے ورنہ ان سزاؤں کے لئے تیار رہے۔ دو روز تک طاکی سے سوال جواب ہوتے رہے۔ مگر اس نے بلند ہمتی اور پختہ عزم کے ساتھ حاکم کے تمام شبہات دور کر دیئے مگر قانون کے مطابق اسے عذابوں سے آگاہی دینے کے لئے تیسرے روز ایک مکان میں لے جایا گیا۔ لڑکی نے دیکھا کہ صحن میں دو مرد نیم برہنہ پیٹ کے بل گرم ریت پر لیٹے ہوئے ہیں اور دو جلاد ان کے سرینوں پر گینڈے کی کھال کے تازیانے لگا رہے ہیں۔ ان کی آہ و بکا سے زمین و آسمان لرزتے تھے۔ مگر ظالم جلادوں کو ان کی تکلیف تازیانہ بازی کے لئے اور مہمیز کا کام دیتی تھی۔

لڑکی کے چہرے پر اس عذاب سے مطلق خوف پیدا نہ ہوا۔ جسے دیکھ کر مجسٹریٹ کسی قدر متعجب ہوا۔ مگر اس نے سوچا کہ کوئی عذاب اس سے بھی کھٹ کھایا جائے۔ تاکہ لڑکی اپنے ارادے سے باز آجائے۔ اسے ایک اور مکان میں لیجایا گیا جو قید خانے کے قریب تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی نظر دو ڈولیوں پر پڑی جن پر دو آدمی پڑے ہوئے تھے اور ملازم ان ڈولیوں کو لے جا رہے تھے۔ ان پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک کا پیر کھلا رہ گیا تھا۔ لڑکی نے دیکھا کہ پیر میں سے خون کی تلکیاں بہہ رہی ہیں۔ آخر کار اسے اس کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں سے اس نے یہ آدمی ڈولیوں میں لیٹے نکلتے دیکھے تھے۔ یہ کمرہ دوزخ کا نمونہ تھا۔ بانس ہر قد و قامت اور وضع قطع کے جا بجا رکھے تھے جو اذیت دینے کے کام آتے تھے۔ قیدیوں اور عذاب پانے والوں کے لئے مختلف قسم کے قفل۔ زنجیریں اور بندشیں۔ سیلے کے موٹے اور ٹڑے ہوئے پائپ تھے۔ جنھیں قیدی کے جسم سے لپیٹ کر دبایا جاتا تھا۔

منترین نے بتایا کہ ایسے لوگوں کے لئے جو کسی وجہ سے مورد عذاب قرار دیئے جائیں یہ سزائیں دی جاتی ہیں منترین نے نہایت جوش اور دبدبہ کے ساتھ ان اذیتوں اور آلات کا ذکر کیا جن سے وہ سزا دے گا۔ اگر اس کو دربار شاہی سے عذاب کی سزا مقرر ہوئی۔ مگر لڑکی اب بھی خاموش اور مطمئن کھڑی تھی۔ اس پر کسی آنے والے خوف کا اثر نہ تھا۔

آخر میں اسے ایک بڑے ایوان میں لایا گیا جہاں ایک میز کے گرد بہت سے حاکم بیٹھے تھے۔ اور سامنے ایک کرسی بچھی تھی۔ طاکی کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ سامنے نسوار کی ڈبیہ رکھ دی گئی جو فرش میں داخل تھا۔ سامنے ایک سٹول پر ایک مرد جسے زرد فام ہرقلیس کہنا بجا ہوگا بیٹھا تھا۔ اس کے جسم کی تنومندی اور توانائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ خادم۔ تولیہ۔ اسفنج اور پانی لے کر آگئے کہ اگر عورت کو عذاب کا نظارہ دیکھنے سے غشی آجائے تو پانی کے چھینٹے دے کر اوسان قائم رکھے جائیں مگر عورت نہایت سکون و اطمینان اور تمام تیاریوں سے بے غرض بنی اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔

توانا و تنومند انسان ایک بدنصیب مجرم تھا کسی شاہی جرم کا اس پر عتاب نازل ہونے والا تھا۔ ایک جلاد بانسوں کی تیلیوں سے بنی ہوئی ڈور جالیاں لایا۔ دونوں جالیوں کو دونوں ہاتھوں میں پر دیا گیا۔ اس طرح کہ انگلیاں بانسوں کی تیلیوں کے درمیان گویا شکنجہ میں آگئیں۔ ان بانسوں کے شکنجوں میں ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ جلاد نے حکم پاتے ہی ڈوریں کھینچیں جس کی وجہ سے بانسوں کی تیلیاں بھنچنی شروع ہوئیں اور پہلوان صفت مجرم نے آہ و زاری شروع کی بہت کم لوگ ہیں جو صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بانسوں کی یہ چند تیلیاں کس درجہ ہولناک عذاب انسان کے لئے پیدا کر سکتی تھیں۔ دیو پیکر انسان کرب و تکلیف کے باعث پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اس کے ننگے پنڈے پر ذرا سی دیر میں پسینہ پھوٹ پڑا۔ اسکی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ چیخنے چیخنے اس کی آواز بھی ختم ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چکی میں پیسا جا رہا ہے۔ ظالم حاکم کے حکم سے شکنجہ اور کس دیا گیا۔ مجرم کا جبڑا اس طرح کٹکٹا رہا تھا۔ جیسے سردی میں دانت بجتے ہیں۔ اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ اس جہنمی اذیت سے لرز رہا تھا۔

یکایک طاکی نے بے چین ہو کر مجسٹریٹ سے کہا ——

بس اسے رہنے دیجئے۔ میں آپ کو ابھی بتاتی ہوں کہ کون ہوں اور کیوں ——!"

بہت سنجیدگی اور آہستگی سے لڑکی نے منترین کو بتایا کہ اس کو جو چیز یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ اس کا اس شخص کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ براہ راست شہنشاہ سے تعلق ہے اور وہ یہ روح کو لرزانے والا عذاب اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی۔ اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے ——

"مہربانی کر کے اس آدمی ——"

منترین نے کچھ سوچ کر اپنا سر تسلیم کے لئے جھکایا۔ اور بانسوں کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کا حکم دیا۔ شکنجہ علیحدہ ہو گیا۔ مگر ابھی تک کرب و اذیت کی وجہ سے وہ دیو پیکر زرد فام غلام کانپ رہا تھا جس سے سزا کی جہنمی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

"میں یوروشی کی لڑکی ہوں جس نے مدر مجایا ہے۔ اور میں سیدھی شہنشاہ کے پاس جانا چاہتی ہوں"

مشتری بن نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ مہمان کس قدر اہمیت کا مالک ہے اور اسے روکنا کتنا مضر ہے۔ معمولی مگر بے حد پیچیدہ رسوم و تکلفات کے بعد عورت کو شہنشاہ کے حضور میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اسے محل میں لے جایا گیا۔ تخت شاہی جس کمرے میں بچھا تھا اسکی دیواریں زر و جواہر سے مرصع اور نقش و نگار سے آراستہ۔ حریر و دیبا کے نگین دھوپ پر دن سے ستون تھیں۔ اس کا چوکور دروازہ ریشب سے بنا ہوا تھا۔ عورت ڈری سہمی۔ اور آداب شاہی سے مرعوب۔ زر و جواہر کی چمک سے ششدر اندر داخل ہوئی۔ پیچھے سے کسی چوب دار نے اس کے شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور وہ مقررہ آداب بجالانے کے لئے جھک گئی۔ جب اس نے اٹھ کر نظر ڈالی تو دیکھا کہ زر و جواہر سے لدی ہوئی شکلیں حکام و انسران و امرائے سلطنت کی چاروں طرف بیٹھی ہیں۔ اور بیچ میں شہنشاہ زرق برق پوشاک اور درخشندہ جواہرات سے لدا ہوا نگے سر بیٹھا ہے۔

بادشاہ چین تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ یہ تخت زمین سے چار فٹ اونچا تھا۔ لڑکی پر شہنشاہ چین نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جمادیں اور اسے قریب آنے کے لئے کہا۔ لڑکی قریب پہنچ گئی اور جھک کر چار مرتبہ آداب بجالائی۔ یہ آداب صرف رقاصہ کنیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لڑکی نہایت وجاہت اور طراری کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ نسوانی جھجک یا رعب شاہانہ کا اس پر کچھ اثر نہ تھا۔

اس نے بتایا کہ میرا نام طا۔کی ہے۔ اور وہ باغی سپاہی یوروشی کی بیٹی ہے۔ اور وہ زمین و آسمان کے مالک شہنشاہ چین سے اپنے باپ کی بدکرداریوں کی معافی مانگنے آئی ہے۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میرا باپ ان ان شرائط پر حکومت وقت کی اطاعت کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور وہ یہ اطاعت گزاریاں پوری طرح ادا کرے گا۔

شہنشاہ چین بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ زندگی کے آثار صرف اس بات سے ظاہر ہوتے تھے کہ اس کے نتھنے کبھی کبھی ہل جاتے تھے۔ آج تک کسی عورت نے اس پر اتنا اثر نہیں کیا تھا جس قدر اس عورت نے آج کیا۔ یہ لڑکی نسوانی حسن و جمال کا شاہکار تھی۔ صرف چینی شکل تھی ورنہ جسم اور رعنائی جمال کے باب میں وہ یونانی دیوی زہرہ کے مثل تھی۔ عادت کے خلاف اپنے ہم نشینوں سے مشورہ کئے بغیر شہنشاہ چین نے حکم دیا کہ لڑکی کو دربار سے واپس کیا جائے اور آرام سے رکھا جائے۔ اور طلب کرنے پر دوبارہ پیش کیا جائے۔

دوسری بار باریابی ہوئی۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور رفتہ رفتہ طا۔کی نے بادشاہ پر قابو پالیا۔ اب اس نے سرکاری معاملات اور رموز مملکت میں بھی دخیل ہونے کی کوشش کی۔ شہنشاہ اس کے حسن کی دمک سے اندھا ہو چکا تھا اور سوائے طا۔کی کے کسی عورت کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ عورت کیا کرنے والی ہے۔ اگرچہ شہنشاہ چین ایک مطلق العنان بادشاہ ہوتا تھا۔ مگر اپنے ارکان سلطنت سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا لیکن اب طا۔کی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔ بادشاہ اس کے آگے لب کشائی کی ہمت نہ کرتا تھا۔ سلطنت کے امرا خوف سے کچھ نہ کہتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اس بخیل عورت کو شہنشاہ کے قرب سے ہٹانے کی فکر میں تھے۔

طا۔کی نے اثر جمانے کے بعد شاہی خزانے پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ بڑے بڑے عہدے، القاب و خطابات۔ اعزازات نیلام ہونے لگے اور اس نے خوب رقم جمع کر لی۔ شہنشاہ چین شوسین اس کے حسن کا دیوانہ ہو رہا تھا اور احتجاج کے باوجود کچھ نہ کرتا تھا جب طا کی سامنے آتی اس کے حسن کی جھلک اس کے جسم کی لچک اور عیش افروز حرکات سے اس کا دل سلطنت کی حدود سے نکل کر گناہ کے بھیانک جنگل میں غائب ہو جاتا۔ قدیم زمانہ کے وہ آہنی اصول و قوانین جنہیں حکیم چین کنفیوشس نے منضبط کیا تھا طا۔کی نے توڑ دئے۔ حالانکہ وہ احکام الٰہی کی برابر سمجھے اور مانے جاتے تھے۔

طا۔کی اس آزادی پر اکتفا کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے محل شاہی کو مارکیٹ میں تبدیل کر دیا۔ جہاں معمولی سے معمولی خدمت کے عوض روپیہ طلب کیا جاتا تھا۔ عیش و معصیت کے اڈے قائم ہو گئے تھے۔ اپنے عیش کو وسیع کرنے اور ساری سلطنت کو اپنے وسیع گناہ کے صحرا میں گم کر دینے کے لئے اس نے ایک محل بنوایا جس کا نام "لوطائی" یعنی "مینارِ غزالاں" رکھا۔ یہ اس کے اپنے جمع کئے ہوئے روپے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس کی سج دھج اور کروفر وہ شاہی محل سے بڑھا دینا چاہتی تھی تاکہ بادشاہ صرف یہاں رہا کرے اور قدیم محل میں رہنا بھی چھوڑ دے۔

"مینارِ غزالاں" میں ایشیا کی چیدہ۔ خوب صورت عورتیں منگوا کر رکھی گئیں۔ اس کے دروازے خوب صورت ریشب سے بنوائے گئے۔ اس کے کمروں میں تنگی اور حیا سوز تصویریں گندہ کرائی گئیں۔ اس محل عیش کے دروازے صرف نیک اور بے عیب آدمی کے لئے بند تھے۔ ورنہ ہر گنہگار مرد عورت کے لئے اس محل میں کامل مہمان نوازی اور عیش کوشی کا سامان مہیا رہتا تھا۔ ایسے موقعے پر خواجہ سراؤں، آبرو باختہ عورتوں، اور عصمت فروش حسینان چین نے اڈے جمائے۔

دنیا کے تمام اقسامِ عیش جو انسان کو معلوم تھے یہاں پورے شباب کے ساتھ برسرِ عمل دکھائی دیتے تھے اور بادشاہ کے لئے روز نئی ٹھینیں مہیا کرنے کا اہتمام انسوں گر حسینہ طا۔کی نے خود اپنے ذمّہ لیا تھا!

جاوا، تبّت، سنگولیا وغیرہ سے رقاصائیں بُلوائی جاتی تھیں۔ ان کے عریاں ناچ ہوتے تھے۔ اور شہنشاہ کی بدمستیاں الامان۔ اہلِ چین نے شاید اس سے پہلے خواب میں بھی وہ جنسی بداطواریاں نہ دیکھی ہوں گی۔ جو ہر پلی حسینہ طا۔کی نے ایجاد کرکے "مینارِ غزالاں" میں رائج کی تھیں اور جن سے شہنشاہ اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔

باب ۳

عیش میں خلل!

کین کیو نامی ایک سردارِ مملکت نے بادشاہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں اور اس سلسلہ میں اس نے ایک لڑکی حضور میں گزرانی جس کی صورت شکل حوروں جیسی اور جس کی عفت و عصمت بالکل محفوظ تھی۔ جوں ہی یہ لڑکی "مینارِ غزالاں" میں لائی گئی۔ بادشاہ چین کے دل پر اثر ہوا۔ اور اس نے اسے اپنے سامنے رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ طا۔کی۔ اس نئے مہمان کے آنے سے ہرگز خائف نہ تھی اور نہ اسے یہ خدشہ تھا کہ وہ رقیبہ بن جائے گی۔ وہ اس نئے شکار کو بادشاہ کے لئے ایک حربہ ہی سمجھتی تھی۔

کین کیو کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بادشاہ سنورنے کے بجائے ایک معصوم دوشیزہ کو بھی گناہگاری کی قربان گاہ پر اپنے ہاتھوں سے بھینٹ چڑھا دے گا سردار کین کیو نے تو یہ مصلحت سوچی تھی مگر کارگر نہ ہوئی۔ لڑکی نے جب اپنی آنکھوں سے "مینارِ غزالاں" کی معصیت نواز زندگی دیکھی۔ شرمناک اور حیا سوز اطوار و اشغال اسے دکھائے گئے تو وہ لرز اٹھی۔ اس نے احتجاج کیا کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے ابھی اس مجلسِ گناہ سے نکالو۔ مگر دھمکیوں اور ترغیبوں اور دلاسوں سے کام لے کر طا۔کی نے اسے کچھ دنوں محل میں رکھا اور رفتہ رفتہ اسے بھی ان گناہوں میں برابر کا شریک کرلیا۔ ایک مرغِ معصوم گرفتار ہو کر جب طا۔کی جیسی شکاری عورت کے مجموعِ معصیت میں پھنس جائے تو اس کا دوبارہ باہر نکلنا ناممکن تھا۔

لڑکی ان شرمناک اور دل ہلا دینے والے گناہوں کی تاب نہ لاسکی اور اس نے دادِ عیش دینے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے نہایت سخت قسم کی اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ آدم خوری اس محل کے رہنے والے انسانی درندوں کے مخصوص اشغال میں داخل تھی۔ چنانچہ اس عورت کے جسمِ نزار کو بھی دانتوں سے چبایا گیا اور مردہ جسم کو طرح طرح کی لرزہ پیدا کرنے والی حرکات سے آلودہ کیا گیا۔ اس کی لاش اس کے باپ کے پاس بطور بطاہرۂ انتقام بھیج دی گئی لڑکی کے باپ پر غم و غصّہ کی بجلیاں گریں اور وہ ایک شیر کی طرح بپھر کر میدان میں نکل پڑا۔ اس نے تمام چین کو اپنے شور سے متوجہ کرلیا اور بغاوت کی آگ پھیلانی شروع کر دی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ آخر اس جہنمی زندگی کو اہلِ چین کب تک برداشت کریں گے ——— اس شخص کو شاہ والاشان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

مگر قتل رنگ لایا۔ تمام صوبوں میں بغاوت کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی اور شعلے بھڑکنے کے لئے مچل رہے تھے۔ صرف جبر و خوف کی وجہ سے عام غدر ہونے نہ پاتا تھا۔ ورنہ لوگ طا۔کی سے انتقام لینے اور شہنشاہ کو اس کی بدکرداریوں کا مزا چکھانے کے لئے بالکل بھرے بیٹھے تھے۔ غریب و نادار، گم نام و بے حقیقت لوگوں کو بھی سر اٹھانے کا حوصلہ ہوا۔ پرے کے پرے باغیوں کے آتے اور "مینارِ غزالاں" کے گرد منڈلاتے اور اسے اکھیڑ پھینکنے کی ترکیبیں کرتے مگر "مینارِ غزالاں" کے عیش کرنے والے اپنے مضبوط و مستحکم قلعہ میں باہر کی دنیا سے بے خبر باجوں کی آوازوں، موسیقی کی تانوں اور حسینوں کی برق پاشیوں میں مسحور و محو تھے۔ انھیں مطلق خیال نہ تھا کہ رنج و الم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تکلیف و پریشانی بھی کسی چیز کا نام ہے انھیں یہ پختہ یقین تھا کہ موت کبھی نہیں آئے گی۔ اور ہمارا بدیہ رقصِ عیش میں محو رہیں گے "مینارِ غزالاں" کے لوگوں کو انسان کے جامِ انصاف اور خدا کے پیمانۂ صبر کو لبریز ہو جانے کا مطلق اندیشہ نہ تھا۔

اہلِ چین بڑی مشکل سے ان توہین آمیز حرکاتِ عیش اور تباہ کن اطوارِ شاہی کو پانچ سال سے برداشت کر رہے تھے۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا تھا۔ ضرورت تھی ایک ایسے رہنما کی جو سلگتی ہوئی چنگاریوں کو شعلوں میں تبدیل کرکے اس گناہ کے ہنگامہ کو خاکستر کر دے۔

وُو وانگ نامی ایک خاندانی شہزادے نے آخر کار علمِ جہاد بلند کیا چین کی چار ملین آبادی میں سے ایک فوج سرفروشوں کی بن جانی کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے رضا کار اس فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آنے لگے اور آخر کار اس نے عیش محل پر دھاوا بول دیا۔

یہی وہ غریب تھے جن کے بھائی بند منگولوں نے چنگیز خاں کے زیر کمان چین کے اس سرے سے لے کر یورپ کی اس سرحد بحر اسود تک اپنی تاخت کی حدود وسیع کر دی تھیں جن کے زرخیز ایک دنیا کا نیتی تھی۔

جب حملہ کی خبر شہسین کو ہوئی تو اس کو پہلے تو یقین نہ آیا مگر پھر ہاتھ اٹھنکا اس نے اپنے محل کی حفاظت کے لئے احکام جاری کئے۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے احکام سن کر لرزنے والے لوگ اب نہایت سرد مہری سے کام لے رہے ہیں اور اس کا حکم چلنا بند ہو جائے گا۔ تو اس نے سمجھ لیا کہ وقت اب آگیا ہے کہ چپ چاپ جان بچا کر آدمی نکل جائے اور زیادہ شور نہ کرے۔ اسے یہ خیال آیا کہ "مینارِ غزالاں" میں چلو۔ وہ ایک ایسی جائے پناہ ہے جہاں اب تک اس کے احکام چلتے ہیں۔

باب ۴

انہدام

وہ ایک خفیہ سرنگ کے ذریعہ جو اس کے محل سے "مینارِ غزالاں" تک جاتی تھی چپ چاپ پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ نقشہ ہی پلٹا ہوا ہے ہزاروں رفیق ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں کچھ نوکر چاکر باقی رہ گئے ہیں جو مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔ رہ گئیں کنیزیں۔ خواجہ سرا۔ خوب صورت لڑکے اور عینین وہ بھلا کیا اس کی حفاظت کا کام کر سکتے تھے۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور غصہ میں بھر کر چیزیں توڑنے پھوڑنے لگا قیمتی آلاتِ مے کشی بیش بہا ظروف و آرائش کے سامان ایک ایک کر کے ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ یکایک اس کو کچھ خیال آیا۔ اس نے حکم دیا کہ سب فرنیچر اور کاغذ کی چیزیں صحن میں جمع کر دی جائیں۔ تمام قیمتی اور نایاب لکڑی کا سامان۔ کاغذی چیزیں۔ ڈھیر کی صورت میں رکھ دی گئیں۔ اس نے ایک نہایت بیش قیمت لبادہ پہنا اور زیورات کے صندوقچے منگا کر مٹھیاں بھر بھر کر حالتِ طیش و دریوانگی میں اپنے سر پر نچھاور کیں۔ کپڑوں پر نثار کیں اور کاغذ و سامان چوب کی اس قیمتی چتا پر بیٹھ گیا۔

چلا کر ——— اس کی آواز ہی اب کہاں باقی رہی تھی۔

——— بولا "شہنشاہِ چین غداروں کے ہاتھ پڑ کر مرنا نہیں چاہتا اس لئے اپنی جان کو بے عزتی سے کھونے کی بجائے خود خاکستر ہو جائے گا۔

تمام نوکر اور کنیزیں چاروں طرف آ کھڑی ہوئیں کسی کی مجال نہ ہوئی جو اسے روک سکتا۔ اس نے کہا چتا میں آگ لگا دو۔ ابھی لوگ تذبذب ہی کر رہے تھے کہ کسی طرف سے ایک جلتی ہوئی مشعل آ گری۔ سامنے سے ایک دریچہ بند ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا۔ طا۔ کی مشعل پھینک کر جلدی سے بھاگ گئی۔

مشعل کا کاغذ اور چوبی سامان میں لگنا تھا کہ بھک سے ہوا اور آناً فاناً شہنشاہِ چین بھسم ہو کر ایک تودۂ خاکستر بن گیا اور اپنے گناہوں کی آلودہ سرزمین پر ہی آخر اس نے آخری سانس بھی پورے کئے۔ محلِ عیش ایک زور جھانجھ کی آواز اور ایک پُر اسرار چیخ گھنٹہ کی سنہ بات کے شور سے گونج رہا تھا۔ مرنے مرنے شہسین نے نوکروں اور ساتھیوں کو پکارا کہ تم بھی اس آتشکدۂ معصیت میں کود کر میرے ساتھ چلو۔ زندگی کی رفاقت کو تا ابد قائم رکھو۔ مگر بے وفا دنیا اس قدر سمجھ دار نہیں ہے کہ آخر تک کام میں شریک رہے۔

باب ۵

طا۔ کی کا حشر

طا۔ کی۔ کہاں تھی؟

ہر شخص کی زبان پر یہی لفظ تھا۔ طا۔ کی کہاں ہے۔ کہاں ہے وہ جنہیشہ ملعونہ مجسمۂ گناہ و معصیت۔ وہ آلودگی و شرارت کی بجس دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ اس سے لوگ انتقام لینا چاہتے تھے۔

شاہی محل کی حفاظتی فوج نے ذرا ہی دیر میں ہتھیار ڈال دیئے۔ اس سے پہلے کہ محل پر انقلابی فوج کا حملہ ہوتا لوگوں نے فتح کے جھنڈے بلند کر دیئے اور شہروں میں اژدہے کی مورتیں جلوس میں نکالی گئیں جو فتح مندی و کامرانی کا نشان سمجھی جاتی تھیں۔ چاروں طرف خوشی کا غوغا تھا۔ ہر شخص نجات و آلودگی حیات کے تماشہ کا حسرت ناک انجام دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

چاروں طرف دستے اور فوجیں دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ طا۔ کی نہ ملنی تھی نہ ملی۔

یکایک فاتح نوجوان و دوانگ کی رہائش گاہ کے سامنے ایک مرصع و مذہب پالکی آ کر رکی۔ اندر سے طا۔ کی زرق برق پوشاک اور جواہرات و آرائش جمال کے جملہ اسلحہ سے لیس باہر نکلی۔ اس نے حرم میں جا کر نوجوان فاتح کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ اپنی جیتی مسکراہٹ میں پُر شباب فاتح کے تمام ارمانوں کو جذب

کر کے فنا کر دینا چاہتی تھی۔

طا۔ کی نے بتایا کہ اس نے شہنشاہ کو غلط روی سے بچانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر اس کی تمام طاقتیں شہوت رانی مطلق العنان کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔

طا۔ کی نے تمام نسائی خوبیاں نوجوان جرنیل کو اپنانے کے لئے ختم کر دیں۔ اس کا حرمہ برحسن کئی بار اس قدر تیز ہوا کہ شاید نوجوان جرنیل اپنے آپکو اس کے آغوش میں گرا ہوا پاتا۔ مگر جمالِ حسن اور الفاظ کے جادو نے اسے زیادہ دیر تک آزمائش میں نہ ڈالا۔ وہ سوچتا تھا کہ رعنائی اور پاکیزگیٔ حسن کا ایسا نادر مجسمہ کیونکر گناہ اور سیاہ کاری کا ایسا ہولناک امین بنا رہا۔ چین کی تاریخ میں سب سے زیادہ سیاہ ورق جس کے حال سے لبریز ہے۔ وہ یہی جگمگاتی ہوئی ملکۂ عیش تھی وُوو آنگ دیکھتا اور حیرت کرتا تھا۔ آخر کار اندرونی کشمکش حسن پر غالب آئی اور اس نے جھنجلا کر حکم دیا ——————!

باب ۶

انجام کا پردہ گرتا ہے!

اس نے حکم دیا کہ طا۔ کی کو لے جاؤ اور زنداں میں بند کر دو۔

اگلے روز عدالت میں عورت کو پیش کیا گیا۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت سی باتیں پیش کیں مثلاً اس نے کہا کہ میں بالکل بے گناہ و معصوم ہستی ہوں اس وقت چین کی عفت مآب خواتین میں بہت سی رسوم حفاظتِ عصمت کے لئے جو جاری کی ہیں وہ سب میری ایجاد ہیں۔ بالخصوص عورتوں کے پاؤں تنگ سخت جوتے میں مقید رکھنے کی رسم چین میں میں نے ہی چلائی ہے جسے "کنول قدم" کے مبارک نام سے یاد کیا جاتا ہے!!

عدالت خود وُوو آنگ کی تھی اس نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ عورت اس پر ساحرانہ جمال کا پرتو ڈال رہی ہے۔ انداز اور شباب کی بجلیاں گویا کہ اسے اپنے آغوش میں قیدی بنا کر جذب کر لینا چاہتی ہے اور اس کا حرمہ دمبدم کارگر ہو رہا ہے۔

اس کو چھوڑ دینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ تمام چین متفقہ آواز بلند کر رہا تھا کہ اس بدکردار اور ناپاک ہستی کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانا ضروری ہے۔

وُوو آنگ نے جلاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"اپنا کام کرو"

طا۔ کی مسکرا کر نوجوان جرنیل کی طرف حریصانہ طور سے دیکھنے لگی ——————

وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی اور کس قدر زہر تھا اس کی مسکراہٹ میں جب وُوو آنگ ٹکٹکی کے پاس سے گزرا جلاد نے اس کے خوب صورت سیاہ بال۔ رسم کے موافق اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے اس کو ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا تھا۔ سر قلم کرنے کے لئے جلاد اپنا آفتاب جیسا چمکیلا سیفہ ایک ناپاک وجس سر کو اس کے تن سے جدا کرنے کے لئے تول رہا تھا!

ظفر قریشی بی۔ اے

معارف

حسنِ صبح بہار ہے تیرا
لالۂ زرنگار ہے تیرا

خواب ہو یا کہ نقشِ بے معنی
زندگی شاہکار ہے تیرا

جس کو اپنی خبر نہیں کوئی
کیا وہی رازدار ہے تیرا

حمید عرفانی ایم۔ اے

رباعیات

(۱)

پیتا نہ شراب آج اڑائی کیسی
ساقی تری آنکھوں سے چرائی کیسی!
وہ لپکا پڑا ہے کہ الٰہی توبہ!
کمبخت کسی نے منہ لگائی کیسی!!

(۲)

دل صدقۂ جام زرفشاں کر ساقی
لے لے پچھا در مری جاں کر ساقی
سستی ہے یہ اک گھونٹ بھی جاں کے بدلے
کچھ اور بھی نرخ اس کا گراں کر ساقی!

(۳)

کام آئی تری مست نگاہی ساقی
کس طرح دیر حشر نباہی ساقی
"ہوں مست نگہ" خدا کو یوں ٹال دیا
ورنہ مری ہوتی رسوائی ساقی

(۴)

بے بادہ بہائے عمر فانی کیا ہے!
بے بادہ ایاغ زندگانی کیا ہے؟
بے بادہ ایاغ زندگانی کیا ہے!
مٹی کا پیالہ ہے وہ اک بے قیمت

سعید احمد اعجاز

بیاہ

ایک ہندی کہانی

"ذیل کا افسانہ ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون مسز شرمتی شرما نی بی۔ اے نے لکھا ہے۔ میں نے اسے رومن گری حروف کی بجائے اردو رسم الخط میں لکھ دیا ہے۔ کہیں کہیں لفظ بدلا ہے۔ کسی کا ترجمہ کیا ہے۔ اس محنت سے غرض صرف اتنی ہے کہ اردو پڑھنے والوں پر واضح ہو جائے کہ وہ ہندو جنھوں نے اردو فارسی نہیں پڑھی، مگر ان کا دل و دماغ "بنارسی پنڈت کی ہندی" کو ملکی زبان بنانے کی بجائے عام زبان بولنے اور لکھنے کا عادی ہو تو وہ ایسی زبان بولتا ہے جیسی کہ اس مضمون میں استعمال کی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ فارسی و عربی کے کتنے لفظ ہیں جو بے تکلف اس مضمون میں استعمال ہو گئے ہیں اور بعض سنسکرت کے ایسے لفظ آپ کو نظر آئیں گے کہ ہماری بول چال میں ان کا اور مفہوم ہے اور ہندی زبان کے ادیب اس کا اور مفہوم لے رہے ہیں۔ اور بعض ایسے الفاظ ہیں کہ ایک ہندو ادیب ان کو سوا دوسرا لفظ بول ہی نہیں سکتا۔ ان امور میں سے میں تصریح کسی کی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ناظرین خود غور فرمائیں اور میری رائے کی تائید یا تردید کریں۔ شہاب

(۱)

منشی شمبھو ناتھ کو مایا کے وِواہ کی بڑی چنتا تھی! مرنے سے پہلے کنیا دان کا پُن لے لینا چاہتے تھے۔ منشی جی کی تین پشتوں میں کوئی کنیا ہوئی ہی نہیں، دیوتاؤں کی بہت منوتیاں کرنے کے بعد پوتی ملی تھی۔ ان کے پُتر دینا ناتھ کو یہ کنیا رتن ملی تھی۔

دینا بابو نے باپ کا پرستاؤ سن کر کہا: "آپ کو بھی خوب سوجھی ابھی اس کا نواں سال ہے۔"

منشی جی بولے: "بیٹا میرا اب کون بھروسا۔ پکا ہوا آم ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو مجھے کنیا دان کا پُن بھی نہ ملے؟"

دینا ناتھ پتا کے بھگت تھے چپ ہو گئے۔ دو دھ مُونہی لڑکی کے وِواہ کی کلپنا ہی ہاسیاسپد تھی۔

منشی جی نے بیٹے کے من کا بھاؤ تاڑ کر کہا: "اسے میری بے وقوفی ہی سمجھو مگر میں آشاوادی ہوں اور ایشور پر بھروسا رکھتا ہوں کسی طرح کی شنکا مت کرو۔ میری مایا جہاں جائے سکھی رہے گی۔"

دینا بابو بولے "جیسی پھر آپ کی اِچھا۔"

مایا دوڑی آئی اور منشی جی کی پیٹھ پر بیٹھ کر ان کی دونوں آنکھیں بند کر دی ہوئی بولی:۔

"میں کون ہوں بوجھو۔"

منشی جی نے ہنس کر کہا۔ "تو میری رانی بیٹی مایا ہے۔"

آج کسی سہیلی نے مایا کے نام کی ہنسی اڑائی تھی۔ وہ بات مایا کے من میں کھٹک رہی تھی۔ دادا کی گود میں بیٹھ کر بولی۔

"دادا جی! میرا نام کس نے مایا رکھ دیا؟"

منشی جی ہنس کر بولے "بیٹیا یہ نام میں نے رکھا ہے۔ بہت دنوں تک مایا دیوی کی پوجا کی کہ وہ میرے گھر آ کر اسے پوتر کریں جب دیوی جی نے ورَ دان سوروپ تجھ کو دیا تو میں نے تیرا نام مایا رکھا۔"

مایا پرسن ہو کر بولی۔ "تو دادا جی میں بھی کیا دیوی ہوں؟"

منشی جی اسے گلے لگا کر بولے "ہاں تم دیوی ہو۔ ہم ہندو لوگ کنیا کو دیوی ہی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔"

(۲)

دینا بابو باہر سے آئے۔ ایک نوٹ پتا کے ہاتھ میں رکھ کر بولے "بڑا سونا

لڑکا ہے اور کتنا روپ وان!"

منشی جی فوٹو دیکھ کر بولے: "ہاں لڑکا اچھا ہے لیکن میری مایا کون کم ہے!"

مایا نے منشی جی کے ہاتھ سے فوٹو چھین لیا اور بولی: "دادا جی! یہ فوٹو میں لوں گی۔ میں اس سے اپنا بیاہ کروں گی۔"

دادا نے رفو کیا: "کیا کرے گی بیٹی بیاہ کر کے؟"

مایا نے اپنے ماما جی کی بیٹی للتیا کا بیاہ دیکھا تھا۔ خوب باجے بجے تھے۔ اچھے اچھے کپڑے کنبے آئے تھے اور بہت سی مٹھائیاں بنی تھیں۔ وہ دھوم دھام خوب اچھا لگتا تھا۔ پھر وہ کیوں نہ اپنا وواہ کرے؟

منشی جی ہنس کر بولے: "بیٹا۔ للتیا کو تو وہ سب اپنے گھر لے گئے کہیں تجھے بھی گھر لے گئے تو میں کیا کروں گا؟"

مایا کچھ جھینپ ہو کر بولی: "تو پھر رہنے دو میں نہیں لوں گی کچھ بھی۔" پھر کچھ سوچ کر بولی: "تو دادا جی سب چیزیں لے کر گھر میں رکھ لینا اور سبھوں کو مار کر بھگا دینا۔ دروازہ بند کر لینا۔ اچھا!"

منشی جی بولے: "بیٹا! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کیسے ان کو جیتوں گا؟"

مایا نے سارا پروگرام سوچ لیا تھا۔ دادا جی اور باوجی اور دادی جی اور اماں جی سب لوگ رات کو چلیں گے اور سارا سامان لے کر رات کو بھاگ آویں گے کسی کو خبر نہ ہو گی۔

منشی جی کی آنکھوں کے سامنے ودائی والا دشے آ گیا۔ بڑے پریم سے مایا کو چھاتی سے لگا کر اس کا کھچ چوما اور آنکھوں میں آنسو بھرے باہر چلے گئے۔

مایا سب کور کی فوٹو دکھائی تھی اور خوش تھی۔ اس سے اس کا بیاہ ہو گا اس کے ساتھ خوب کھیلے گی۔ اس کی ماں اور دادی اس کے بھولے پن پر روتی تھیں۔

(۳)

آج مایا کا بیاہ ہے۔ باجے بج رہے ہیں۔ دھوم دھام ہے۔ مایا بڑی خوش . . . . . !

باہر سے دینا ناتھ آ کر ماں سے بولے: "اماں ہم لوگ بارات لینے سٹیشن جاتے ہیں۔"

ماں نے کہا: "جاؤ۔ مگر دیکھو مایا نہ دیکھنے پائے۔ نہیں تو وہ بھی چلنے کو تیار ہو جائے گی۔"

تب تک مایا خود ہی آ گئی۔ اور تیار کہیں جانے کے لئے تیار دیکھ کر بولی "باوجی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

دینا باباؤ ہنس کر بولے: "بیٹی۔ تو کہاں جائے گی میرے ساتھ! میں گھومنے نہیں جاتا کام سے جاتا ہوں۔"

"میں تو چلوں گی۔"

"وہاں فوج آئی ہے تم کو پکڑ لے جائے گی میں تو ان کو بھگانے جاتا ہوں بیٹی!"

مایا: "نہیں باوجی! میں بھی مار کر بھگا دوں گی!"

باہر سے منشی جی آ کر مایا سے بولے: "چلو بیٹی! میں اور تم باغ کی سیر کر آئیں۔ ان کو جانے دو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

مایا سب سدھ بھول گئی اور دادا جی کے ساتھ باغ میں چل دی۔

(۴)

بارات خوب دھوم دھام سے آئی۔ بارا میں جنواسا دیا گیا۔ مایا چاچی کو وہاں نہیں جانے دیا۔ نہ جانے وہاں کیا تماشہ ہو رہا ہے اور نہ جانے اُسے کیوں نہیں جانے دیا جاتا لیکن جب بارات دوار پر آ گئی تو اس کو رہنا اَنِل اُبھیو تھا۔ جب منشی جی تھال میں آرتی سجا کر اور دوسرے تھال میں کپڑے اور کنیاں لیکر چلے تو مایا کیسے ٹھہر رہ سکتی تھی۔ پہلے تو کسی طرح اُسے استریوں نے قید کر رکھا تھا مگر جب استریاں خود بارات کی شوبھا دیکھنے کے لئے اپنے سن پرتا بو نہیں کر سکتیں تو مایا تو بچی ہی ہے۔

مایا کو دتی چھاندتی اپنے دادا جی کے پاس پہونچی۔ جب دیکھا کہ وہ بڑے بھاؤ سے پوجا کر رہے ہیں تو خود بھی بنا کچھ کہے سنے ور کے پاس ہی بغل میں کھڑی ہو کر بولی: "اب سے تم میرے گھر میں رہنا۔ اچھا! مجھ سے لڑنا نہیں۔ میں تجھے اپنے کھلونے دوں گی۔ میرے گھر میں بہت سی مٹھائی ہے تجھے کھلاؤں گی۔ اچھا!" جب ور نے اس کا بھی کوئی اُتر نہ دیا تو مایا جھنجھلا کر کہنے لگی: "کیوں سنہ بنا کر کھڑے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"

دینا باباؤ نے دیکھا کہ بھتیجا ہوا چاہتا ہے۔ جا کر اسے گود میں اٹھا کر بولے: "بیٹی تو بڑی پاگل ہے۔"

باراتیوں میں جو بوڑھے تھے۔ وہ تو ایسی کنیا دیکھ کر خوش تھے۔ ان کے بچپن میں اسی طرح کے بیاہ ہوتے تھے۔ ہاں یوں ہی ہنس رہے تھے۔ انھیں ایسی کنیا ایک عجوبہ تھی۔

دینا باباؤ نے جیوں ہی گھر میں جا کر مایا کو گود سے اتار دیا۔ وہ پھر دادا جی کے پاس پہنچ گئی۔ اور جب منشی جی سب سامان باراتیوں کو دینے لگے تو مایا ان کے ہاتھوں سے چھیننے لگی اور رو کر بولی: "یہ سب میرا ہے۔ میں نہ دوں گی۔"

ور کے پتا نے ہنس کر مایا کو گود میں لے کر کہا "تھا رہی ہے بیٹی!"
اور منشی جی سے کہا "آپ یہ سب سامان گھر ہی میں رکھ لیں"
تب کہیں مایا کو سنتوش ہوا۔ وہ تھال اور روپے لئے گھر میں آئی اور بارات جنوا سے گئی۔

(۵)

سب رسموں کے بعد بیاہ کا شگن آیا۔ گہنے اور کپڑے تو مایا نے بڑی خوشی سے لئے اور پہنے۔ نائن اسے سکھا پڑھا کر منڈپ میں لائی۔ پر مایا نے جب دیکھا کہ ور کو بیٹھنے کو اچھا خوب صورت پیڑھا ملا اور اسے بیٹھنے کو کیول ایک پتّل ملی تو وہ ور سے بولی "میرا پیڑھا دے دو۔ نہیں میں گرا دوں گی" بیچارا ور شرما گیا۔

منشی جی بولے "بیٹی مایا جھگڑا نہیں کرنا ہوتا"
مایا نے بگڑ کر کہا "میرے ہی لئے تو پیڑھا آیا تھا سو میں پتّل پر بیٹھوں اور یہ راجائن کے آئے ہیں جو پیڑھے پر بیٹھیں گے"
مایا کی باتوں پر سب کو ہنسی آگئی۔
ور کے پتا بولے "بیٹی جانے دو۔ میں کل تمھارے لئے بہت اچھا پیڑھا منگا دوں گا۔ سویرا ہونے دو"
بیاہ بھی ختم ہو گیا۔ جب بارات جنوا سے چلی گئی تو مایا بڑی خوش تھی کیونکہ گہنے اور کپڑے سب مل گئے تھے۔

(۶)

دوسرے دن ور کے پتا نے آگرہ کیا کہ بہو کو بدا کر دیجئے کیونکہ ان کی ماتا جی اپنے پوتے کی بہو کو بچینا چاہتی تھیں۔
منشی جی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "رات کے اَت پات کو دیکھ چکے ہیں۔ ابھی تو بہت بچّی ہے"
سمدھی جی بولے "بچّی جیسی آپ کی ویسی ہی میری۔ اماں کو بھی اسے دیکھنے کی بڑی سادھ ہے کہیں مر نہ جائیں۔ کر پا کر کے ایک دن کے لئے بدا کر دیجئے دوسرے دن بلا لیجئے گا۔ ان کی سادھ پوری ہو جائے گی۔
بدائی کا نہور چھا آگیا۔ باجے بجنے لگے۔ دوار پر پالکی دنگا دی گئی۔ مایا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اندر پالکی میں بیٹھ گئی۔ سب میلا دیکھنے چلیں گے۔ اپنے نئے کپڑے دکھلاتی تھی۔ اور خوش ہوتی تھی۔
ضیّتہ بولی "جب میرا بیاہ ہوگا۔ تب مجھے بھی اسی طرح سب سامان ملیگا تمھارے بابو جی بڑے اچھے ہیں۔ تبھی تو تمھارا بیاہ کر دیا۔ تبھی تو تمھیں گہنے اور کپڑے مل گئے۔

اس منڈلی میں ایک لڑکی درگا تھی۔ اس کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ دو ایک بیاہ اور بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ ان گہنوں کے بدلے خود ہی سب کو چھوڑ ایک غیر پردار میں جانا پڑتا ہے۔ اسی لئے ان چیزوں کا مول اس کی آنکھوں میں نہیں کے برابر ہو گیا تھا۔
مایا نے ہنس کر کہا "درگا دیوی جلدی آؤ۔ نہیں تو تمھیں جگہ نہ ملیگی!"
درگا بولی "مایا تو پاگل ہے۔ میں نہیں آؤں گی"
ادھ بھیڑ سب لوگ مایا کو ڈھونڈھتے تھے۔ مایا ہنس رہی ہے۔
منشی جی نے باہر جا کر دیکھا تو مایا اپنی منڈلی کے ساتھ پالکی میں بیٹھی ہے سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔
منشی جی کے رُکے ہوئے آنسو مایا کا بھولا پن دیکھ کر اور بھی اُمڈ آئے پہلے "پیاری مایا! کیا تو آج اپنے دادا کو بھول گئی؟ میں تجھے کب سے ڈھونڈتا ہوں آ۔ مایا۔ میں تجھے چھاتی سے لگاؤں۔ بیٹی آ . . . . . .
. . . . . "
مایا کی کچھ سمجھ نہ آیا۔ بولی "دادا جی آپ بھی چلیں میلا دیکھنے۔ آپ بھی بیٹھئے میں نہ اُتروں گی"
جیسے مایا بیٹھی تھی اسی طرح پڑا ہو گئی۔ کہنو اُتری نہیں۔ دادا۔ پتا۔ اور بھائی بہنیں سب سٹیشن تک پہونچانے گئے۔

(۷)

جب تک سکھیاں گاڑی میں تھیں۔ تب تک مایا خوش تھی کہنو جب وہ اکیلی ایک بڑی استری کے ساتھ رہ گئی۔ گھر کا کوئی دوسرا نہ تھا تو مایا نے رونا اور چیخنا شروع کیا۔ گاڑی پر سے کودنا بھی چاہتی تھی۔ بار بار کہتی تھی "میں دادا جی کے پاس جاؤں گی"
مہاراجن بولی "بیٹی شورت کرو۔ گاڑی پر چلو۔ کل ہم تم دونوں چلی آئیں گی۔
مایا رو کر بولی "میں نہیں جاؤں گی میں دادا جی کے پاس جاؤں گی"
مہاراجن نے کہا "دادا جی گھر گئے۔ کل آئیں گے۔ تب میں اور تم دونوں دادا جی کے پاس چلیں گے"
مایا جب کسی طرح چپ نہ ہوئی تو مہاراجن بولی "یہ دیکھو بیٹی تم روؤ گی تو یہ سب دادا جی کے پاس کبھی نہ جانے دیں گے۔ اس لئے بیٹی تم رونا نہیں اور ان کے گھر میں کسی سے کچھ نہ بولنا۔ نہیں تو گھر میں بند کر دیں گے۔ تب کیا ہوگا۔ جو

کوئی کچھ پوچھے تو سر ہلا دینا۔ اچھا! نہیں بیٹی گھر میں بند کر دیں گے تو دادا کے گھر کیسے ہم لوگ جائیں گے۔"

مایا۔ رو کر بولی: "تو دادا جی مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہیں ان پاجیوں کے پاس!"

مہاراجن بولی: "چپ بیٹی! کچھ نہ کہنا نہیں سن لیں گے تو آفت آجائیگی تب کیا ہوگا بیٹی ان کے گھر میں کچھ نہیں بولنا جو کہیں سن لینا۔ اور جو کھانا دیں چپکے سے کھا لینا۔ بھلا بیٹی! کل دادا جی آئیں گے۔ ہم لوگ اپنے گھر چلے آئینگے"

مایا سہم گئی نہیں کچھ نہیں بولوں گی چاچی۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں بھی مت جانا نہیں تو گھر میں بند کر دیں گے تو کیا ہوگا چاچی!"

مہاراجن نے کہا: "ہاں کچھ نہیں بولنا ہیں کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی!"

(۸)

مایا اپنی سسرال آئی تو بہت ڈرتی تھی کسی سے کچھ نہ بولتی تھی۔ بولے گی تو بند کر دی جائے گی۔ تب دادا جی کے ساتھ کیسے اپنے گھر جائے گی بہانوں کے ساتھ کھانا کھاتے بیٹھی تو دادی مایا کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی۔ کئی چیزیں کڑوی تھیں۔ کمبخت مایا کچھ بولتی نہ تھی۔ سی سی کرتی جاتی تھی۔ آنکھوں سے پانی گرتا تھا اور ناک سے بھی۔

مایا کی دادیا ساس بولی "کیا ہے بیٹی مایا؟" مایا کچھ نہ بولی۔

دادی پھر بولی "بیٹی کیوں روتی ہے۔ بتاؤ۔ یہ بھی تو تیرا ہی گھر ہے"

جب اب کی بھی مایا نہ بولی تو سب شنکا ہوئی کہ وہ گونگی تو نہیں ہے۔

دادی نے مہاراجن سے پوچھا: "کیا بات ہے بہو بولتی کیوں نہیں ہے؟"

مہاراجن نے کہا: "شرماتی ہے سرکار۔ ابھی تو آپ کے گھر آئی ہے سرکار!"

دادی ہنسی۔ "ابھی سے اس کو شرمانا کس نے سکھا دیا۔ ابھی تو بچہ ہے"

مہاراجن نے کہا: "صاحب گھر بھی بہت شرماتی ہے"

دادی پسن ہوگئی "میری بہو دیوی ہے"

مہاراجن بولی سب آپ کی کرپا ہے۔ ہم لوگ کس لائق ہیں"

تیسرے دن مایا خوش خوش اپنے گھر آگئی۔ دادا جی سے بولی "آپ مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے میں وہاں کچھ بھی بولی ہوتی تو وہاں کے لوگ مجھے بند کر دیتے تو کیا ہوتا اب مجھے کسی کے پاس نہ چھوڑنا دادا جی۔ اچھا"

دادا نے پوچھا۔ "تجھے کسی نے مارا تو نہیں کھانا اچھا دیا تھا نا؟" مایا ناک سکوڑ کر بولی۔ "کیا اچھا دیا کھانا بڑا کڑوا لگتا تھا مگر میں کچھ بولی نہیں ڈرتی تھی کہ سب بند کر دیں گے

مہر محمد خاں شہاب

ٹیپو کی وصیت

ٹیپو نے کہا اپنے پسر سے دمِ آخر
"یہ قولِ جہانتاب رکھ اے جانِ پدر یاد
جو مرغ کہ رہتا ہے فضا گیر و فلک سیر
ہرگز نہیں کھنچ سکتا سوئے دانۂ صیّاد
تابش نہ گر ایمان کی پہلو میں ہو دل تاب
بے زور ہے جنگاہ میں پھر بازوئے فولاد
لغزش نہیں اُس مردِ جواں عزم سے ہوتی
ہو جس کے ارادوں کی "ہو اللہ" پہ بنیاد
حلقوں میں مقیّد نہیں رہ سکتی کبھی روح
رہتے ہیں سلاسل میں بھی مردانِ حُر آزاد
کٹ کٹ کے جوانوں کی طرح جنگ میں گرنا
میسور میں کرنا نہ غلامی مگر ایجاد"

شہید ابن علی

جھوٹ

"دیہاتی لڑکی کو پڑھانا لکھانا اپنے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ زمین پر ہاتھ پٹک کر جھنکی نے اپنے پتی سے کہا ہیرالال نے سر اٹھا کر اپنی پتنی کی طرف دیکھا جیسے اس کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں کہ کیا بات ہے؟

"اکیلی لڑکی سمجھ کر لڑکے کی طرح پالا" ——— ہاتھ مٹکا کر جھنکی نے کہا

"اب میم بننا چاہتی ہے؟"

"جب سے دُلریا پڑھنے لگی۔ تبھی سے تم اس کے پیچھے پڑی ہو۔ آخر کیا کیا بیچاری نے؟"

"تمھیں نے اسے خراب کیا۔ اور اسی طرح کی باتیں کہہ کہہ کر میرا تو ایسا جی چاہتا ہے کہ جان دے دوں" جھنکی نے غصے سے اتنا کہہ کر آنسو بہانا شروع کیا۔ ہری لال سے اپنی استری کا رونا نہیں دیکھا گیا۔ اس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا ——— "آخر بات کیا ہے؟"

جھنکی نے کہا ——— "اسی تمھاری دُلریا کا گُن ہے۔ ابھی زمینداروں کے ہاں ہم دونوں گئی تھیں۔ لڑکی سُندر ہے ہی اسے دیکھ کر زمیندار نے کہا۔ میرا جی چاہتا ہے تمھاری لڑکی اپنے لڑکے سے بیاہ دوں۔ ان کی بات سن کر میں تو یہ سوچ کر خوش ہو گئی کہ ایسا اچھا گھر ملے گا۔ پر اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ ——— "تمھارے لڑکے سے بیاہ نہیں کروں گی" تمھیں بتاؤ بھلا کہیں لڑکیاں بھی ایسی بات کرتی ہیں۔ وہ تو میں نے بات بنالی نہیں تو اس دُلریا نے سب چوپٹ کر دیا تھا۔ لوٹتی بار راستے بھر مجھ سے لڑتی آئی ہے اور یہاں منہ پیٹنے پڑی ہے۔ سنا گُن اپنی دلاری کا؟"

"ابھی بچی تو ہے ہی" کہہ کر ہیرالال اٹھ کر دلریا کے پاس گئے۔ دیکھا تو پڑی آنسو بہا رہی تھی۔

× × × × × ×

دلاری اپنی ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کی طرح نہ تھی۔ وہ سندری ہی نہیں تھی۔ اس میں ایک ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو زبردستی اس کی طرف کھینچ لیتی تھی جیسے اس کی ماں ضد کہتی تھی وہ اصل میں دُلریا کا وصف تھا جسے وہ اپنی عزت کا غرور سمجھ کر کرتی تھی۔ اس دن اس کا زمیندار کے ہاں جانا اس کے لئے بڑی تکلیف کا باعث ہو گیا۔ زمیندار کا لڑکا برجو ہیرالال کے ہاں آنے لگا اور دلریا سے ایسی باتیں کرنے لگا جیسے بیاہ طے ہو گیا ہو۔

دلاری کو برجو سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ برجو کی بات چیت اس کا بول برتاؤ اسے اتنا رُوکھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ جب برجو آئے تو یہ کہیں بھاگ جائے۔ لیکن وہ اپنی ماں سے بے بس تھی جو اسے برجو سے بات چیت کرنے اور ہنسنے بولنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔ اس کی ماں تو یہ سمجھتی تھی کہ دُلریا کو برجو جیسا بر دنیا بھر میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گا۔

دُلریا بات تو کرتی برجو سے پر اسے دھیان ہر وقت رہتا تھا رشیا مو کا جو اس کے ساتھ کا پڑھا تھا اور پاس ہی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شہر میں جا کر نوکری کرتا تھا۔

دُلاری اور رشیا مو دوست تو ضرور تھے اور ان میں ایک دوسرے کے لئے پریم بھی تھا لیکن انھوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

× × × × × ×

رشیا مو دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر جب اپنے گاؤں میں آیا تو اسے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ دلاری کا بیاہ برجو سے ہو رہا ہے۔ یہ اپنے منصوبوں کے مطابق اس روز دُلریا سے ملنے نہ گیا۔ وہ طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا اور اپنے کمرے سے باہر بھی نہ نکلا۔

جب دلریا نے سنا کہ رشیا مو آیا ہے تو وہ اس کی راہ دیکھنے لگی لیکن جب وہ نہ آیا تو اسے بھی بڑا دُکھ ہوا۔ اور سوچنے لگی کہ کیا یہ سنتر بھی ہمیں بھول گیا؟ دوسرے دن سویرے ہی اس نے رشیا مو کو بلوانے کے لئے آدمی بھیجا لیکن وہ گھر نہ تھا۔ دلاری کا کلیجہ بیٹھ گیا اور وہ گھر سے نکل پڑی اور اپنی ماں سے مندر کا بہانہ کر کے جمنا کنارے دل بہلانے چلی گئی۔ اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچنے

لگی راہ: میں ایسی اجاگنی ہوں کہ ماں باپ میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ اور اس موکھ بیگمی کی زمینداری دیکھ کر تجھے زبردستی اس کے گلے منڈھ رہے ہیں۔ شیامو کہاں چلا گیا؟ وہ مجھ سے کیوں نہیں ملا؟ یہ سب سوچ سوچ کر وہ دکھ اور چنتا کے اتھاہ ساگر میں ڈوبی جا رہی تھی۔

اتفاق سے شیامو بھی وہیں جمنا کنارے ٹہل رہا تھا۔ وہ دلاری کو دیکھ کر اس کی طرف چلا لیکن یہ کچھ اس طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے شیامو کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

"دلاری!"

"کون۔ شیامو؟" چونک کر اور خوش ہو کر دلاری نے کہا۔ دونوں دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن بیاہ کی کچھ چرچا نہ چھڑی۔ زیادہ دیر ہوئی تو دونوں گھر کی طرف چلے۔

"آج میں سویرے سے کسی سے نہیں بولا تھا۔"

"میں بھی کسی سے نہیں بولی تھی اور آج مجھے ایسے آدمی کی کھوج تھی جو میری مصیبت سنے . . . . . ." نہ کہہ کر دلریا رک گئی اسے خیال آگیا کہ وہ ناحق ایسی بات کہہ گئی جو اسے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ آخر شیامو اس کا تھا ہی کون؟

شیامو نے دیکھا کہ دلریا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔ تو اس نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے ہٹ کر کے پوچھے۔

× × × × × × ×

اسی دن شام کو ——————

"دلاری چلتی ہو گھومنے؟" برجو نے پوچھا۔

"نہیں!" دلاری نے روکھائی سے جواب دیا۔

"میں بھی چلتی ہوں بیٹی! چلو نہ" دلریا کی ماں نے کہا۔

"میں بہت تھکی ہوں۔ میں نہ جاؤں گی۔"

"چلو!" کچھ کڑائی سے جھنکی نے کہا۔

"نہ جاؤں گی!" دلریا نے پھر اسی استقلال کے ساتھ کہا۔

"اچھا میں ابھی گھوم کر آتا ہوں" کہہ کر برجو چلا گیا۔

جھنکی غصے سے لال ہو کر بکھورتی رہ گئی۔ دلریا وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی۔

وہ اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر سوچتی رہی کہ اس طرح یہ جھمیلا کتنے دنوں تک چلتا رہے گا۔ اس نے سوچ لیا کہ جب برجو آئے گا تو صاف صاف کہہ دوں گی کہ تم سے ہرگز بیاہ نہ کروں گی۔ اس نے پھر سوچا کہ اس بیسویں صدی میں بھی کیا کوئی اس طرح زبردستی اسے برجو جیسے نالائق سے بیاہ سکتا ہے؟"

اسے اپنے کمرے میں چین نہ ملا۔ وہ باہر نکل گئی اور بستی سے باہر چلی گئی اُدھر سے شیامو بھی آ رہا تھا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھوں اس وقت تم سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟" اس نے دلاری سے کہا۔

"گھر میں جی نہ لگا۔ اسی سے نکل پڑی" تھوڑی دور تک دونوں چلے گئے۔

"شیامو! میری مدد کرو گے؟" دلاری نے پوچھا۔

"ضرور!" دلاری جھینپ سی گئی۔

زبان سے اس نے کچھ نہ کہا دونوں کی آنکھوں ہی نے آپس میں سب کچھ طے کر لیا۔

گھر پر آ کر اس نے برجو کو دیکھا۔ جھنکی اس سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ دلاری نے کہا ——————" میں برجو بابو سے الگ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اس کی ماں وہاں سے ہٹ گئی۔

"برجو بابو!" دلاری نے کہا۔ اور اسے اپنی اس جرأت پر خود ہی تعجب ہو رہا تھا ——————" میں سنتی ہوں آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ایسی تجویز پر فخر کرنا چاہیے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ میں آپ سے بیاہ نہ کروں گی۔ شیامو . . . . . ."

بات کی ابتدا سن کر تو برجو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی لیکن شیامو کا نام سن کر اس کے چہرے کا رنگ ایسا بدل گیا کہ دلاری ڈر کر چپ ہو گئی۔

"شیامو ——————؟" کچھ سوچتے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد برجو نے کہا۔ "شیامو ہی سندر پور کا نہ جس کی استری نے دو سال ہوئے پنچائت بٹوری تھی؟"

دلاری کا منہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا جی جانے کیسا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا ہو۔ وہ پاگل سی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ——————" ہاں وہی شیامو میرے ہی پیچھے تو اس کی استری نے پنچائت بٹوری تھی . . . . ."

یہ خوفناک جھوٹ دلاری کے منہ سے نکلنے کو تو نکل گیا لیکن وہ بے جان سی ہو گئی پھر بھی اس نے اپنے کو سنبھالا۔ اور برجو کی طرف دیکھتی رہی تاکہ وہ اسکی کمزوری بھانپ نہ جائے۔ اسے اس وقت صرف اپنے شیامو کا خیال تھا جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔

"تم سچ کہتی ہو ——————" تھوڑی دیر چپ رہ کر برجو نے زور

سے پوچھا۔

"بالکل سچ کہتی ہوں لیکن کسی سے کہنا مت۔ میرا خیال تھا کہ تمھیں سب معلوم ہے۔"

دلاری کی باتیں سن کر برجو کچھ نہ بولا۔ اور اٹھ کر چلا گیا۔

× × × × × × ×

برجو کے چلے جانے کے بعد اس کے جھوٹ نے اسے اوندھا کر دیا۔ وہ ایک چارپائی پر پڑ گئی اور اپنے اس رنج پن پر خوب روئی۔ برجو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے اپنے جی کا ایک جھنجھٹ تو جھوٹ بول کر توڑ دیا تھا لیکن اسے اپنے اس جھوٹ بولنے پر اُس دن تک لاج آتی رہی جب تک وہ بیاہ کر کے شیامو کے گھر نہ گئی اور اس نے شیامو کو اپنے جھوٹ بولنے کی کتھا نہ سنا دی۔

"تو اس طرح جھوٹ بول کر تم نے مجھے پایا ہے ——— ؟" شیامو نے پیار سے کہا۔ اور دلاری کو گلے سے لگا لیا۔

آسی رام نگری

تصوّر

میں نے آہنی سلاخوں سے باہر دیکھا

رات سادہ تھی مگر مہیب ——— !

میرے تصوّر میں تم تھے

اچانک آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔

اس کی سرخ اور سنہری چمک سے آسمان روشن ہو گیا

اور ایک لمحہ کے بعد یہ چمک رات کی بے پایاں تاریکی میں گم ہو کر رہ گئی۔

آہ! میری دنیا تباہ ہو گئی ——— !

راکھ ہو گئی ——— !

میں نے آہنی سلاخوں میں سے باہر دیکھا۔

میرے تصوّر میں تم ہی تھے۔

آخر یہ آہنی سلاخیں کیوں؟

تم کیوں ——— اور

میں ——— کیوں ——— ؟

آخر یہ دن رات۔ یہ ماہ و سال کیوں؟

جب کہ ایک دنیا ایک ہی چمک کے بعد تباہ ہو جاتی ہے،

ہمیشہ کے لئے راکھ ہو جاتی ہے۔!

بشیر ہندی

ملنے کا پتہ
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
مکمل فہرست مفت
طلب کریں۔

غزل

آباد اگر نجد کا ویرانہ نہیں ہے
مجنوں کو بُلا لاؤ۔ وہ دیوانہ نہیں ہے؟

ہے شمعِ وفا محفلِ اُلفت میں ضیا ریز
اِس شمع پہ لیکن کوئی پروانہ نہیں ہے

یہ عقل کی باتوں میں تو آئے گا نہ ہرگز
عاشق ترا ہشیار ہے دیوانہ نہیں ہے

ساقی تری محفل ہے مئے ناب میں غرقاب
اور میرے لئے ایک بھی پیمانہ نہیں ہے

کافر بھی مسلمان بھی شیدا ہے بُتوں پر
وہ کونسا دل ہے جو صنم خانہ نہیں ہے

دو اشک ہی نکلے تھے کہ اُس شوخ نے ٹوکا
حضرت! یہ مرا گھر ہے عزاخانہ نہیں ہے

مجھ کو نظر آتا ہے یہ عالم ہمہ تن نُور
اِک ذرّہ یہاں حُسن سے بیگانہ نہیں ہے

ہوتا ہے اِس آغاز کا انجام بہت نیک
جو کعبہ نہ بن جائے وہ بُت خانہ نہیں ہے

ہر رنگِ تغزّل مرا معمول ہے اختر
کم ظرف مرے شعر کا پیمانہ نہیں ہے

ہری چند اختر

تہذیب کدھر جارہی ہے

اقتصادی اور سیاسی قوتوں کا تجزیہ

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں یورپ نے ایک نہایت عجیب و غریب تہذیب کی بنا ڈالی ہے۔ سائنس کی ترقی کی وجہ سے فطرت کی طاقتیں انسان کے قابو میں لائی گئی ہیں اور اُن کی مدد سے مادی زندگی کی ضروریات ایک بہت بڑے پیمانے پر پیدا کی جارہی ہیں۔ یہ نئی قوتیں اور نئے طریق کم و بیش تمام ممالک پر اثر انداز ہو چکے ہیں اور ذرائع بار برداری اور خبر رسانی کی ترقی کی بدولت تمام عالم ایک ہی تہذیب کے رنگ میں رنگا جارہا ہے۔

تاہم اس دورانِ ارتقا میں اس تہذیب نے کئی ایک سیاسی و اقتصادی آویزشوں کو جنم دیا ہے۔ اِن آویزشوں کا اصلی مبدا، تو انسان کے وہ طبعی رجحانات ہیں جو اسے قبضہ حاصل کرنے اور حکومت کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ مگر اُن حالات کے ماتحت جو صنعتی انقلاب کے باعث ظہور پذیر ہوئے ان متضاد قوتوں نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اور اگر ان کا ازالہ نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ کہیں یہ تہذیب کو نیست و نابود نہ کر دیں۔ اس چھوٹے سے مضمون میں یہ تو ممکن نہیں کہ ان تمام مسائل پر ایک بسیط بحث کی جا سکے اور ان آویزشوں کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی جا سکے۔ اس لئے میں ان میں سے صرف تین مسائل پر ناقدانہ نظر ڈالوں گا۔

ان تین متضاد آویزشوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی آویزش غیر مطمئن اور مطمئن اقوام کے درمیان ہے۔ اوّل الذکر ممالک مقبوضہ کی موجودہ تقسیم کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ثانی الذکر اس تقسیم کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جرمنی۔ اٹلی۔ جاپان وغیرہ غیر مطمئن اقوام میں اور انگلستان فرانس اور امریکہ مطمئن اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری آویزش ملوکیت پرست طاقتوں اور ان کی محکوم اقوام کے درمیان ہے۔ مؤخر الذکر کو سیاسی آزادی کی ضرورت کا احساس ہو چکا ہے اور وہ سیاسی طور پر بیدار ہو چکی ہیں۔ اس لئے آزادی حاصل کرنے پر مُصر ہیں۔

(۳) تیسری آویزش دو معاشرتی اصولوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو موجودہ نظامِ معاشرت کے حامی ہیں جس کی بنا سرمایہ داری ہے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو اشتراکی نظام کے قیام کے خواہاں ہیں۔ یہ تینوں آویزشیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

اب ہم ان آویزشوں کو یکے بعد دیگرے مطالعہ کریں گے۔

فسطائی خطرہ

پیشتر اس کے کہ ہم فسطائی اقوام کے مطالبۂ تقسیم جدید اور اس کی اہمیت پر نظر ڈالیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فسطائیت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بقول سکاٹ نیرنگ تحریک فسطائیت سرمایہ دار اور حقوق یافتہ افراد کی تحریک ہے اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی جاری کردہ ہے پہلے پہل تو یہ تحریک متوسط طبقہ کی قیادت میں رہتی ہے مگر بعد ازاں اس حکمران طبقہ کی قیادت میں چلی جاتی ہے جو جنگِ عظیم، اقتصادی بدحالی اور محکوم اقوام کی بغاوت سے برباد شدہ سرمایہ دار شہنشاہیت سے منہ موڑ رہا ہو اور مزدور بغاوت کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے تدبیریں سوچ رہا ہو۔ عموماً یہ عناصر قومی جذبے کی آڑ میں مزدور تحریک کا قلع قمع کرنے کے لئے اقتصادی طور پر دوسری قوموں سے بے نیاز ہونے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

غرضکہ فسطائیت ذیل کے مقاصد پر مشتمل ہے۔

(ا) نظامِ سرمایہ پرستی کو اس کے دورِ ابتلا میں مزدور تحریک کے حملوں سے محفوظ رکھنا۔ فسطائی ممالک پر اس مقصد کے حصول کے لئے ٹریڈ یونین کی تنظیم کے مزدور اداروں کو کچلنا تقریر و تحریر پر پابندیاں عائد کرنا ہڑتال وغیرہ کو خلافِ قانون قرار دینا اور جمہوری اداروں کو ہر ممکن ذریعہ سے مٹانا۔

(ب) نوآبادیات اور مقبوضات حاصل کر کے اقتصادی طور پر بیرونی اقوام سے بے نیاز ہونا۔

(ج) جارحانہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عوام کے جذبۂ حبِ وطن یا نسلی امتیاز سے کھیل کر ان کی مدد حاصل کرنا۔

(د) قومی وقار کے احساس کو دور کرنے کے لئے شاندار فتوحات حاصل کرکے بالآخر تمام دنیا کی قیادت کی امید رکھنا

فسطائیت کے مندرجہ بالا مقاصد اور عزائم موجودہ فسطائی طاقتوں کے حالات اور افعال کا مطالعہ کرنے سے بہت اچھی طرح عیاں ہو جاتے ہیں۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح یہ طاقتیں دنیا کے امن اور تہذیب کے لئے خطرۂ عظیم بنی ہوئی ہیں۔ ان تینوں ممالک میں فوجی شخصی یا جماعتی آمریت قائم ہے۔ مسولینی اٹلی میں اور ہٹلر جرمنی میں شخصی ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جاپان میں کوئی شخص قائد نہیں۔ یہاں فوجی جماعت کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ ان تینوں ممالک میں نئی پود یونین۔ نوجوانوں کی جماعتیں اور آزادیٔ تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد ہیں۔ تینوں میں ڈکٹیٹر شپ اقتصادی بدحالی کے ایام میں وجود پذیر ہوئی۔ تینوں عوام کے جذبۂ حب الوطن اور نسلی امتیاز کو اپیل کرتے ہیں۔ تینوں یا تو پہلے ہی سے علاقہ غیر پر حملہ کرکے قابض ہو چکے ہیں یا ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تینوں جنگ کی پوجا کرتے ہیں اور اسکی تیاریوں میں ہمہ تن مشغول ہیں۔

جاپان

جاپان ہی کو لیجئے پچھلے پانچ سالوں میں اُس نے مانچوریا، جیہول اندرونی منگولیا اور شمالی چین کے چند صوبوں پر اپنا فوجی تسلط جما لیا ہے۔ ان محفوظ علاقوں کا مجموعی رقبہ۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور سپین کے مجموعی رقبہ سے بھی زیادہ ہے۔ اب وہ سارے چین پر سیادت کا دعویدار ہے اور غالباً جرمنی کی امداد سے سویٹ روس پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا منتہائے نظر مشرقی ایشیا پر مکمل تسلط قائم کرنا اور مشرقِ بعید سے فرانس، برطانیہ، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا اخراج ہے۔ انگلستان، جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مشرقِ بعید میں امریکہ والوں کے عزائم اور چینی قومی تحاریک اور روسی کمیونزم کے راستے میں ایک سدِ راہ خیال کرتا رہا ہے۔ مگر اب انگریزی رائے عامہ جاپانی عزائم سے خائف نظر آتی ہے اور اس کا ایک اہم طبقہ اس مشترکہ خطرے کے خلاف اینگلو امریکن معاہدے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر انگلستان نے دوربینی سے کام لیا ہوتا اور مجلس اقوام کی اُس وقت حتمی طور پر مدد کی ہوتی جبکہ جاپان نے ۱۹۳۱ء میں پہلے پہل معاہدۂ کیلاگ اور لیگ کی دفعات کی خلاف ورزی کی تھی تو لیگ زیادہ مستحکم ہو جاتی اور اٹلی کے بعد کے جارحانہ اقدامات ناممکنات میں سے ہو جاتے۔

اٹلی

اب ہمیں اٹلی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جبکہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت نہایت گری ہوئی تھی۔ اُس وقت مسولینی عروج پذیر ہوا۔ اُس نے ملک میں اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے بعد فوراً ہی اٹلی کی شکایاتِ بے انصافی کو جو اس کے جائز حقوق میں جنگِ عظیم کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم میں برتی گئی تھی بلند کیا۔ اٹلی بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے حبشہ پر نہایت ہی معمولی وجوہات کی بنا پر حملہ کر دیا اور اُسے فتح کرکے اپنا مقصد حاصل کیا۔ اس میں بھی برطانیہ کے کوئی فیصلہ کن طریقِ عمل اختیار نہ کرنے سے اٹلی کی بڑی حد تک مدد ہو گئی۔ فرانس چاہتا تھا کہ وہ برطانیہ سے وعدہ لے کہ جب جرمنی اُس پر حملہ کرے تو برطانیہ اس کی مدد کرے گا مگر جب وہ اس طرف سے ناامید ہو گیا تو اُس نے اٹلی سے معاہدہ کر لیا اور تعزیرات کے عائد کرنے میں پوری طرح دلچسپی نہ لی۔ اس وقت برطانیہ ایک طرف تو اٹلی سے مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھا اور دوسری طرف اجتماعی حفاظت کا پرچار کرتا تھا جبشہ میں اٹلی کی فتح برطانیہ کے حق میں ایک قسم کی دھمکی تھی۔ نیز اٹلی نے ابھی سے برطانیہ کی بحر روم میں فوقیت پر اعتراض کرنا شروع کر دیا ہے۔ جب سپین میں اٹلی اور جرمنی کی صریح مدد اور فرانس اور برطانیہ کے کوئی حصہ نہ لینے کی غیر جانبدارانہ پالیسی سے جنرل فرنکو کی فسطائی طاقت قائم ہو جائے گی تو یہ معاملہ اور بھی نازک صورت اختیار کر لے گا۔

جرمنی

سب سے زیادہ خطرے کا احتمال جرمنی سے ہے۔ جہاں ایک ایسی رجعت پسند جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ جو قومی وحشت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ ہٹلر کے عروج کی وجہ جرمنی کا وہ احساس ذلت تھا جو معاہدۂ ورسیلز نے ایک ایسی شجاع اور شاندار روایات رکھنے والی قوم پر اقتصادی اور سیاسی پابندیاں عائد کرکے پیدا کر دیا تھا۔ برونننگ کی حکومت کی مالی حکمت عملی نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا اور اُس پر طرہ یہ کہ ۳۱-۱۹۳۰ء کی اقتصادی مشکلات اور مالی کمزوریوں نے تازیانے کا کام کیا اور حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔ سو ان نازک حالات میں اشتمالی فرقے کی تدابیر اور جمہوری اشتراکی کی بے اثری نے رجعت پسند عناصر کو مستحکم بنا دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے عنانِ ملک ہاتھ میں لے لی۔ اس مقامِ اعلیٰ پر پہنچنے کے بعد ہٹلر تین سال کے اندر اندر اپنے دشمنوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تمام ان لوگوں کو جو آرین نہیں تھے یعنی جن کے خون میں ضعیف سے ضعیف بھی یہودی اثر تھا۔ ملک سے نکال باہر کیا اور معاہدۂ ورسیلز کی تمام قیود اور پابندیوں کو معاہدۂ لوکارنو کی قیود سمیت توڑ ڈالا۔

یہاں بھی ہٹلر کی کامیابی برطانوی خارجی پالیسی کے تذبذب کی وجہ سے تھی۔ انگریزوں نے اُن بے انصافیوں کو جو جرمنی سے جنگِ عظیم کے بعد کی گئی تھیں مدنظر رکھتے ہوئے ہٹلر کی چالوں کو نرمی کی نظر سے دیکھا۔ جرمنی نے لیگ سے کنارہ کشی کرلی اور اسلحہ بنانے شروع کردیئے جن پر اُس نے تین سال میں ۵۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ خرچ کئے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر کی فوجیں خطۂ رائن میں داخل ہوگئیں جو ۱۹۲۵ء کے عہد نامۂ لوکارنو کی رُو سے فوجی طاقت سے پاک رکھا گیا تھا اور اب ہٹلر جرمنی کی کھوئی ہوئی نوآبادیات واپس طلب کررہا ہے۔ ہٹلر کے خیالات بڑے وسیع اور بلند ہیں۔ اُس نے اپنا پروگرام صاف لفظوں میں اپنی کتاب "میری جدِ حیات" میں لکھا ہے۔ اور یہ کتاب جرمن فسطائیت کی انجیل سمجھی جاتی ہے اور جرمنی میں ہر شادی پر میاں بیوی کو تحفۃً پیش کی جاتی ہے۔ تمام ملکوں کو جن میں جرمن لوگ بستے ہیں۔ جرمنی کے ماتحت لانا اُس کا مقصد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ آسٹریا اور ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، زیکوسلوویکیا، ہنگری، رومانیا، لتھوانیا اور پولینڈ کے اُن علاقوں کو جن میں جرمن لوگ بستے ہیں حاصل کیا جائے۔ فرانس ولیمز اس کے متعلق کہتا ہے کہ جرمن سکولوں میں جغرافیہ کے طلباء کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جرمنی کی حدود یہ نہیں جو موجودہ زمانے میں ہیں۔ ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ حدود صرف عارضی ہیں۔ اور اصل حدود وہ ہیں جو وسطِ یورپ پر حاوی ہیں۔ ہٹلر کا موجودہ مطمحِ نظر ملک روس معلوم ہوتا ہے۔

ہٹلر اپنی کتاب میں رقمطراز ہے "اگر کوئی سلطنت نئی آبادیات اور قلمرو حاصل کرنا چاہے تو وہ صرف روس سے ایسی قلمرو کی مقتضی ہوسکتی ہے"۔ اور پھر کہا ہے۔ "اگر یورپ میں ہم نوآبادیات کے مسئلہ کو چھیڑیں تو ہمارا خیال فی الفور روس کی طرف اور اُن سلطنتوں کی طرف جو روس کے زیرِ نگیں ہیں مبذول ہوگا۔ قسمت خود اس طرف ہماری رہنمائی کرتی نظر آتی ہے"۔ اس بارے میں ہٹلر نے اپنی جدید تقاریر میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا ہے پیشتر ازیں ہٹلر نے پولینڈ اور جاپان کے ساتھ ان اغراض کو پیشِ نظر رکھ کر معاہدے کئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں جرمنی اور جاپان کے درمیان سویٹ یونین کے خلاف ایک معاہدہ طے پایا ہے۔ اور پھر اطالوی امداد کے حاصل کرنے کی سعی بلیغ ہورہی ہے۔ ہٹلر کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی طاقت کو بھی اپنی طرف کھینچ کر فرانس کو علیحدہ کرے۔ اور اس ملک کے ساتھ ایک آخری فیصلے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کرے۔ انجامِ کار اس کا مطمحِ نظر تمام دنیا کی فتح حاصل کرنے سے کم نہیں ہے

وہ لکھتا ہے "وہ سلطنت جو اس زہریلی نسلی آمیزش کے زمانے میں نسلی پاکیزگی کی علمبردار ہے ضرور ہے کہ ایک دن تمام روئے زمین پر قابض ہوجائے۔ غیر وہ ایسے خیالات کے اظہار میں ایک وہی دنیا میں ہے۔ بہرنوع اس کے مقاصد و اغراض عیاں ہیں۔ اُس نے آسٹریا سے چھیڑ چھاڑ صرف اتنے نہیں کی کہ وہ اٹلی سے اچھے تعلقات قائم رکھ سکے۔ غرضیکہ اُس کو جب بھی موقع ہاتھ آیا اُس کا مقصد روس پر دھاوا بولنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُس کو زیکوسلوویکیا کی ریاست میں مداخلت کی ضرورت پیش آئے گی۔ فرانس ولیمز کا خیال ہے "زیکوسلوویکیا میں نازی مداخلت یقیناً بغیر تاخیر یورپ میں جنگ کا باعث ہوگی"۔

پس معلوم ہوا کہ تمام فسطائی حکومتیں نوآبادیات کی مقتضی ہیں ایک عالمگیر جنگ بھی ظہور پذیر کیوں نہ ہو۔ جدید آلاتِ حرب مثلاً گیس بم اور ہوائی جہاز کے استعمال سے عالمگیر جنگ اُن نتائج کی حامل ہوگی جو سپانیہ میں ایک چھوٹے پیمانے پر رُونما ہورہے ہیں۔ ایک ہوائی جہاز نئے اصول پر حال ہی میں ایجاد ہوا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آٹھ ہزار میل تک بے تکلف پرواز کرسکے گا۔ اور بموں کے بھاری بوجھ کو دو ہزار میل تک لے جاکر اپنی جائے پرواز تک واپس بھی آسکے گا۔

لندن کے اخبار آبزرور مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۶ء نے مندرجہ بالا خبر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "پس اس ہوائی جہاز کا عمل لینن گریڈ، ماسکو۔ ایتھنز۔ روم اور میڈرڈ تمام پر حاوی ہوگا"۔

فسطائی حکومتیں مندرجہ ذیل وجوہات پر نوآبادیات کا تقاضا کرتی ہیں:۔

(ا) دنیا میں وقار حاصل کرنے کی خاطر۔

(ب) دورانِ جنگ میں جنگی نقطۂ نگاہ سے اہم مقامات کو حاصل کرنے کے لئے۔

(ج) اقتصادی ضروریات۔ مثلاً

(۱) آبادی کی کثرت کو کم کرنے کے لئے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ ممالک اپنی آبادی کو ہر ممکن ذریعے سے بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں۔

(۲) خام اشیاء مستقل طور پر مہیا کرنے کے لئے۔

(۳) اپنی مصنوعہ اشیاء کی تجارتی منڈیوں کو محفوظ کرنے کے لئے۔ اس آخری وجہ مطالبہ کو زیادہ اہمیت اس لئے مل گئی ہے۔ کہ شہنشاہی حکومتیں مثلاً برطانیہ۔ فرانس وغیرہ اپنی نوآبادیات اور مقبوضات کے درمیان ہیریٹیج پر فرنس

کی پالیسی برت رہی ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقبوضات اور نوآبادیات میں بسنے والے لوگوں کے کوئی حقوق نہیں؟ کیا اُن کو صرف مالِ منقولہ ہی فرض کیا جائے؟ یہاں ہم نوآبادیات کے وسیع مسئلہ سے دو چار ہوتے ہیں۔

مقبوضات اور نوآبادیات

جنرل فرنز ریڈر جرمن مقبوضات کی واپسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ورسیلز کے معاہدے نے جرمنی کے تمام مقبوضات چھین لئے۔ اور جو خام اشیاء جرمنی کے لئے اہم اور ضروری تھیں۔ جرمن سکے کے ذریعے اُن کی خرید کے امکانات بھی اُس سے ضبط کر لئے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے مقبوضات اس کے اپنے رقبے سے صرف ۱/۵ گنا زیادہ تھے۔ مگر پھر بھی دیگر چھوٹی حکومتوں سے جرمنی پیچھے تھا اور اُس وقت برطانوی مقبوضات اس کے اپنے رقبے سے ۱۰۵ گنا زیادہ تھے۔ بلجیم کے مقبوضات اس سے ۸۰ گنا زیادہ تھے۔ ہالینڈ کے ساٹھ گنا اور فرانس کے بائیس گنا زیادہ تھے۔"

جمعیتِ اقوام کے معاہدے کی دفعہ بائیس کا مفاد یہ ہے:۔ کہ وہ نوآبادیات اور علاقے جو جنگِ عظیم کے نتائج کی وجہ سے بعض اُن سلطنتوں کے قبضے سے نکل گئے ہیں جو اُن پر جنگ سے پہلے حکومت کرتی تھیں اور جن میں وہ قومیں آباد ہیں جو زمانۂ جدید کے مشکل حالات میں اپنے پاؤں پر خود نہیں کھڑی ہو سکتیں۔ اُن کے واسطے یہ اصول ہونا چاہئے کہ ان کی فلاح و بہبود تہذیبِ جدید کے ہاتھ میں ایک مقدس امانت تصور کی جائے۔ اور اس امانت کی حفاظت کے لئے کچھ کفالتیں جمعیت کے اس معاہدے میں شامل ہونی چاہئیں:۔

اسی دفعہ ۲۲ پر تنقید کرتے ہوئے فرانسس ولیمز لکھتا ہے "کہ لیگ کا یہ معاہدہ صرف وہ قومیں وجود میں لائی ہیں جو جنگِ عظیم میں فتح مند ہوئی تھیں۔ اُن کو خود اپنی نوآبادیوں کی رعایا کی بہبود کا خیال نہ آیا کہ یہی تہذیب کی ایک مقدس امانت ہو سکتی ہے۔ بلکہ صرف اُن نوآبادیوں کی بہتری کا خیال آیا جو پہلے شکست خوردہ قوموں کے قبضے میں تھیں۔ ان کے اپنے ہی بیانات کی بنا پر ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انہوں نے یہ جنگ صرف تہذیبِ جدیدہ کے تحفظ کی خاطر کی تھی۔ اس لئے تہذیبِ جدید کا ان پر اس سے زیادہ اور کوئی حق نہیں۔

ظاہر ہے کہ فاتحین جنگ نے نوآبادیات کے انتظام میں حکمیت کی بجائے تولیت کا تخیل داخل کر کے نہایت عمدہ اصول وضع کیا تھا لیکن وہ اِس اصول کا خود اپنی تمام نوآبادیات پر اطلاق کر کے اسے عالمگیر نہ بنا سکے۔ اگر وہ اس اصول کو خود اپنی نوآبادیات پر بھی عادی کر دیتے تو آجکل مقبوضات کی موجودہ تقسیم کی ترمیم کے مطالبات زور نہ پکڑتے اور نہ وہ باہمی حسد و رقابت ظہور میں آتا جس نے بین الاقوامی امن و امان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ بلکہ اس سے خود اُن نوآبادیوں کی رعایا بھی ان کی ممنون احسان ہوتی۔ اس عرصے میں محکوم اقوام بھی خود مختارانہ حیثیت حاصل کر لیتیں اور جمعیتِ اقوام کے توسط سے بین الاقوامی امن کے قیام کے لئے اپنا پورا زور لگاتیں۔ اب بھی کیا دیر ہوئی ہے۔ اگر تولیت کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو قابض اور غیر قابض اقوام سب کے لئے مفید ہوگا۔ ہندوستان جیسے ملکوں کو جو اپنا انتظام آپ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کو اپنا انتظام آپ کرنے کی اجازت کم عرصے میں دے دینی چاہئے۔ اور جو ممالک سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے ابھی بہت پس افتادہ ہیں جمعیتِ اقوام کی تولیت میں ان کو ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ خود جمعیت کو بھی زیادہ طاقتور بنایا جائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اقوام کے نمائندے شامل ہوں۔ تاکہ مذکورہ بالا تین فسطائی اقوام جن کا اصول جبر و ظلم ہے اُن کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جا سکے۔

لیکن دفاع کے قیام اور فوجی ضروریات کے علاوہ یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ ان قابض طاقتوں کی اقتصادی ہستی کے ساتھ یہ موافق اور ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نوآبادیات کے سیاسی حقوق کو چھوڑ دیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان اپنے مقبوضات کے بغیر اپنی اقتصادی زندگی قائم رکھ سکے۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرمایہ داری کا نظام صرف کمزور فرقوں اور طاقتوں کی ناجائز بربادی پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اگر نوآبادیاں صنعتی نظام کے واسطے خام پیداوار نہ مہیا کریں اور اپنے حاکم ملکوں کی صنعتی پیداوار کی مسلسل آمد کو جذب نہ کریں تو یہ چیزیں ان ملکوں کی بدترین اقتصادی تباہی کا باعث ہوگی۔ اس لئے ہم ان تین آویزشوں میں سے آخری آویزش کے بیان کی طرف آتے ہیں۔ جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم سے پیدا ہوئی ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت

تہذیب کو ان دو نو اصولوں میں سے جن پر اقتصادی نظام کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا اور یہ منتخب اصول اس سوال کے تمام حل کی کلید ہمارے ہاتھ میں دیدے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ سرمایہ داری کیا ہے اور اشتراکیت کیا چیز ہے۔ ایڈورڈ کونزے کی رائے میں "سرمایہ دار سوسائٹی وہ ہے۔ جس کی تمام تر توجہ اشیاء کی صنعتی پیدائش کی طرف مبذول ہو۔ اس جماعت کے دو

حصے ہیں اولاً وہ جماعت جو پیداوار کے تمام ذرائع (یعنی زمین، کارخانے اور قدرتی قوائم) کی مالک اور ذمہ دار ہے اور ثانیاً وہ لوگ جن کی ذرائع پیداوار تک رسائی اور قربت اس شرط پر ہے کہ وہ اپنی محنت اور کاوش کو منڈی میں چند روپوں کے عوض فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

ڈی۔ جی۔ ایچ کول کے نزدیک "اشتراکیت کے یہ معنی نہیں کہ صنعت و حرفت کو کسی خاص لائحہ عمل اور طریق کار کے مطابق چلایا جائے۔ بلکہ اشتراکیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام صنعت و حرفت کو عوام کے دائرۂ نظم و نسق کے تحت میں لایا جائے اور مفادِ عامہ کے واسطے اقتصادی نظام کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن تجویز سوچی جائے۔"

دنیا میں صرف روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سوشلزم یا اشتراکیت کو قومی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ دُنیا کے دوسرے ممالک سرمایہ داری تنظیم کے مختلف مدارج میں ہیں۔ لیکن اشتراکی جماعتوں کے وجود سے یہ ممالک بھی خالی نہیں۔ ان منظم جماعتوں کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اشتراکی خیالات رکھتے ہیں۔ فسطائی حکومتوں نے البتہ اپنے ملک کو اشتراکی عنصر سے بالکل پاک کر دیا ہے۔ خواہ وہ کسی حیثیت سے موجود ہو (انفرادی یا جماعتی)، اور یہ حقیقت ہے کہ فسطائیت اشتراکیت کی بدترین دشمن ہے۔

اشتراکیت کے نئے اصول جرمنی کے مفکرِ اعظم کارل مارکس کے مرہونِ منت ہیں، جس نے انجلز کے ساتھ مل کر ۱۸۴۸ء میں مشہورِ عالم کمیونسٹ مینی فسٹو (لائحۂ عمل) شائع کیا۔ اور جس نے اشتراکیت کو ایک نہایت مناسب نظریے اور جدید لائحۂ عمل کے رنگ میں رنگ دیا۔ اشتراکیت کی بھی مختلف جماعتیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کے نظریے (قول و فعل) حکومت کے قوانین کے عین مطابق ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو انقلاب پسند ہیں۔ انہی انقلاب پسندوں اور دہشت انگیزوں نے ۱۹۱۷ء میں روس میں نہائت کامیابی و کامرانی سے ایک انقلابِ عظیم برپا کیا اور موجودہ سوویٹ یونین کی بنا ڈالی۔

اگرچہ اشتراکی اپنے طریقِ کار میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری (جس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی قبضہ ہوتا ہے) کی جگہ ایک دوسرا نظام اشتراکیت رائج کرنا (جس میں ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ ہوتا ہے۔)

وہ ذرائع پیداوار کے انفرادی قبضہ پر اس لئے اعتراض کرتے ہیں کہ اُن حالات کی وجہ سے جو صنعتی انقلاب نے پیدا کر دیئے ہیں معاشرتی نظام چند افراد کے قبضہ میں آجاتا ہے اور قوم کے بقیہ افراد نظامِ اجرت کی غلامی (یعنی مزدور پیشگی) میں جکڑے جاتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ سرمایہ دار اقتصادی افادیت پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مزدور طبقے کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو قومی سرمایہ کے حقیقی حصے سے محروم کر دیتے ہیں۔

اشتراکیوں کا عقیدہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری میں ایک اصولی اختلاف ہے۔ کوزنے کہتا ہے "سوسائٹی کی پیدائشی قوتیں ہمیشہ عوام کی طاقتِ خرید سے ہر وقت بڑھنے کی مقتضی ہوتی ہیں۔ صنعتی ایجادیں اور مکمل تقسیمِ عمل سماجی قوتِ پیدائش کو اور امدادِ باہمی و تنظیمِ انفرادی و اجتماعی کارخانوں کو ترقی دیتی ہے۔ نظامِ منافع کی طلب سے جس کا کام اجرت کم کرنا اور اس طرح اجتماعی پیدائش کے بازار کو محدود کرنا ہوتا ہے۔ قوتِ خرید آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے۔ اس اختلاف کا وجود ہی آئے دن کی اقتصادی مشکلات اور کساد بازاری کو واضح کر سکتا ہے جس میں اشیاء کی فاضل پیداوار بمقابلہ قوتِ خرید کے ایک کوچیتم کو بھی نظر آسکتی ہے۔ اس زائد پیداوار کے مسلسل بوجھ سے بچنے اور کساد بازاری کے دفعیے یا کم از کم التوا کی کوشش سرمایہ دار اقوام اپنی منڈیوں کو وسعت دینے کے لئے غیر سرمایہ دار علاقہ جات پر قابض ہونے کے لئے کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو اقتصادی شہنشاہیت کہا جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ صورتِ حالی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سرمایہ دار اقوام کے حاکموں نے دنیا کی تمام آبادی پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔

شہنشاہیت اور جنگ میں جو تعلق ہے وہ اب ظاہر ہے۔ جب تمام دنیا سرمایہ دار اقوام میں تقسیم ہو چکی ہو تو یہ قدرتی امر ہے کہ اُن میں سے بعض اقوام اس تقسیم پر نظرِ ثانی کی خواہاں ہوں۔ اس لئے شہنشاہیت کے ماتحت جنگ کا خطرہ ایک دائمی امر ہے۔ تمام حکومتوں کی ہتھیار بندی کا واحد سبب یہی ہے کہ وہ سب اس خطرہ سے واقف ہیں۔ چنانچہ نظریۂ اشتراکیت یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تینوں آویزشیں ایک دوسری سے انتہائی قربت رکھتی ہیں اور نظریۂ اشتراکیت کے مطابق ان آویزشوں کا واحد سبب نظامِ سرمایہ داری ہے۔

اشتراکیوں کا یہ ایمان ہے کہ جب تک دنیا میں سرمایہ داری کا وجود باقی ہے جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

اپنے مندرجہ بالا تجزیہ کے ثبوت میں اشتراکی سرمایہ دار ممالک اور روس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام سرمایہ دار ممالک ایک ایسے دورِ انحطاط میں سے گزر رہے ہیں جس کی مثال دینے سے تاریخ قاصر ہے۔ اس انحطاط نے نظامِ صنعت کو مردہ کر کے بے روزگاری بڑھا دی ہے۔ حالانکہ دوسری طرف روس کے

نظامِ صنعت میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے اتنی ترقی کی کہ اب وہاں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جو بے روزگار ہو۔ ادھر سیاست کے میدان میں بھی سرمایہ دار ممالک اور خصوصاً وہ ملک جو فسطائیت کے زیرِ اثر ہیں، ہر وقت جنگ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ روس میں محض امن و امان کا تذکرہ ہے۔

سرمایہ داری کے ماضی کے پیشِ نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکیت کے دلائل زیادہ زوردار ہیں لیکن سرمایہ داری کے نظام میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اشخاص اپنے کاروبار میں محض اس وجہ سے دلچسپی لیتے ہیں کہ وہ ان کا ذاتی کاروبار ہے۔ اس طرح صنعت اور نسلِ انسانی کی کاروباری اہلیت بہت ترقی پا گئی ہے۔ یہ دلچسپی و ترقی نظامِ اشتراکیت کے ماتحت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک فطرتِ انسانی میں انقلاب نہ آ جائے۔ ایک ماہرِ اقتصادیات کا قول ہے کہ "مال کا ذاتی ہونا مٹی کو بھی سونا بنا دیتا ہے۔" روس کے تجربہ کی کامیابی بطور ایک برہانِ قاطع استعمال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ نظامِ اشتراکیت کو دیگر ممالک میں بھی ہر زمانہ میں وہی کامیابی حاصل ہو جو اب روس میں ہوئی ہے۔ روس میں اس تجربہ کی کامیابی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک نہائت ہوشیار اور اولوالعزم قائد اور اُس کے ماتحت عوام کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس میں اشتراکیت کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کی جدید نوعیت کے باعث انتہائی جوشِ عمل موجود ہے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ہنگامی جوش اور موجودہ ہوشیار و اولوالعزم قائد کے فقدان پر بھی یہ نظام کامیاب ہو سکے گا یا نہیں؟

ادھر سرمایہ داری کا نظام محض اشتراکیت کا مُنہ چڑانے یا اس کی خیال آرائی و طرزِ عمل کا تمسخر کرنے سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر سرمایہ دار اپنی حیات کا متمنی ہے تو اُسے موجودہ ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے تبدیل ہونا پڑے گا۔ اُسے ان تینوں آویزشوں کا حل معلوم کرنا ہوگا جو موجودہ زمانہ کے درپیش ہیں۔ اُسے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ نظامِ سرمایہ داری کمزور جماعتوں اور قوموں کے مفاد کو روندے بغیر قائم رہ سکتا ہے۔ اسے اشتراکیت کے اصولِ اقتصادیات سے سبق حاصل کر کے اور صنعت کی موجودہ بدنظمی دور کر کے اپنے اور مزدور کے حقوق کا ایک ایسا بیانیہ تیار کرنا ہوگا جس میں کسی حد تک انفرادی و ذاتی ملکیت بھی قائم رہے۔ شہنشاہیت کو قدیم اصولِ ملکیت کے بدلے نیا اصولِ تولیت اختیار کرنا پڑے گا جو ایک جمہوری مجلسِ اقوام کے تحت بروئے کار آ سکے۔ قبل اس کے کہ ایک بین الاقوامی نظام تمام اقوامِ عالم کے حفظ و امن کے لئے ایسے حالات پیدا کر دے جو فسطائی خطرے کا واحد دفاع ہو سکیں تمام طاقتوں کو اپنے موجودہ تخیلِ خود مختاری میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ اگر سرمایہ دار اس اقدام کے لئے تیار نہیں تو تاریخ ہرگز اس کا انتظار نہ کرے گی۔ یا تو وہ سرمایہ داری کو نیست و نابود کر دے گی یا اگر فرعِ انسانی نہیں تو کم از کم تہذیب ضرور برباد ہو جائے گی۔ تہذیب اس وقت ایک ایسے مقام پر ہے جہاں سے حیات و ممات کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کدھر کا رُخ کرتی ہے۔

ایس۔ ایم۔ اختر اسلامیہ کالج لاہور

رباعی

مٹی کا عجب زنگ جما یا ہوتا
جنت کو بھی مخیا نہ بنایا ہوتا
توبہ کا رہا پاس ہمیں ورنہ کرتا!
گر شیشۂ ضرور منہ لگایا ہوتا

اعجاز

ملنے کا پتہ
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
مکمل فہرست مُفت
طلب کریں۔

تجلّیات

یہی انداز اگر ہے اُس نگاہِ برق آئیں کا
خدا حافظ ہے پھر میری متاعِ صبر و تسکیں کا

بہار اک آئینہ ہے اُن تبسم ہائے شیریں کا
گلستاں ایک پرتو ہے کسی کے حسنِ رنگیں کا

جھلکتا ہے پسینہ اس جبینِ نور افشاں پر
درخشاں آسمانِ حُسن پر ہے خوشہ پرویں کا

سرورِ عشق سے لبریز ہیں دل ہائے مشتاقاں
بھلا کیا پوچھنا ہے اُس نگاہِ کیف آگیں کا

میں لذت آشنائے اضطرابِ عشق ممنوں ہوں
تغافل ہائے رنگیں کا نوازش ہائے شیریں کا

تڑپ جائیں گے میرے سوزِ دل سے آہ جب نکلی
ہے میرے ضبط سے وابستہ انداز اُن کی نگہیں کا

نگاہِ ناز نے سو سو ادا سے کی فسوں سازی
نہ نکلا پر نہ نکلا کوئی پہلو میری تسکیں کا

جہانِ عشق میں بے تابیوں کا شور برپا ہے
جنوں انگیز عالم ہے تمہارے حُسنِ تزئیں کا

نظر افروز ہے ازبس بہارِ بمبئی اکبر
خدا حافظ رہے اِس خطۂ فردوسِ آئیں کا

جلال الدین اکبر

خواب یا حقیقت

خبر نہیں تمہارے گھروں میں کیا دستور ہے لیکن میری بیوی تو فروری ہی میں کہنا شروع کر دیتی ہے "تم نے کچھ فیصلہ بھی کیا کہ اس دفعہ ہمیں جولائی اگست کے دن کہاں گذارنے ہیں" اور جب میں اس کے جواب میں "نہیں" کہہ دیتا ہوں تو وہ اُن اشتہاروں کو جو "مکان کرایہ کے لئے خالی" کے زیرِ عنوان اخباروں میں چھپتے ہیں پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔

ہاں تو! پچھلے سال بھی حسبِ معمول یہی ہوا اور آخر ایک مکان انتخاب کرتے ہوئے اُس نے اخبار میری طرف بڑھایا۔ اشتہار کی تفصیلات یہ تھیں۔ نازوک ——— بلکنگ، وسیع ——— آراستہ کوٹھی ——— باغ ——— موٹر خانہ گھاٹ اور جملہ ضروریات ——— ہاں! ——— اور اسطبل بھی "مکان کا کرایہ بہت زیادہ لکھا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا "لیکن کرایہ بہت زیادہ ہے" کہنے لگی "ہاں اس کے لئے تمہیں مالکِ مکان سے ملاقات کرنی ہوگی۔ اور اُسے کسی نہ کسی طریقے سے کرایہ کم کرنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ یہ لوگ اکثر مان جایا کرتے ہیں" درحقیقت وہ کبھی نہیں مانا کرتے۔ خیر! اس وقت اس طویل جھگڑے میں پڑنا فضول ہے۔ غرضیکہ میں نے مالکِ مکان کو خط لکھ دیا اور اس سے پوچھ بھیجا کہ آیا وہ میرے داخلے ایک رات کے قیام کا وہاں کوئی انتظام کر سکتا ہے یا نہیں۔ میں دراصل اس جگہ کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا اور لکھا کہ وہ فلاں شخص کو میری خدمت کے لئے مقرر کر رہا ہے۔

مبالغہ نہ سمجھئے کچھ ہماری عادت ہی ایسی ہے کہ ہم ہر کام میں سنجیدگی چاہتے ہیں ——— جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی میرے آرام کے لئے بیسیوں جتن کرتی ہے۔ مجھے سر بستر پہ باری باری لیٹنا ہوتا ہے اور اس امتحان کے بعد جو بستر ان میں سے زیادہ آرام دہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ میرے لئے وقف کر دیتی ہے۔

میں طوفانِ برف باری سے بصد مشکل جان بچاتا ہوا کرۂ ارض کے اس ویران ترین حصے پر آ پہنچا۔

پاٹر ہیم پر ریل کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ اور پھر پانچ راستہ جو پانچ میل سے کسی صورت بھی کم نہ ہوگا موٹر لاری پر طے کرنا پڑتا تھا۔ خوش قسمتی سے بڑی خادمہ مسز سٹیلٹن جو میری خدمت کے لئے متعین کی گئی تھی۔ مکان پر موجود تھی۔ اس نے پہلے ہی سے آگ سلگا رکھی تھی اور میرے لئے گوشت کے تکے تیار کر رہی تھی۔ جب تک میں کھاتا رہا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے اوپرشن کا جو اس نے حال ہی میں کرایا تھا تمام حال شروع سے لے کر اخیر تک سنا ڈالا۔ اوپرشن کا ذکر کیا تھا عملِ جراحی پر ایک مفصل تقریر تھی۔ اس دوران میں جو ٹکڑا میں کھا رہا تھا نہ اچھا رہ گیا تھا اور اپنے عمل سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کے بیان کی توضیح کر رہا ہوں۔ آخر کار اس نے خوان میرے سامنے سے اٹھا لیا اور رات بھر کے لئے غائب ہو گئی۔

میں نے مکان اندر سے اچھی طرح دیکھ لیا اور اس کی بیرونی صورت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی۔ تاریکی حد سے زیادہ تھی۔ برف باری کا سلسلہ اگرچہ ابھی تک جاری تھا لیکن پہلے کی بہ نسبت اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ موٹر خانہ کوٹھی کے عقبی دروازے سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ میں چکر لگاتا ہوا اس طرف گیا۔ ابھی لیکن اس میں داخل نہیں ہوا۔ میں گھاٹ کی تصدیق کے لئے نیچے بھی اتر گیا۔ یہ مقام ان تمام لوازمات سمیت گرمیوں کے لئے ہر حیثیت سے بہت موزوں معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ لوگ قطبِ شمالی کے سفر کا عزم آخر کرتے کیوں ہیں ہمیں کیوں نہیں آ جاتے۔

چنانچہ میں کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ آگ کے قریب جا بیٹھا۔ یہ کیسے بتاؤں کہ اس وقت سکوت کی حالت کیا تھی۔ شاید آبی جانوروں نے بھی آج کی رات کہیں اور بسیرا کر لیا تھا۔ کم از کم وہ حرکت نہیں کر رہے تھے۔

گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی ہوں گے کہ مسز۔ اس کا ——— نام ——— کیا ——— تھا ——— سٹیلٹن ——— کے جانے کے بعد مجھے پہلی آواز سنائی دی یہ کسی موٹر کی آواز تھی۔ اگر یہ سیدھی نکل جاتی تو میں اسے دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ وہ سیدھی نہیں گئی بلکہ وہ یہاں تک بھی نہیں پہنچی معلوم ہوتا تھا کہ کہیں درمیان سڑک ہی میں رک گئی ہے۔ اس بات کا بھی میں نے کچھ زیادہ خیال

نہ کیا۔ آخر کار موٹریں کھڑی ہوا ہی کرتی ہیں۔

پانچ یا دس منٹ گزرنے کے بعد میں نے سوچا کہ وہ ابھی تک آگے کیوں نہیں بڑھی۔ میں اٹھا اور کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگا۔ برف باری تھم گئی تھی۔ پھاٹک میں سے کسی روشنی کی شعاع پڑ رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ نظروں سے اوجھل کہیں بڑے بڑے لیمپ روشن ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ذرا باہر نکل کر چہل قدمی کروں اور اس معاملہ کا پتہ بھی لگاؤں۔

میں نے دیکھا کہ میرے پھاٹک سے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر سڑک کے درمیان ایک بڑی سی موٹر کھڑی ہے۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے ایک لڑکی موٹر کے انجن سے چھیڑ چھاڑ کرتی نظر آئی۔ اس کی ظاہری شکل و شباہت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حسین لڑکی ہے لیکن وہ کچھ اس طرح سمور میں لپٹی ہوئی تھی کہ اس کی شکل کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے کہا "معلوم نہیں کیا بات ہے۔ انجن چلتا چلتا خود بخود رک گیا ہے۔ اور اب حرکت ہی نہیں کرتا۔" انجن حقیقت میں رک گیا تھا اور اب ہنڈل یا سلف دونوں میں سے کسی ایک طریقہ پر حرکت ہوتا تھا۔ اسٹیشن کا پرزہ پرزہ میں ہاتھ میں لے اس کے پیچھے کھڑی ایڈیٹر میں کچھ پانی بھی ہے یا خالی ہی پڑا ہے۔" کہنے لگی "اگر پہلے ہمیشہ ہوا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس وقت نہ ہو۔" میں نے کہا "آؤ تھوڑا سا ڈال کر دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے۔" اس نے کہا "پانی کی بجائے برف کیوں نہ استعمال کر لیں۔ لیکن میری یہ مرضی نہیں تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس موقع پر برف استعمال کرنا عقلمندی کے سراسر خلاف ہے۔ اور یہ راز مجھ پر اس وقت ظاہر ہوا جبکہ میں برف کا ایک ٹکڑا لے کر واپس آ رہا تھا یعنی موٹر کی شہ رگ ہی بند ہو جائے گی۔

جب میں اس کی طرف واپس گیا وہ ریڈی ایٹر کا ڈھکنا اتار چکی تھی۔ اور اس میں ابھی ہم نے تھوڑا سا پانی ہی ڈالا تھا ——— حسن اتفاق سے میں نے لڑکی کو پرے ہٹا دیا تھا۔ پہلا چھینٹا بھر پانی جو داخل ہو چکا تھا اُبلتا ہوا سیدھا باہر نکل آیا۔ ہم تھوڑی دیر کھڑے رہے اور جب تمام انجن ٹھنڈا ہو چکا تو ہم نے ایک دفعہ پھر پانی ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر ٹھیرتا ہی نہیں تھا جس رفتار سے ہم پانی ڈالتے تھے اسی رفتار سے نیچے سڑک پر بہہ جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موٹر کو خالی ریڈی ایٹر سے اڑائے پھرتی رہی ہے پھر سٹیشن کا رُخ جانا لازمی امر تھا

جب میں نے اس سے یہ کہا تو کہنے لگی۔

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب مجھے تمام رات یہیں کاٹنی پڑے گی؟"

میں نے کہا "اگر تم میرے غریب خانے پر دیج بج یہ غریب خانہ ہی تھا کیونکہ اس کی چھتیں نئی کو روکنے سے عاجز تھیں، ٹھہرنا قبول کرو تو جس مصیبت کا نقشہ اس وقت تمہاری آنکھوں میں کھنچ رہا ہے۔ اس سے کسی قدر نجات تو تمہیں ضرور مل جائے گی۔ مگر وہ میری بات پر کچھ توجہ ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے گھر کے حال سے واقف تھی نہیں اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا پھر خدا جانے کیوں وہ موٹر کو جہاں کھڑی تھی وہیں چھوڑ کر پیدل چل پڑنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "پیدل جانے کا خیال ہی نہ کرو۔ یہ جگہ تمام آبادیوں سے میلوں دور ہے۔"

اسی وقت ہم نے سڑک پر ایک موٹر کی آواز سنی۔ اگرچہ وہ ابھی ہم سے بہت دور تھی پھر بھی ہم اس کی روشنی کو دیکھ سکتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ ناردنک بالکل میدانی علاقہ ہے اور نظر دور تک کام کر سکتی ہے۔

میں نے کہا "تو تمہاری مشکلیں ابھی حل ہو جائیں گی۔ یہ چیز جو کچھ بھی یہ ہے تمہاری موٹر کو نزدیک ترین کارخانے تک یا کم از کم تمہیں کسی قریب کے ہوٹل میں چھوڑ آئے گی۔"

مجھے اس وقت کی اس خیال سے اسے یقیناً تھوڑی بہت تسکین ہوگی لیکن وہ بالکل ساکت رہی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا منشا کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ رات میرے ہاں بسر کرے۔ اور نہ وہ کسی اور جگہ جانے کے لئے کسی کی ممنون ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس معاملے میں نہایت محتاط معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرے بازو کو پکڑتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ کیا چیز آ رہی ہے؟"

میں نے کہا "چونکہ میں لوواردہوں۔ اس لئے یہاں کی چیزوں کے متعلق میرا قیافہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے لیکن اس کی آواز دودھ والی لاریوں سے بہت ملتی ہے۔"

لاری کے پہنچنے سے پیشتر میں نے چھ پنس نکالے اور کرائے کے لئے اسے پیش کر دیئے۔ اسے کرایہ ادا کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ یہ لاری دودھ کے برتنوں سے لدی پڑی تھی۔ لاری ڈرائیور کو مجبوراً اترنا پڑا۔ کیونکہ لاری کے اندر جگہ نہیں تھی اور اسے برتن ہٹا کر ایک نشست بنانی تھی۔ وہ گاڑی میں سے نیچے اتر آیا۔ اور ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہم نے معاملہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ناروک کو جا رہا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو وہ موٹر کو کھینچ کر وہاں تک لے جانے کیلئے تیار ہے لیکن موٹر کی مالکہ اس تدبیر پر عمل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ

موٹر رات بھر کے لئے میرے موٹر خانے میں جھکیل دی جائے۔ جہاں سے وہ دوسرے دن واپس منگوا لے گی۔ فی الحال وہ لاری میں بیٹھ کر نارو رک تک ہی چلی جائے گی۔

چنانچہ میں نے موٹر خانے کی چابی منگوائی اور لاری ڈرائیور نے دغا بازی اس کا نام دیم تھا) اور میں نے دونوں نے مل کر موٹر کو اندر جھکیل کر دروازے کو قفل لگا دیا اس سے فارغ ہو کر میں نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ آج رات سردی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے بہتر ہوتا کہ تم ذرا گرم ہو جاتے۔ دیم نے میری رائے کی تائید کی۔ میں ان دونوں کو اندر لے گیا۔ اور شراب میں پانی ملا کر تین گلاس تیار کئے۔ کیونکہ میرے پاس سوڈا نہیں تھا۔ قدرتی بات تھی کہ اس ساری تنگ دوندنی میرا ہم بھی بے حس کر دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اوور کوٹ بھی نہیں تھا۔

ابھی تک مجھے اس جوان عورت کے متعلق اچھی طرح غور کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہاں اندھیرا تھا اور دوسرے بگڑی ہوئی موٹر کی طرف توجہ دینا اس وقت زیادہ ضروری تھا لیکن یہ بیان میرے خیال کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مکانکی دماغ کے لئے موٹر کا اس حالت میں پانا باقی چیزوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے —— زیادہ ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن اب اس بات پر بحث کیوں کی جائے۔ اس میٹھک میں جہاں لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے متعلق کوئی قرین قیاس رائے ہی نہیں بلکہ اس کی اصلی حقیقت کا پتہ لگا لینا بھی نہایت آسان تھا۔ اس کی عمر میرے اندازے سے زیادہ تھی اور اس کی آنکھیں ایک دوسری کے بہت زیادہ قریب تھیں۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ —— کہ اس کی حرکات میں سکون اور اطمینان نہیں تھا۔ اور وہ انگریزی بولنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی لیکن حقیقت بات یہ بھی نہیں تھی۔ اس کا سلوک ہمارے ساتھ غیر دوستانہ تھا —— خیر ہم نے کیا بھی کیا تھا کہ ہم اس سے دوستانہ سلوک کی امید رکھتے۔ اس کی طبیعت سے ایک بے سروپا خوف اور اندیشہ ٹپک رہا تھا جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بھاری مصیبت کا سامنا کر رہی ہے اور وہ سائے میں بیٹھنے کو اس قدر ضروری سمجھتی تھی کہ اگر میں نے لیمپ کو پرے نہ ہٹا لیا ہوتا تو وہ آگ کے قریب بھی نہ بیٹھتی اور جس طریقے سے اس نے جلد ہی اور گھبراہٹ ڈال کر بیچارے دیم کا گلاس ختم کرایا۔ کافی تکلیف دہ تھا جب وہ گاڑی سٹارٹ کرنے باہر نکل گئی تو میں نے لڑکی سے دریافت کیا کہ اسے اور پیسوں کی ضرورت تو نہیں۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ اسے ضرورت نہیں پھر وہ رخصت ہو گئے اور میں دروازوں کو بند کر کے اندر چلا آیا۔

میں نے دیکھا کہ میرے سونے والے کمرے میں ٹوکل گائیڈ کی ایک جلد جس میں چند نقشے بھی تھے پڑی تھی۔ میں نے ان کو دیکھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ عورت موٹر میں بیٹھ کر آئی کہاں سے ہے۔ یہ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سڑک نہایت غیر اہم معلوم ہوتی تھی یعنی یہ سڑک۔ صرف وہی شخص اختیار کر سکتا تھا جو لوگوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہو۔ مثلاً ایسا آدمی جو چوری کی ہوئی موٹر بھگا رہا ہو اور یہ تصور خاصا سنسنی خیز تھا۔ میں نے سوچا کہ موٹر کو ایک مرتبہ اور دیکھ لینا بہتر ہوگا۔ چنانچہ میں نے دوسری دفعہ جا کر باورچی خانہ کی الماری میں سے چابی لی اور باہر برفانی فضا میں نکل آیا۔ رات سیاہی کی طرح تاریک تھی اور فضا اتنی ساکن کہ میری بتی کا شعلہ بھی بشکل جھلملاتا تھا۔ یہ موٹر خانہ بہت بڑا نہیں تھا اور موٹر نے تقریباً ساری جگہ روک لی تھی —— ہاں اور ہم نے موٹر کو اس طریقے سے اندر جھکیلا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ بآسانی باہر نکل آئے۔

انجن تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ اس لئے میں دیوار کے ساتھ گرد پھرتا ہوا موٹر کے پچھلے حصہ کی طرف جا پہنچا میں نے صرف قفل کو ابھی موڑا ہی تھا کہ کسی چیز نے دروازے کو اندر سے دھکیل کر کھول دیا۔ اور —— نہ جانے کیا چیز —— باہر نکل کر مجھ پر آ گری۔ یہ مجھے زور سے پیچھے دیوار میں میخ کی طرح گاڑے ہوئے تھی اس نے میری شمع بھی میرے ہاتھ میں سے گرا دی اور میں اندھیرے میں رہ گیا جس سے مجھے کسی قدر تکلیف محسوس ہوئی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر یہ چیز ہو کیا سکتی ہے جو مجھ پر اس طرح لدی جا رہی ہے —— میں نے اس کو کھینچا اور جب اچھی طرح ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی ہے —— مردہ آدمی —— اور اس کی مونچھیں بھی ہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ عین دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا میں نے بہ طریق احسن اسے اندر رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیا۔ دیر تک موٹر کے نیچے ہاتھ مارتے رہنے کے بعد آخر مجھے بتی مل گئی میں نے اسے روشن کیا اور دوسری طرف جا کر اس کے سامنے والا دروازہ کھول کر چھت کا چھوٹا لیمپ روشن کیا۔ کیونکہ آخر مجھے کسی نہ کسی طریقہ سے معائنہ بھی کرنا تھا۔ وہ بے حد لمبا اور دبلا شخص تھا میرے خیال میں چھ فٹ تین انچ سے ضرور کچھ زیادہ ہوگا۔ وہ سیاہ رنگ اور مردانہ صورت تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندگی میں کبھی اتنا کریہہ منظر دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ وہ ایک سپاہیانہ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اس کی موت کی وجہ معلوم کرنی مشکل نہیں تھی۔ اس کی پیٹھ پر گولی لگی ہوئی تھی۔ گولی کا سوراخ دائیں بازو کی ہڈی کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں بالکل وہیں —— اور یقیناً گولی سیدھی پھیپھڑے کے اندر گھس گئی تھی۔

اس کی جیبوں میں نہ تو کوئی کاغذ تھا اور نہ اس کے کپڑوں پر کسی درزی کا نام۔ لیکن اس کے پاس ایک بٹوا تھا اور اس میں نو پونڈ تھے۔ یہ منظر اور

بھی المناک تھا۔ یہ درست ہے کہ خدا کے کاموں میں دخل دینا ٹھیک نہیں لیکن جو بھی اس نظارے کو دیکھتا یہ کہنے سے نہ رُک سکتا کہ یہ واقعہ نہ ہوتا تو اچھا تھا یہ بات کسی قدر پُراسرار بھی تھی ——— اسے کس نے قتل کیا تھا؟ یہ قرین قیاس نہیں تھا کہ لڑکی اس کے ساتھ آس پاس کے دیہات میں تفریح کیلئے سواری کر رہی تھی اور اگر کسی اور نے اسے قتل کیا تھا تو اُس واقعہ کے متعلق ذکر کیوں نہیں کیا تھا؟ نہیں اس نے نہیں کیا تھا۔ اور اب وہ جا چکی تھی اس لئے فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں کوئی ٹیلیفون نہیں تھا۔ میں نے موٹر خانے کے دروازے کو قفل لگا دیا اور اپنے بستر پر جا لیٹا۔ اس وقت دو بج رہے تھے۔

دوسرے دن کسی وجہ سے میری نیند صبح سویرے ہی کھل گئی۔ اور مجھے اٹھتے ہی جو پہلا خیال سوجھا وہ یہ تھا کہ میں جا کر ان چیزوں کو دن کی روشنی میں سمز سیلیٹن کے آنے سے پہلے ہی دیکھ آؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پہلی بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ گزشتہ رات بہت زیادہ برف پڑی ہے کیونکہ کسی جگہ پر نہ تو پہیوں کی لکیریں نظر آتی تھیں اور نہ پاؤں کے نشان اور دوسرے یہ کہ میں چابی موٹر خانے کے دروازے پر ہی بھول آیا تھا۔ میں اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی موٹر تھی۔ نہ کوئی انسان نہیں وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش پر جہاں بتی گری تھی۔ موم کا ایک نامعلوم سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا اس سے پہلے میرے وہاں داخل ہونے کا اور کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ دو باتوں میں سے ایک تو لازمی طور پر ہوئی ہوگی۔ یا تو رات کے وقت کوئی آیا تھا اور موٹر لے کر بھاگ گیا تھا۔ یا میں آگ کے سامنے سو گیا ہونگا اور یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہوگا۔

پھر مجھے شراب کے گلاسوں کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک بیٹھک میں پڑے ہونے چاہئیں۔ میں ان کو دیکھنے کے لئے پیچھے مڑا۔ وہ تینوں وہیں موجود تھے۔ پھر یقیناً یہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ سچ مچ کوئی وہاں آیا تھا اور موٹر لے اڑا گیا تھا۔ لیکن اگر حقیقت تھی تو انھوں نے حیرت انگیز خاموشی سے کام لیا ہوگا۔ لڑکی نے اپنا گلاس انگیٹھی پر رکھا تھا۔ اور اس پر اس کی انگلیوں کے نہایت باریک اور صاف نشان نظر آ رہے تھے۔ ان نشانات میں سے چند میرے بھی تھے۔ کیونکہ پہلے تو میں جا کر باورچی خانے سے گلاس لایا تھا۔ اور پھر اس میں اس کے لئے شراب ڈالی تھی۔ لیکن اس کے ——— اس کی انگلیوں کے نشان صاف تھے اور میرے ہلکے۔ اس لئے ان دو قسم کے نشانوں کا الگ الگ تمیز کر لینا مشکل نہیں تھا۔ کیا اس بات پر توجہ دلانا ضروری نہیں کہ مذکورہ گلاس کا ہی ہم جنس یقیناً وہ قتل یا اسی قسم کا کوئی اور معاملہ تھا۔ اور لڑکی اگر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے پی قتل نہیں کیا تھا تب بھی وہ اس کے متعلق سب کچھ جانتی ہوگی اور اب جو کچھ بھی شہادت کے طور پر پہنچ چھوڑ گئی تھی پولیس کو جوا کرنا چاہئے تھا اور جو کچھ وہ چھوڑ گئی تھی وہ صرف یہ نشان تھے میں نے گلاس کو بہ احتیاط تمام ایک پرانے بسکٹوں کے ڈبے میں محفوظ کر لیا۔

جب مسٹر سیلیٹن آئی میں نے اس سے اپنا حساب صاف کیا اور شہر واپس چلا آیا۔ میں نے راستے میں مالک مکان سے بھی ملاقات کی اور اس سے کہا کہ میں مکان کے متعلق اُسے چند روز بعد لکھوں گا۔ چنانچہ میں گاڑی پر سوار ہو گیا اور تین وقت پر سکاٹ لینڈ یارڈ کے اسٹیشن پر آ پہنچا۔ میں اوپر چڑھ گیا اور اپنے ایک دوست سے ملاقات کی۔ میں نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ کیا اس کے ماہرین ان نشانوں کو پہچان سکتے ہیں۔ اس نے کہا "شاید نہیں" لیکن اس نے اُسے تفتیش نشاناتِ انگشت کے شعبے میں بھیج دیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ مجھے یہ کہاں سے ملا ہے۔ میں نے کہا جلدی کیا ہے پہلے شناخت تو ہو لینے دو" اُسنے کہا "بہتر" یہ لوگ خوفناک پھرتی سے کام لیتے ہیں ——— بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے کہ ان کا کلرک ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ لئے ہوئے واپس آ گیا۔ وہ لڑکی کو اچھی طرح جانتے تھے انھوں نے مجھے اُسکا نام اور اسکی اصلی تصویر دکھائی۔ وہ ایک نہایت جاہل عورت تھی جسنے ہوش سنبھالنے کے بعد جو پہلا پیشہ اختیار کیا وہ اٹھائی گیرے کا تھا اور وہ زیادہ تر کرنال کی وکانوں پر ڈاکے مارا کرتی تھی۔ اسکے بعد اس نے ڈاکوؤں کی ایک جماعت کے کسی رکن سے شادی کر لی۔ میرے دوست نے ابھی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پھر ڈاکوؤں کے درمیان میں لڑائی ہو گئی اور اس لڑائی کے دوران میں اسکی دوست گولی کا شکار ہو گیا پھر اس عورت نے لاش کے ٹھکانے کا انتظام کیا۔ لیکن موٹر خانہ نوک کے قریب پہنچ کر بگڑ گئی۔ وہ موٹر اور اس دوست کی لاش وہیں کسی کے موٹر خانے میں چھوڑ گئی اور خود لاری پر سوار ہو کر نارک کی طرف چلی گئی۔ مگر وہ نارک تک پہنچ نہ سکی۔ راستے میں لاری پھسل گئی اور وہ عورت اور لاری ڈرائیور ——— جس کا نام ولیم تھا کود کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے سر ایک پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرا کر پس گئے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ یوں کرنا موت کا پیغام ہوتا ہے۔ کم از کم ان کے حق میں تو ایسا ہی ثابت ہوا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ یہ تمام باتیں ٹھیک ہیں فرق اتنا ہے کہ تم یہ سب واقعات جان نہیں سکتے کیونکہ تمہیں گزرے کوئی زیادہ مدت نہیں ہوا ——— یہ واقعہ گزشتہ رات کا ہے"

وہ کہنے لگا "یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۱۵ء کا ہے جن آدمیوں کا تم نے ذکر کیا ہے۔ انھیں مرے ہوئے سالہا سال گزر چکے ہیں"

یہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مگر پھر مجھے رہ رہ کر ان جلادی سکوں کا خیال آنے لگا جو میں نے مقتول کی جیب میں دیکھے تھے۔

محمود احمد خاں

آزادی

ہندوستان سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے جوں جوں ترقی کر رہا ہے لفظِ آزادی کا استعمال بھی زیادہ ہو رہا ہے۔ لفظ آزادی کئی ایک معانی میں استعمال ہو رہا ہے اور ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں:۔

اوّل انفرادی آزادی بمقابلہ انفرادی غلامی۔ ان معنی میں آزادی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کوئی فرد اپنے جیسے کسی اور شخص کی ملکیت نہیں اور اُسے وہ تمام حقوقِ انسانی جو امارت میں افراد کو حاصل ہوں ملے رہتے ہیں۔

دوم حقِ شہریت۔ ان معنی میں زبانِ انگریزی میں آزادی کے مرادف لفظ "لبرٹی" ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ تمام آسانیاں سہولتیں اور حقوق دربارہ تحفظِ جان و مال ہیں جو فرد کو امارت کے تابع فرمان رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اوروں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے فرد کا اپنے آپ پر بعض عام پابندیاں اور قیود عائد کرنا تاکہ اور لوگ بھی اُن کے معاوضہ میں اس کے ایسے ہی حقوق کا احترام کرتے ہوئے اُن کے تلف کرنے سے باز رہیں۔

سوم بمعنی بے تکلفی۔ جسارت

چہارم قومی آزادی۔ یعنی کسی ملک کے کسی غیر قوم کے زیرِ حکومت نہ ہونے اور اندرونی و بیرونی تمام معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق سرانجام دینے کی حالت۔

پنجم حقوقِ خصوصی۔ خاص حق جو عام لوگوں کو حاصل نہ ہوں اور کسی کسی کو حاصل ہوں۔ مثلاً کسی شخص کو حکومت کی طرف سے یا کسی مقامی ادارہ کی طرف سے یہ حق مل جانا کہ وہ کسی خاص رسوم یا محاصل کی ادائیگی سے آزاد ہے یا کوئی اور بات جس کے کرنے کی اوروں کو ممانعت ہو لیکن اس کو آزادی۔

ششم بمعنی رسم و رواج سے لاپروائی۔ ان معنی میں لفظ "آزادی" کا ان دنوں عام استعمال ہو رہا ہے۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں کے سلسلہ میں۔

ہفتم بے آئینی۔

ہشتم سیاسی آزادی۔ افراد کو حقِ رائے دہی کی ادائیگی سے حکومت میں حصہ دینا۔

لفظِ آزادی کے مرقومہ صدر معانی میں سے صرف دو سب سے زیادہ اہم اور اس قابل ہیں کہ ان پر کسی قدر مفصل بحث کی جائے۔

قومی آزادی

قومی آزادی کا تعلق امارت سے ہے۔ جس طرح ایک فرد اپنے کاروبار میں آزاد ہونا پسند کرتا ہے۔ اُسی طرح ایک ملت بھی امارت کے کاموں میں خود ہی اپنے سیاہ و سفید کی مالک بننا پسند کرتی ہے۔ اگر فرد کسی اور کے تابع فرمان رہنا عزتِ نفس کے خلاف خیال کرتا ہے تو ملت بھی اپنے آپ پر غیر ملکی حکومت کو ملی وقار کے منافی سمجھتی ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسی قوم نہ تو اب تک ہوئی ہے اور نہ ہے جس نے کسی غیر ملکی حکومت کو برضا و رغبت قبول کیا ہو اور اس کے تابع فرمان مطمئن رہی ہو محکوم اقوام کو جذبۂ ملی کسی نہ کسی صورت میں برانگیختہ رکھتا ہے۔ اور وہ شورش و اضطراب پیدا کرتی رہتی ہیں۔ جب تک ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ ہندو شورش اور بغاوت کرتے رہے اور جب مغلیہ حکومت کمزور ہو گئی۔ ہندو مراکز میں خود مختار ہندو حکومتیں قائم ہو گئیں۔

مالینڈ اور مجیم والے ایک عرصہ تک سپین اور کنزبری کے خلاف جنگِ آزادی لڑتے رہے اور بالآخر آزاد ہوئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی انگلستان کی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بذریعۂ جنگ آزادی حاصل کی۔ زمانۂ ماسبق میں باشندگانِ سپین اسلامی حکومت سے مطمئن نہ تھے اور انہوں نے بھی جب موقع پایا اسلامی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور آزاد ہو گئے۔

اِسی طرح اہلِ روم کے خلاف مصر اور ان کے دیگر مقبوضات میں شورشیں برپا ہوتی رہیں اور بالآخر رومن حکومت کے کمزور ہونے پر جس جس کو

موقع ملا آزاد ہو گیا۔

ایشیا میں اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ترکی حکومت سے نجات پانے کے لئے اہلِ عرب نے بغاوت کی۔ آئرلینڈ کئی صدیوں تک انگلستان کی حکومت کے خلاف شورش کرتا رہا۔ کئی دفعہ وہاں بغاوتیں ہوئیں اور متعدد بار اُسے فتح کرنا پڑا۔ وہاں کے باشندے ہمیشہ مضطرب رہے۔ اور اپنے آپ کو انگلستان کے ظلم و ستم کا شکار سمجھتے رہے۔ بڑی جدوجہد سے انہوں نے ہوم رول حاصل کئے جو کم و بیش آزادی کے مرادف ہیں۔

اس کے علاوہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندے ملکی آزادی نہیں چاہتے بلکہ کسی اور طاقتور ملت کے ساتھ شامل ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سکاٹ لینڈ والے اگرچہ ایک عرصۂ دراز تک انگلستان کے خلاف معرکہ آرا رہے۔ لیکن بالآخر انہوں نے انگلستان کے ساتھ الحاق کو اپنے لئے فائدہ مند جانا اور الحاق کے بعد اُن کی حالت پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو گئی۔ کنیڈا والوں نے بھی سلطنتِ برطانیہ میں شامل رہنے کو ملکی آزادی پر ترجیح دی۔ اس وقت انہیں وفاقی درجۂ حکومت حاصل ہے اور وہ ہر لحظہ آزاد ہیں۔ انگلستان بھی اُن کے معاملات میں دخل در معقولات نہیں کرتا۔

کینیڈا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہمسایہ ہے۔ لیکن جہاں موخرالذکر نے مکمل آزادی کو ترجیح دے کر انگلستان کے خلاف بغاوت کی اوّل الذکر نے انگلستان کے ساتھ شامل ہونا پسند کیا اور اسی شمولیت سے اُسے فائدہ بھی کافی پہنچا۔

ہندوستان میں انگلستان کی حکومت قائم ہے۔ اور ہندوستان وفاقی درجۂ حکومت حاصل کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ اس کے لئے جہاں آئینی جہاد کیا جاتا ہے وہاں غیر آئینی کارروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ غیر آئینی کارروائیاں کرنے والے اگرچہ معدودے چند ہیں لیکن اُن کے خیال میں مکمل آزادی زیادہ مفید اور عزت بخش ہے۔ وفاقی درجۂ حکومت کے حامیوں کی تعداد مقابلۃً سب سے زیادہ ہے اور وہ اپنی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور جانتے ہوئے کہ ہمسایہ ممالک کے ہاتھوں اُن کی آزادی کا سلب ہو جانا قرین قیاس ہے۔ وفاقی درجۂ حکومت کو ہی اپنے حق میں بہتر خیال کرتے ہیں۔

ان مثالوں کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکمل غلامی کی حالت میں کوئی ملک کبھی خوش نہیں رہ سکتا اور بعض صورتوں میں بعض محکوم ممالک غلامی کے مقابلہ میں آزادی چاہتے ہیں اور بعض حکمران ملک کے مساوی حقوق حاصل کر کے اُس کے ساتھ شامل رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اُن حالات کی تشخیص جن کی بنا پر ملک مکمل آزادی اور وفاقی درجۂ حکومت کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے گئے ہیں ضروری نظر آتی ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے تعلیمی و سیاسی لحاظ سے ترقی یافتہ ہوں اور اُن کے متحد ہونے یا متحد ہو جانے کی توقعات کافی سے زیادہ ہوں اور ملک کے تمام مفاد آزادی ہی سے وابستہ ہوں تو ایسا ملک مکمل آزادی کو ہی اپنا نصب العین بنائے گا لیکن اگر کوئی ملک بلحاظ ادبی تعلیم اور سیاسی ترتیب پس ماندہ ہو اور لسانی، مذہبی، نسلی، تمدنی اختلافات کی بنا پر اُس کے باشندوں کا متحد ہونا بھی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں غیر ملکی حکومت اُن کے اقتصادی مفاد کو نظر انداز کرتی ہوئی اُسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائے وہ مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنانے سے باز رہتا ہی رہے گا۔ کیونکہ اس کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہوگا کہ مکمل آزادی حاصل کر کے وہ اُسے قائم نہیں رکھ سکے گا۔ کوئی ایسا ملک وفاقی درجۂ حکومت ہی کو اپنا نصب العین بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ملک جس کے باشندوں کا مذہب تہذیب و تمدن اور زبان ایک ہو وفاقی درجۂ حکومت کو نصب العین بناتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُسے اس بات میں اپنے آپ پر پورا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ وفاقی درجۂ حکومت حاصل کر کے اُن حقوق کو جو اُسے حکمران ملک کے مساوی حاصل ہوں گے اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے کا مجاز ہوگا۔ اور حکمران ملک ان حقوق کی بلاواسطہ یا بالواسطہ قطع و برید سے قاصر ہوگا۔ کینیڈا نے اس خود اعتمادی کی بنا پر وفاقی درجۂ حکومت کو ترجیح دی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیروی میں مکمل آزادی یعنی سلطنتِ برطانیہ سے علیحدگی کو پسند نہ کیا۔ ہندوستان ایسے ملک کے لئے جسے زبان، مذہب، تہذیب و تمدن کی یکسانیت حاصل نہیں وفاقی درجۂ حکومت ہی سیاسی نصب العین ہو سکتا ہے۔ اگر کسی ایسے ملک کی ہمسایہ اقوام ملک کے مختلف قطعات پر آباد ہوں اور اُن کی حد بندی بھی ممکن ہو تو اُن کے لئے ملکی تقسیم کے بعد وفاقی درجۂ حکومت مفید یا مکمل آزادی کا نصب العین قابلِ حصول ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہمسایہ اقوام ملک کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں آباد نہ ہوں بلکہ ان کی آبادی ملی جلی ہو تو یہ بات حکمران قوم کے لئے مفید ہوگی۔ اگر ایسا ملک وفاقی درجۂ حکومت بھی حاصل کرے تو اس کے تحت اُسے جو حقوق ملیں گے وہ ادنیٰ قسم کے ہوں گے۔ ہمسایہ اقوام ایک دوسری کے خلاف ریشہ دوانیوں سے باز نہیں رہیں گی اور اس طرح حکمران قوم

کو مواقع دیتی رہیں گی کہ وہ وفاقی درجۂ حکومت سے حاصل ہونے والی تمام برکات سے انہیں محروم رکھے۔

سیاسی آزادی

سیاسی آزادی صرف اُن ممالک کے باشندوں کو حاصل ہوتی ہے جن کی حکومت اصول جمہوریت کے مطابق قائم ہو۔ مطلق العنان حکومتوں کے ماتحت باشندوں کو سیاسی آزادی نہیں دی جاتی۔ سیاسی آزادی سے مراد وہ حقوق ہیں جو عوام کو حکومت کے قائم کرنے۔ اُس کے اساسی قانون تیار کرنے اور اُس قانون میں تغیر و تبدل کرنے اور حکومت کے دیگر انتظامی کاموں کی نگہداشت کرنے کے بارے میں دیئے جاتے ہیں۔ ان حقوق کو اگر فرداً فرداً ہر شخص استعمال کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ استعمال کا طریقہ جو عام طور پر تمام جمہوریت پسند ممالک میں رائج ہے یہ ہے کہ افراد کو حق دیا جاتا ہے کہ وہ کونسلوں کے لئے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ کونسلوں کا کام نئے قانون بنانا۔ بوقتِ ضرورت پرانے قانونوں کی ترمیم یا تنسیخ کرنا اور حکومت کے مختلف محکموں کے اخراجات کی منظوری دینا ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں اور اس کے کاموں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

(میاں) **کفایت علی**

بمبئی کلاتھ ہوس

ہر قسم کے سرد اور گرم کپڑے کی بہت بڑی دکان ہے جہاں سے آپ اپنے لئے۔ اپنی مستورات اور بچوں کے لئے ہر قسم کا سرد اور گرم کپڑا بارعایت خرید سکتے ہیں!

موسم سرما کے! ——— گرم سوٹوں کیلئے

بمبئی کلاتھ ہوس کو یاد فرمائیے

پروپرائیٹر۔ بمبئی کلاتھ ہوس۔ انارکلی۔ لاہور

غزل

ہر قدم پر وہ نیا فتنہ اٹھاتے آئے
دل جو پایا اُسے مٹی میں ملاتے آئے

محفلِ حشر ہے یہ جلوہ گہہِ خاص نہیں
اُن کے دیوانے کہاں خاک اُڑاتے آئے

اُٹھے اُس در سے مگر دل کو مٹا کر اُٹھے
آئے تو اُس کو ٹھکانے سے لگاتے آئے

دلِ پُرسوز کو چھوڑ آئے ہیں جلنے کے لئے
ہم بھی اُس بزم میں اک شمع جلاتے آئے

بن گیا ہے دل بے تاب ہر اک ذرّۂ قبر
آپ آئے بھی تو اک حشر اُٹھاتے آئے

اُٹھ کر اُس بزم سے آنا ہمیں دشوار ہوا
راستے بھر دلِ مضطر کو مناتے آئے

آئے کاشانۂ دل میں مرے یوں حضرتِ عشق
دُور سے مژدۂ آفات سناتے آئے

دل جلے جاتے ہیں ہر سمت سرِ راہ گذر
وہ جدھر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے

آتے تھے بارگہہِ پیرِ خرابات سے ہم
راستہ کعبے کا زاہد کو بتاتے آئے

دیکھ اے نجمؔ ذرا نقشِ کفِ پا کی بہار
وہ سرِ راہ گذر پھول کھلاتے آئے

نجمؔ ندوی بی اے

شہزادیوں کی شاعری

اردو جیسا کہ عام خیال ہے شاہانِ مغلیہ کی وجہ سے بنی اور اسی سلطنت کے زیرِ سایہ پروان چڑھی، گو شاہانِ مغلیہ اسے سرکاری زبان نہ بنا سکے مگر پھر بھی دہلی کے آخرین فرمانرواؤں نے اردو کی بڑی خدمت کی، بادشاہوں کی اسی اردو نوازی کی وجہ سے اردو نے حرمِ شاہی میں بھی بار پایا اور محلات میں بھی اس کا چرچا ہو گیا، اردو کی ترقی شعری حیثیت سے بہت ہوئی چنانچہ بادشاہوں، وزیروں، امیروں کے دوش بدوش محلاتِ شاہی اور بیگمات نے بھی اردو شاعری میں حصہ لیا اور برابر شعر کہتی رہیں، چنانچہ بعض بڑی اچھی شاعرات گزری ہیں، مگر افسوس ہے کہ نہ تو کوئی ایسی شعری تاریخ مرتب کی گئی جس میں شہزادیوں اور بیگمات کی شعر و شاعری کا حال ہو اور نہ کوئی ایسا تذکرہ ہی لکھا گیا جو اس موضوع پر مکمل معلومات بہم پہنچا سکے، یوں تو اردو شعر کہنے والی عورتوں کے چار چھ تذکرے ملتے ہیں مگر افسوس ہے کہ کوئی تذکرہ بھی ایسا نہیں جو حقیقی معنی میں تذکرہ کہلانے کے مستحق ہو، تذکرۃ النساء (مادری) سے لے کر تذکرۃ الخواتین (آسی) تک دیکھ ڈالئے کوئی کارآمد چیز نہیں ملے گی بلکہ جتنی تلاش و تفحص کی جائے اتنی الجھن پیدا ہوتی جائے گی۔

مدت سے ہمارا خیال تھا کہ اردو کی صرف اُن شاعرات کے حالات اور کلام کا نمونہ ایک جگہ کیا جائے جو محلاتِ شاہی یا شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، مدت کی تلاش اور جستجو کے بعد ہم آج اپنے مرتبہ مواد کو پیش کر رہے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے خاندانِ شاہی کی ساری شعر کہنے والی خواتین کے حالات جمع کئے ہیں، کیونکہ مواد نہایت منتشر اور میدانِ تحقیق بہت ہی تنگ ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اور نام بھی مل سکیں۔

اس مضمون کی ترتیب کے لئے خوش نصیبی سے ہمیں بعض نایاب بلکہ ناپید تذکرے اور بعض اہم یادداشتیں استاذی مولانا تمکین کاظمی صاحب کے پاس سے مل گئیں، کیونکہ آپ نے اردو شعر کہنے والی عورتوں کا ایک مفصل اور مبسوط تذکرہ ترتیب دینا شروع کیا ہے جس کے لئے بڑی محنت اور کاوش سے نایاب اور کمیاب تذکرے اور دواوین وغیرہ فراہم کئے ہیں، اس امداد کے لئے میں مولانا کا ممنونِ احسان ہوں۔

فطرت نے عورت کو نہ صرف صنفِ لطیف بنایا ہے بلکہ اس میں وہ تمام لطافتیں جو دنیا میں ہو سکتی ہیں ودیعت کی ہیں، چنانچہ فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری، اور شاعری کا ذوق عورت کی فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ عورت نے ان تینوں لطیف فنون میں کتنی جان ڈال دی، یونانی ادب میں سے اگر سیپھو کے اشعار نکال دئے جائیں تو یقیناً یونانی ادبیات کی نمایاں خصوصیت زائل ہو جائے گی، ایامِ عرب کی بعض شعر گو خواتین کا کلام اگر ضائع کر دیا جائے تو عرب کے دورِ جاہلیت کی تاریخ سراپا جاہلیت نظر آئے گی، اسی طرح دنیا کی ادبیات میں عورت کا حصہ بہت نمایاں رہا ہے۔ ہندوستان میں مصوری کا کچھ ایسا گلا گھونٹا گیا کہ عورتیں تو عورتیں، مرد بھی اس کے پاس پھٹکتے ہوئے جھجکتے رہے، قریب قریب یہی حال موسیقی کا بھی ہوا، مردوں نے اس طرف بہت کم اعتنا کی مگر عورتوں نے اس فن کو زندہ رکھا، شاعری کا بھی یہی حشر ہوتا جو مصوری کا ہوا، مگر خداجنت نصیب کرے نور جہاں اور زیب النساء کو ان دونوں نے شاعری میں ایک روح پھونک دی، گو نور جہاں کی شاعری کے کوئی مستقل اور اعلیٰ نمونے ہمارے سامنے نہیں ہیں اور نہ زیب النساء کا زیادہ کلام ہے (کیونکہ زیب النساء کے نام سے جو دیوان مشہور ہے وہ مخفی شیرازی ایک ایرانی شاعر کا ہے) مگر پھر بھی ان دونوں خواتین کا تھوڑا بہت کلام اور ان کی شاعرانہ سرپرستیوں کی روایات ہم تک پہنچتی ہیں، گو یہ فارسی میں شعر کہتی تھیں مگر ان کی شاعری بعد میں محلات کی بیگمات اور شریف خواتین کے لئے [illegible] بن گئی اور انہوں نے ان دونوں کی مثال دے دے کر اپنے شاعرا[illegible] کو جاری رکھا، چنانچہ آئندہ اوراق میں آپ کو مغلیہ گھرانے کی گھر[illegible]

کا کلام ملے گا۔

اِن شہزادیوں نے نہ صرف خود شاعری کی بلکہ شعرا کی سرپرستی بھی کی ہے نواب آصف الدولہ کی بیگم نواب بہو بیگم صاحبہ تھیں نے بڑی سرپرستی کی، لکھنؤ کے بعض اچھے شعرا اسی سرکار کے متوسل تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیۂ بھوپال نے نہ صرف خود شعر کہے بلکہ اکثر شعرا کی سرپرستی بھی کی اور خواتین میں شاعری کا چرچا کیا، واجد علی شاہ کی محل خاص عالمہ نہ صرف خود بڑی اچھی شاعرہ تھیں بلکہ ان کی سرکار میں کئی ایک شاعر مرثیہ خوانی کے سلسلہ میں پرورش پاتے تھے، اسی طرح بیشتر شہزادیوں نے شعری خدمت اور سرپرستی کی ہے۔

آج صرف دو شہزادیاں ایسی ہیں کہ جن کو ہم شاعرہ کی حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں (۱) بلکۂ دکن حضرت دلہن پاشا صاحبہ اعجاز (۲) ہر ہائی نس بیگم صاحبہ رام پور عصمت، ان دونوں مخدرات کے علاوہ اور شہزادیاں ایسی نظر نہیں آتیں جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتی ہوں، بدنصیبی سے اردو کی جگہ انگریزی لیتی جا رہی ہے۔ مرد تو خیر مجبور ہیں انہیں کاروبار ہی اور ملازمتی مزوریات کے لحاظ سے انگریزی بولنا اور لکھنا پڑتا ہے مگر حیرت ہے عورتوں پر جو بلا ضرورت انگریزی کی طرف کھنچی جا رہی ہیں، ہم اردو کو اپنی مادری زبان اس لئے کہتے ہیں کہ ہم نے جس ماں کی گود میں پرورش پائی اس کی زبان اردو تھی، مگر ہمارے بچے، خدا جانے اردو کو مادری زبان کہنے کے مستحق ہوں گے یا نہیں! کیونکہ وہ جس ماں کی گود میں پرورش پائیں گے اس کی زبان اردو نہ ہوگی یا اردو ہوگی بھی تو ایسی جس کا غالب حصہ انگریزی ہوگا، کیا ہم اس کے متعلق اپنی ہندوستانی ماؤں، بہنوں کو متوجہ کر سکتے ہیں؟

اس مضمون کو ہم نے شہزادیوں کے تخلص کے اعتبار سے حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا ہے کیونکہ اکثر شہزادیوں کے سنین ہمیں مل نہ سکے اور بعضوں کے متعلق تو زمانے کا تعین تک نہ ہو سکا اس لئے ہمیں افسوس کے ساتھ ایسی ترتیب قائم کرنی پڑی،

اعجاز

حضرت بلکۂ دکن دلہن پاشا صاحبہ قبلہ دام اقبالہا، آپ نواب جہانگیر جنگ بہادر ابن نواب حیدر الدولہ حیدر جنگ بہادر ابن نواب حیدر الملک رفیع الدولہ کی صاحب زادی ہیں، آپ کی دادی راحت النساء بیگم صاحبہ قبلہ نواب روشن الدولہ (خلف عفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر) کی صاحبزادی تھیں، آپ کے والد اعزاز مرشد زادگی، جاگیر، منصب اور خطاب سے سرفراز تھے، آپ کی تعلیم و تربیت والد بزرگوار ہی کے زیر نگرانی ہوئی، آپ کا عقد مبارک حضور بندگان عالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر دام اللہ ملکہ و سلطنتہٗ سے ۱۹ صفر ۱۳۲۴ھ (۱۵ اپریل ۱۹۰۶ء) کو (جبکہ بندگان عالی ولیعہد دکن تھے) حضرت نواب میر محبوب علی خاں نے بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے فرمایا، ۸ محرم ۱۳۲۶ھ کو آپ کے بطن مبارک سے والاشان نواب اعظم جاہ میر حمایت علی خاں بہادر ولی عہد و سپہ سالار عساکر آصفی کی ولادت عمل میں آئی اور ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ کو والاشان نواب معظم جاہ بہادر کی ولادت باسعادت ہوئی، آپ نے ۱۳۵۴ھ میں فریضۂ حج بھی ادا فرمایا،

آپ کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی ہے اور علمی ادبی انہماک بھی رکھتی ہیں فکر شعر بھی گاہے گاہے فرماتی ہیں:

اُن کو عہد وفا کی لاج نہیں — درد دل کا کوئی علاج نہیں
حال عاشق کبھی سناؤ کرو — کیا حسینوں میں یہ رواج نہیں
دو ہی دن میں بدل گیا وہ رنگ — کل جو تھا لطف مجھ پہ آج نہیں
بوئے گیسو صبا جو لائی ہے — دل کو تسکیں ہے اختلاج نہیں
سچ ہے اب خسرو دکن کے سوا — کوئی شاہان تخت و تاج نہیں
سارا عالم ہے بندۂ اخلاق — کوئی سلطان سلوتش مزاج نہیں
درد دینے لگا مزا دل کو — اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
کیا بنے عشق ان سے اے اعجاز — سنگ و شیشہ میں امتزاج نہیں

یہ قصیدہ بیگم صاحبہ نے مدینۂ طیبہ میں موزوں فرمایا تھا، جس کے لفظ لفظ سے محبت رسول نمایاں ہے

میرا مولا در آقا پہ مجھے لایا ہے — آج کیا خیر طالع نے شرف پایا ہے
بڑھ کے جب عبر علی سے نظر آیا گنبد — مرحبا صل علی لب پہ مرے آیا ہے
ہے وہ در آپ کا دربان ہیں جس کے جبریل — اور اسی باب سے خالق کا سلام آیا ہے
روضۂ پاک پہ دیکھی وہ تجلی جس سے — طور پر حضرت موسیٰ نے بھی غش کھایا ہے
کیا بشر کی ہے حقیقت جو کوئی وصف کہے — شان میں آپ کے لولاک لما آیا ہے
عرض مقصد جو کیا بیٹھ کے جالی کے قریب — کس زباں سے کہوں دل میں جو جواب آیا ہے
اے مسیح دو جہاں لطف ہو اعجاز پہ بھی — سب طبیبوں نے یہیں جام شفا پایا ہے

(از کتب محبوبیہ جلد دوم بستان آصفیہ جلد اول و چہارم، اخبار صبح دکن ۲۸ جون ۱۹۳۶ء، رسالہ جہانگیر لاہور نظام نمبر ۱۹۳۲ء)

اختر

تیموری گھرانے کی شہزادی تھیں، شعر خوب کہتی تھیں، نعت میں بڑا کمال تھا، قدسی کی غزل پر لاجواب غسمیہ کیا ہے۔ پھر لطف یہ کہ عاشقانہ شعر بھی

نہایت اچھے کہتی تھیں۔

تجھ پہ قربان ہوں میں ہاشمی و مطلبی — کہ ہے مشہور دو عالم تیری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی — مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت عجب خوش لقبی

وہ ترا نور ہے، ماہِ فلک بدرِ کرم — تیرے جلوے سے منور ہوئے دونوں عالم
تاب یوسف کو کہاں ہے کہ ترے دیکھے قدم — من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

در عصیاں کے سبب سے ہوں مری جان علی — اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اتنی ہی فدسی کی طرح سے ہے یہی — سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی بے درماں طلبی

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے گھستے — سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

لکھ کر جو مرا نام زمیں پر مٹا دیا — ان کا تھا کہیں خاک میں مجھ کو ملا دیا

(تذکرۃ النساء، عورت مرکا سکالہ، حدیث قدسی، المخدرات، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، شمیم سخن، بہارستان ناز، رسالہ عالمگیر عید قرآن نمبر ۱۹۳۵ء)

اسیر

اسیر بیگم نام تیموریہ خاندان کی شہزادی تھیں ۱۸۹۴ء کے پس و پیش زندہ تھیں، شاہ فخر الدین احمد دہلوی سے تلمذ تھا، مولف تذکرۃ النساء کا بیان ہے کہ کسی نے اسیر کو یہ مصرع سنایا "بے قراری قرار ہے اپنا" اور اسیر نے اس پر فی البدیہہ یہ مصرع بہم پہنچایا "عشق دار و مدار ہے اپنا" اور پھر ایک شعر بھی سنایا جس سے اسیر کی بدیہہ گوئی اور موزونیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے۔

عشق دار و مدار ہے اپنا — بے قراری قرار ہے اپنا
خاک میں مل گئی ہو جس پہ اسیر — اس کے دل میں غبار ہے اپنا

صاحب بہارستان ناز نے اپنے تیسرے ایڈیشن میں لکھا ہے کہ یہ شعر کسی مرد کے ہیں مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا، پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں یہ شعر خود انہوں نے اسیر کے نام سے نقل کئے ہیں۔

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، المخدرات)

اشک

دہلی کی ایک شہزادی تھیں جو ۱۲۹۳ھ میں زندہ اور قلعہ سے متعلق تھیں، مولف تذکرۂ بہارستان ناز کو شبہ ہے کہ یہ کلام کسی مرد شاعر کا ہے اور مطلع کے متعلق ہمیں بھی شبہ ہے کیونکہ یہ مطلع مدت سے ہم سن رہے ہیں مگر تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، المخدرات متفق ہیں کہ یہ شاعرہ تھیں اور یہ کلام انہیں کا ہے۔

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے — تجھے تو اے بت کافر فقط رسوانا آتا ہے
کسی عاشق کا بیشک استخواں ہیں تن مانوں گا — کہ شانہ تیرے رخ تک استعارہ کا نہ آتا ہے

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، المخدرات)

بدر

بدرِ عالم بیگم صاحبہ جان عالم واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی چاہیتی ممتوعہ تھیں، شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق تھا نہ صرف بہترین شعر کہتی تھیں بلکہ نثر بھی بہت عمدہ لکھتی تھیں۔ آپ کے چند خطوط کا مجموعہ جو آپ نے واجد علی شاہ کے نام لکھے تھے مدت ہوئی حیدر آباد میں طبع ہو چکا ہے۔ آپ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ نہ جا سکیں بلکہ آخر تک لکھنؤ ہی میں رہیں، افسوس ہے اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے،

سوزاں ہوں مگر دھواں نہیں ہے — گویا منہ میں زباں نہیں ہے

ستاتا ہے بہت دردِ جدائی — دہائی ہے خدا دندا دہائی

تمہارے خط کو جب دیکھا تن مردہ میں جان آئی — ہوا ثابت کہ ہے تحریر میں اس کی مسیحائی

ایک دو میں سے حال ہو جائے — وصل ہو یا وصال ہو جائے

تپ فرقت میں یہ بیتاب ہے دل — مثال پارۂ سیماب ہے دل

ہے تپ فرقت سے بھڑکی دل میں آگ — آہ کا سینہ سے اٹھتا ہے دھواں

(رقعات بدر عالم مطبوعہ تذکرۃ النساء، رسالہ ادبی دنیا لاہور بابتہ جنوری ۱۹۳۶ء، عالمگیر ۱۹۳۵ء)

بہو

بہو بیگم، اہل خاص نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم مرحوم والیٔ رام پور، شعر خوب کہتی تھیں، طبیعت میں روانی اور شوخی تھی۔ ۱۹۱۰ء کے قبل زندہ تھیں۔

شب بزمِ ملاقات میں ہر چند یہ چاہا — آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس ترک قمر سے
پر خوف مرے دل میں یہی آیا کہ ہے ہے — نازک ہے نہ دب جائے کہیں تو نظر سے

(تذکرۃ النساء، ندیم سخن، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، الحضرات)

بیگم

رشک محل خطاب تھا پنجاب کی ملتوطن اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی منظورِ نظر تھیں، ایک مدت تک واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ میں رہیں اور پھر لکھنؤ چلی گئیں، موسیقی میں اچھا ملکہ تھا اور ریختی کہتی تھیں ۱۲۹۹ھ میں زندہ تھیں افسوس ہے کہ مولف تذکرۃ الخواتین نے آپ کا ذکر نہایت ہی بری طرح کرکے اپنی بے بضاعتی کا ثبوت دیا ہے۔

ہے منظور باجی ستانا تمہارا گلہ کرتی ہے جو روگا نا تمہارا
نہ بھیجوں گی میں تم کو سسرال خانم نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا

(سخن شعرا، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، ندیم سخن، مشاہیر نسوانی، بہارستان ناز، الحضرات)

پارسا

نواب میر تقی خاں ہوس نیشاپوری کی بڑی صاحب زادی تھیں، مرزا ہوس نواب آصف الدولہ بہادر والیٔ اودھ کے قریبی عزیز تھے، اور اتنے وضع دار کہ مرنے تک اپنی دونوں صاحبزادیوں پارسا اور حیا کی شادی نہیں کی اس لئے کہ خسر بننے کا ننگ گوارا نہ تھا،

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا یہ قصرِ اجواب بنا اور بگڑ گیا
چلتا نہیں ہے اپنا ایام یک پل اکثر یہ بدر کاب بنا اور بگڑ گیا

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، ندیم سخن، بہارستان ناز، تذکرۃ الخواتین مدآبی)

پروین

شہزادی فریدس بانو، اختر جہاں آرا نام اور کج کلاہ خطاب ہے پروین اور شریر تخلص کرتی ہیں، آپ کے والد مرزا عاشق حسین بزم تزلیماش گھرانے کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں، جن کا سلسلۂ نسب نوشیروانِ عادل پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ کا نام میری وکٹوریہ سارکس نپولین تھا، جو کونٹ ولیم سارکس نپولین کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، کونٹ ولیم مشہور شہنشاہ نپولین بونا پارٹ کے خاندان سے تھے اور ریاست بھوپال کے کمانڈر انچیف تھے، نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحوم والیٔ رام پور نے مرزا بزم کو وزیر بھوپال کا اسٹاڈی، سی مقرر فرمایا تھا اور انہیں کی عنایت کی وجہ سے مرزا بزم اور میری وکٹوریہ کی شادی ہوئی چونکہ شادی کے بعد مرزا بزم عہدِ زفاف (ہنی مون) منانے کے لئے ظہران چلے گئے تھے اور وہاں مدت تک قیام رہا اس لئے پروین کی ولادت بھی ظہران ہی میں ہوئی، چونکہ پروین نہایت ذہین اور تیز تھیں اس لئے نویں سال ہی عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم ختم کرکے شعر کہنے لگیں، گیارہ سال کی عمر میں سید علی رضا نقوی زمینہ ارسری سے پروین کی شادی ہوئی مگر شادی کے آٹھویں سال کچھ ایسے اختلافات ہوئے کہ علٰحدگی ہوگئی، مولف تذکرۃ الخواتین کا بیان ہے کہ آپ ۱۹۱۱ء میں رام پور میں تھیں اور منا صاحب ہوم سیکرٹری رام پور سے مشورۂ سخن کرتی تھیں،

پروین غزل اور نوحہ خوب کہتی ہیں اور زبان پر خاصا عبور ہے جس کے متعلق خود ان کو حیرت ہے چنانچہ کہتی ہیں،

میں کسرائی وطن طہران مسکن گونڈوانے میں خدا معدوم کیونکر آگئی اردو زباں مجھ کو

کسی گلبدن پر جو آئی ہوئی ہے طبیعت عجب رنگ لائی ہوئی ہے

کیا ایسا مایوس ناکامیوں نے دعا میری باب اثر ڈھونڈتی ہے
یہ عقدہ کھلا قیس کی تجھ سے محبت بھی راحت کا گھر ڈھونڈتی ہے

دیکھتے ہی دیکھتے بس کی آنکھیں پھر گئیں کھینچتے ہی کھینچتے سفاک خنجر رہ گیا
تو نے اے ضبطِ محبت خوب ہی کی نہاں شکوہ ہے پردہ کسی کا روزِ محشر رہ گیا

سنبھل کے پروین قدم اٹھانا کہ سخت مشکل ہے راہِ الفت
ہزاروں جانباز مر مٹے ہیں وہ ڈھب ہے قاتل کی آستیں کا

(تذکرۃ الخواتین مدآبی)، رسالہ زمانہ کانپور بابت جولائی ۱۹۳۸ء)

تاجور

شاہ جہاں بیگم صاحبہ، نواب جہانگیر محمد خاں کی دختر نیک اختر تھیں۔ ۱۲ر جمادی الاول ۱۲۹۴ھ میں سکندر بیگم صاحبہ کے بطن سے قلعۂ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں، والد کے انتقال کے بعد جب آپ تخت نشین ہوئیں تو اس وقت آپ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی،

انیس ۱۹ سال کی عمر میں نواب امراؤ الدولہ باقی محمد خاں بہادر سپہ سالارِ افواج بھوپال سے شادی ہوئی، غدر کی گڑبڑ سنی گئی تو آپ نے نہایت دور اندیشی سے اپنی والدہ کو تخت نشین کر دیا اور خود ولیعہد بن گئیں ۱۸۷۱ء میں آپ کے بطن سے سلطان جہاں بیگم صاحبہ تولد ہوئیں جو بعد کو سریر آرائے سلطنتِ بھوپال ہوئیں اور اپنے لائق اور ہوشیار شہزادے نواب حمید اللہ خاں بہادر کو تختِ سلطنت سونپ کر علٰحدہ ہو گئیں،

۱۲۷۷ھ میں آپ کے بطن سے سلیمان جہاں بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں جو ۱۲۸۲ھ میں انتقال کر گئیں، ۱۲۸۴ھ میں نواب امراؤ الدولہ بہادر نے انتقال کیا اور اس کے کچھ دنوں بعد آپ کی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ بھی انتقال کر گئیں اور آپ ۱۲۸۶ھ میں دوبارہ تخت نشین ہوئیں، ۱۲۸۹ھ میں آپ کو جی، سی، ایس، آئی اور پھر ۱۲۹۳ھ میں نشانِ شاہی اور قیصرِ ہند پھر ۱۲۹۶ھ میں کراؤن آف انڈیا کا اعزاز ملا، آپ نے ایک مدت کے بعد نواب صدیق الحسن خاں بہادر سے نکاح ثانی کیا،

۱۳۱۹ھ میں پینسٹھ سال کی عمر پاکر چونتیس سال برسرِ حکومت رہ کر وفات پا گئیں۔

آپ بڑی رحم دل اور فیاض تھیں علم و ادب کا خاصہ ذوق تھا دو دیوان ایک مثنوی اور کئی ایک کتابیں آپ نے تصنیف کیں، ایک اخبار بھی "عمدۃ الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا، ابتداً شیریں اور اس کے بعد تاجور تخلص کرتی تھیں، شعر خوب کہتی تھیں،

برگِ گل ہونٹ ہیں گل گوش ہیں گل آنکھیں ۔۔۔ زلف سنبل ہے دہن غنچۂ گلستاں ہے، وہ رُخ

ذرا خدا سے ڈرو اے تو جفا نہ کرو ۔۔۔ ذرا یہ سوچو تو کیا ہم خدا نہیں رکھتے

اپنی یہی مراد فقط شاعری سے ہے ۔۔۔ شیریں ہمارا نام جہاں میں سدا رہے

خاطر سے تری جھوٹ کو کہہ دیتے تھے ہم سچ ۔۔۔ ورنہ تری باتوں کا بھلا کس کو یقیں تھا

اب ہم سے کیوں ملو گے ہو پڑ پیار کیا ۔۔۔ پیدا کئے ہیں اب تو نئے تم نے یار دوست

عشق نے بھڑکائی ایسی سوزِ اضطر میں آگ ۔۔۔ لگ گئی سینہ میں، بہہ میں، جگر میں، بیں آگ

تڑپا رہی ہے دلوں کو اک بیوفا کی یاد ۔۔۔ بے بس مرا کلیجہ ہے بے اختیار دل

تاجور چشمِ اہلِ الفت میں ۔۔۔ کچھ فقیری سے بڑھ کے راج نہیں

(خواتین راسلم جیراجپوری، ایشیائی شاعری، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

جانی

بیگم جان نام اور بہو بیگم خطاب تھا، نواب قمرالدین خاں بہادر کی صاحبزادی اور نواب آصف الدولہ بہادر شاہِ اودھ کی محل تھیں، ۱۸۵۷ء کے قبل زندہ تھیں، مؤلف تذکرۃ النساء اودی ہے کہ آپ ایک دفعہ بیمار تھیں آپ کی عیادت کے لئے "ہمدم" نامی ایک خواجہ سرا آیا تو آپ نے فی البدیہہ یہ شعر سایا،

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسمِ ناتواں کی ؟
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی ؟

شعر خوب کہتی تھیں زبان اچھی اور تخیل میں نزاکت بھی خاصی ہے ؎

نہیں مانکے مرے زخمِ جگر پر ۔۔۔ یہ اس کا خندۂ دنداں نما ہے
نہیں ٹلتی کسی عنوان سر سے ۔۔۔ شبِ غم بھی کوئی کالی بلا ہے

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمن جانی ۔۔۔ کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہیں ہے

(تذکرۃ النساء، گلشن بے خار، مشاہیر نسواں، سخن شعراء، ماہ درخشاں، بہارستان ناز)

جینا

جینا بیگم نام، مرزا بابر ابن بہادر شاہ ظفر کی دختر اور جہاندار شاہ کی محل خاص تھیں، مرزا رفیع سودا سے تلمذ تھا، قیاس ہے کہ ۱۸۴۷ء میں زندہ تھیں، آسی صاحب وغیرہ نے گنا بیگم شوخ کے نام سے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ آپ کے نام سے بھی نقل کئے ہیں ہم نے دونوں کے اشعار علیحدہ علیحدہ کر دئے ہیں،

یہ کس کی آتشِ ہنجار نے جی جلایا ہے ۔۔۔ کہ تا فلک مرے شعلہ نے سر اٹھایا ہے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر ۔۔۔ کیا جانئے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی

نہ دل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے ۔۔۔ تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا ۔۔۔ دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

(تذکرۂ ہندی مصحفی، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، تذکرۃ النساء گلشن بے خار، تذکرۃ الخواتین، سخن شعرا چمن انداز)

حیا

حیات النساء بیگم عرف بھوری بیگم شاہ عالم ثانی کی صاحبزادی تھیں،

شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا، غدر سے پہلے سن یاس کو پہنچ کر انتقال فرمائیں، بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے ان کے کلام کو پارسا کی بہن حیا کے کلام سے ملا دیا ہے۔ دراصل یہ حیا الگ ہیں اور ہوس کی بیٹی جدا،

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

(حدیقۂ عشرت، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، بہارستانِ ناز)

حیا

پارسا کی چھوٹی بہن اور مرزا تقی خاں ہوس کی صاحبزادی تھیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا — آب گہر میں عکس نہاں ہے یار کا

نہ سنئے گا کبھی بھولے سے بھی قصہ محبت کا — اڑا دیتی ہے نیند اللہ اثر ہے اس کہانی کا

آج صیاد ستم پیشہ نے کیا گل کترے — دور سے جا کے چمن سے پر بلبل کترے

دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی میرے — چشم خونبار اترے ہوئے دامن میں ہے

(بہارستانِ ناز، تذکرۃ النساء)

حجاب

نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم، نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے وزیر معتمد الدولہ کی پوتی اور دارو غہ اعظم علی خاں کی بیٹی تھیں سنہ ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئیں تھیں، بعض لوگوں نے ان کو واجد علی شاہ کے محلات میں شمار کیا ہے مگر یہ غلط ہے البتہ یہ واجد علی شاہ کی عزیز ضرور تھیں، آپ کا ایک دیوان "تحریر عشق" کے نام سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع حسینی لکھنؤ میں چھپا ہے۔ شعر بڑے اچھے کہتی تھیں، سنہ ۱۳۱۱ھ تک زندہ تھیں،

خفا ابھی سے نہ ہو دعا سنو تو سہی — قبول کر نہ کرنا بھلا سنو تو سہی

وہ خلق سے پیش آئے یہ تھی انکی عنایت — گردن کو جھکائے ہوئے ڈرتے گئے ہم تو

دامن محبوب تک پہنچا نہ جب دست جنوں — بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

کچھ خوف خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے — سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

رہے بتخانہ میں برسوں کعبہ میں نو راٹھیرے — غرض تھی دل کی بہلانے سے جن دل لگا ٹھیرے

بن کے تصویر حجاب اس کو سراپا دیکھو — منہ سے بولو نہ کچھ آنکھوں سے تماشا دیکھو

(رسالہ نگار لکھنؤ بابت اکتوبر ۱۹۲۹ء، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، حدیقۂ عشرت، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

دُلہن

دلہن بیگم اور نواب بہو مشہور تھیں، نواب انتظام الدولہ بہادر کی دختر اور نواب آصف الدولہ بہادر والی اودھ کی محل تھیں سنہ ۱۲۷۲ھ میں زندہ تھیں،

جہاں کے باغ میں ہنسی بہار رکھتے ہیں — مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبگہ دل کا — تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں — گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

دل کی بربادی اور آتشبازی سے کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

(تذکرۂ ہندی مصحفی، گلشن بیخار، تذکرۃ النساء، سخن شعرا، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، ظفر معذیب)

رعنائی

ارہم بائی نام، رعنائی تخلص اور نذیر بیگم اور ممتاز محل خطاب تھا، نہایت فہیم اور طرحدار تھیں، ابو الفتح محمد شاہ خلف شاہجہاں ابن بہادر شاہ ظفر شہنشاہ دہلی کی محل تھیں، شعر اچھے کہتی تھیں،

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا — کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

(ماہ درخشاں، تذکرۃ الخواتین، مخدرات تیموریہ حصہ اول تذکرۃ النساء، بہارستان ناز)

سلطان

سلطان بیگم، نواب غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ کی صاحبزادی تھیں اور شعر بہت اچھے کہتی تھیں، بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ صاحب دیوان تھیں، واجد علی شاہ والی اودھ کی قریبی عزیز تھیں۔

کب تک یہ تیرے ہجر کے صدمے اٹھا کے دل — ڈرہے یہی کہ جان سے اپنی نہ جائے دل
تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا — ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں تیر کھا کے دل
سینہ اگر ہے داغوں سے معمور کیا ہوا — خالی ہے تیرے واسطے عشرت سرا کے دل

(حدیقۂ عشرت، بہارستان، نہ سخن، شعرا، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں عورت مرد کا مکالمہ)

سومی

خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں، غدر ۱۸۵۷ء میں شباب کا عالم تھا، غدر کے بعد بھی مدت تک زندہ تھیں تذکرہ نویس ان کے اور حالات سے بے خبر ہیں، بعض تذکرہ نویسوں نے سومی اور عالم آرا بیگم نازؔ کو ایک ہی تصور کیا ہے مگر یہ غلط ہے یہ دونوں الگ الگ ہیں؛

شور ہے اُس کی بے وفائی کا — بس نہیں چلتا کچھ رسائی کا
دامِ زلفِ سیاہ رے توبہ — نہ بنا ڈھب کوئی رہائی کا

(تذکرۃ الخواتین اسمی، تذکرۃ النساء، دری)

شوخ

گنا بیگم نام اور شوخؔ تخلص کرتی تھیں، نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر نظام کی زوجہ تھیں، قمر الدین منت سے مشورہ کرتی تھیں بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ علی قلی خاں شش انگشتی کی صاحبزادی تھیں۔ میر سوزؔ اور سوداؔ سے مشورۂ سخن کرتی تھیں، مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ قمر الدین منت ہی کی شاگرد تھیں کیونکہ میر منت عماد الملک کے رفیق اور مصاحب خاص تھے کہا جاتا ہے کہ گنا بیگم اس قدر نازک بدن تھیں کہ انہیں تولا گیا تو نو سو تولے وزن ٹھہرا، بدیہہ گوئی میں بڑا کمال تھا، ایک دفعہ عماد الملک نے شمع کو دیکھ کر کہا،

سر سے پاؤں تک سفیدی آگئی تس پر یہ حال
شمع سی ہم نے نہیں دیکھی کوئی بوڑھی چ ہ ن ال

گنا بیگم نے فی البدیہہ یہ شعر کہا،

پر دہ فانوس میں کہتی ہے عصمت کو سنبھال
کاٹ لو اُس کی زباں جو شمع کو بوڑھے چ ہ ن ال

ایک دفعہ یہ نواب کے کمرہ میں ایسے وقت پہنچیں جبکہ وہ سو رہے تھے انہیں سوتا پاکر لوٹنے لگیں تو ان کے پاؤں کی چاپ سے نواب کی نیند ٹوٹی اور انہوں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا،

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے

بیگم نے فوراً کہا،

خوابِ عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

بعض تذکرہ نویسوں مثلاً آسی صاحب وغیرہ نے آپ کے اور حیاؔ بیگم کے شعر ملائے ہیں اور ایک ہی شعر آپ کے نام سے بھی لکھا ہے اور حیاؔ بیگم کے نام سے بھی،

شمع کو چہرۂ دلدار سے کیا ہے نسبت — کینہ کہ یہ ہے رخِ خنداں وہ ہے فق صورت

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا — ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسی کی — جس طرح مرے دل کو لگی چاہ کسی کی

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے — جلد آجا کہ جی ترستا ہے

لے اڑی طرۂ غزال بلبلِ نالاں ہم سے — گل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

(تذکرۂ ہندی مصحفی، ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء بہارستان ناز)

شہزادی خالہ

گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ نواب عماد الملک کی خالہ بدر النسا بیگم جو محلات میں شہزادی خالہ کے نام سے مشہور تھیں شعر کہتی تھیں، مگر افسوس ہے کہ ان کا کلام کہیں نہیں ملا،

(رسالہ ارمغان بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء)

صدر

صدر محل خطاب اور صدر تخلص تھا جان عالم واجد علی شاہ کی منکوحہ تھیں، مولف تذکرہ مشاہیر نسواں کا بیان ہے کہ صاحب دیوان تھیں، ایک دیوان "بادشاہ نامہ" اور ایک گلدستہ یادگار ہے" مگر افسوس ہے کہ ہمیں نہ آپ کا دیوان ہی مل سکا اور نہ گلدستہ، شعر نہایت اچھے کہتی تھیں ہمیں ایک ہی غزل ملی ہے، مگر یہ ایک غزل ایک دیوان پر بھاری ہے۔ جناب آسی نے اپنے تذکرۃ الخواتین میں تذکرۃ النساء سے ان کا حال نقل کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سنہ وفات ۱۲۹۳ھ بھی لکھا ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ سنہ کہاں سے لیا ہے کیونکہ حسب عادت حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم یہ سنہ صحیح بھی ہے یا نہیں،

جوشِ جنوں میں رات دن جب سے ہوا الگ الگ — میں محل جدا الگ الگ لوگ جدا الگ الگ
خاک ہو زندگی جلا تیرے رہِ عشق کی — میں محل وفا سے دور و مجھ سے تو دا الگ الگ
حسرتِ آرزوئے وصل دردِ مصیبتِ فراق — سب کا پھر لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر منہ کو پھیر کے یار نے مجھ سے کیا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر چلیو خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، مشاہیر نسواں، ماہ درخشاں، بہارستانِ ناز، چمن آرائی تذکرۃ النساء، تذکرۃ الخواتین آسی)

صدیقہ

ہز ہائی نس نواب صاحب مانا دور کا ٹھیاواڑ کی والدہ بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہیں، افسوس ہے کہ آپ کے چند ہی نعتیہ شعر مل سکے،

گل نعتِ نبی سے میں بھرا کرتی ہوں دامن کو ہمیشہ کہ پھلا پھولا رہے گا یہ چمن میرا
میں پروانہ صفت صدقے جو ہوں روئے منور پہ بھرا کرتی ہے دم ہر دم یہ شمع انجمن میرا
شبِ معراج خود اللہ نے سرور سے فرمایا تجھی سے ہے بہاروں پر فضائی کا چمن میرا
ہمیشہ ذکرِ میلادِ نبی سے شوق ہے مجھ کو میں صدیقہ ہوں سچ کہتی ہوں یہ ہی جان و تن میرا

(رسالہ عصمت بابت ماہ جون ۱۹۳۵ء)

ضرورت

شریف النساء بیگم، تیموریہ گھرانے کی شہزادی تھیں اور خاندانِ تیموریہ ہی کے مشہور شہزادے مرزا کوچک سے بیاہی گئی تھیں شعر بھی کہتی تھیں،

سرسبز رہے باغ سدا دین نبی کا کی مدنی ہاشمی و مطلبی کا
مشکل ہو جو آسان دعا مانگ ضرورت کر عرض کہ یہ وقت ہے حاجت طلبی کا

(تذکرۃ النساء، بہارستانِ ناز، رسالہ نشاط افزا)

عابدہ

امراؤ بیگم نام اور عابدہ تخلص تھا، نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروائے رام پور کی صاحبزادی اور نواب زین العابدین خاں بہادر کی محل تھیں، ۱۸۹۶ء میں انتقال کیا، ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار باقی ہے۔

کشتہ ہیں اے لالہ زری ہم رنگ گندم گوں کے جو ہے شمع گندم کی بس کافی ہماری قبر پر

(ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں)

عالم

نواب بادشاہ محل بیگم صاحبہ المتخلص بہ عالم آپ نواب علی نقی خاں بہادر ابن شرف الدولہ بہادر کی صاحبزادی اور نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی محل خاص تھیں، آپ کی شادی جان عالم سے ۱۲۷۳ھ میں ہوئی جبکہ جان عالم ولیعہد تھے، عالم نے شادی کے بعد خاص محل خطاب پایا اور جان عالم نے فرماں روائے اودھ ہونے کے بعد بادشاہ محل خطاب دیا، بعض تذکرہ نویسوں نے خاص محل اور بادشاہ محل دونوں کو الگ الگ سمجھ کر خاص محل کو واجد علی شاہ کی ایک اور محل عالم کے علاوہ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ شہریؔ سے لے کر جناب آسیؔ تک کو یہی مغالطہ ہوا ہے۔

عالم کو نہ صرف ذوقِ شعری تھا بلکہ وہ فنِ شعر پر خاصہ عبور رکھتی تھیں، غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن پر بھی قادر تھیں، چنانچہ ایک مثنوی جو طبع ہو چکی ہے اس کا زندہ ثبوت ہے۔ دیوان بھی طبع ہو چکا ہے۔ جس میں بڑے معرکہ کی غزلیں ہیں، آپ کے بطن سے نو شہزادیاں قدر اور کیواں قدر دو شہزادے تھے، آپ نثر و مرثیہ خوانی کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ جان عالم کے ساتھ جب کلکتہ گئیں تو رضہ خوانوں کو ساتھ لیتی گئیں۔

صبح کی میں نے کروٹیں لیکر رات کو دل جو بے قرار ہوا

یاد رخ گیسو میں سدا ہم نے بسر کی رو رو کے کبھی شام کی اور گاہ سحر کی

ہو جو بازارِ محبت کے چمن سے واقف کھوٹے داموں کوئی یوسف کا خریدار ہو

پھر شوق سے حضور سنا لیتے گالیاں عالمت کیا تو ہمنا ہمارے قصور کو

گیسوئے خود اس کے رخ پر پل کھانے لگے سینۂ عشاق پر سب سانپ لہرانے لگے

اے باغباں چمن میں یہ کہدے پکار کے لو بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے

عالم وہ طلبگار ترے ہونگے اُسی دن جب تازہ ستم کوئی بھی ایجاد کریں گے

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، بہارستانِ ناز، شمیم سخن)

عشرت

عشرت محل خطاب اور عشرت تخلص کرتی تھیں، جان عالم کی ممتوعہ تھیں، شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا۔

گرمیٔ عشق بارِ نشو و نما ہوئی میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

شعلۂ عشق لگا آگ دل میں میرے یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی کا نہیں

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں،

بہارستانِ ناز)

عصمت

ہرائی نس بیگم صاحبہ رام پور بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں، آپ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کی تعلیمیافتہ خاتون ہیں، نواب محمد حامد علی خاں بہادر مرحوم والیٔ رام پور نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے ولیعہد نواب رضا علی خاں بہادر سے آپ کی شادی کی اور جون ۱۹۳۰ء سے بیگم صاحبہ رام پور کہلاتی ہیں، غزل بڑی اچھی کہتی ہیں، طبیعت میں شوخی اور روانی ہے،

کیا کیا صلے ملے ہیں قاتل کو پیار کے کے — دن کاٹتے ہیں رو کے سب انتظار کر کے
کہتے ہیں وعدہ کیسا اک بھی دل لگی تھا — میں نے کہا تھا بیٹھو تم اعتبار کر کے
کس کوزمیں میں سونپا کس کی لحد بنائی — بیٹھے ہو گیسوؤں کو کیوں پُر غبار کر کے
ممنوں تھا ماہو کر ممنون غیر کیوں ہو — جاؤ تو گل چراغِ طاقِ مزار کر کے
کینہ کو خیال و پاسِ اہلِ ہنر نہ رکھوں — بھی گئی ہوں عصمت میں تلخ کار کر کے

چشم و جان و دل ہیں زخمی ہجر کی تحریر سے — کے نشانے لگ گئے جلاد کے اک تیر سے
جب نشیمن جل چکا اب آنی گلشن میں گھٹا — پانی کے چھینٹے جگر پر پڑ رہے ہیں تیر سے
ہاتھ ہیں لوگوں کے ہاں اک ادا بڑھ جائیگی — ورنہ چشمِ ناز کے کشتوں کو دُکھ کیا تیر سے
ہاں ٹھہر اے موت آتا واقفِ جذباتِ عشق — میں خدا حافظ تو کہہ لوں دوست کی تصویر سے
حشر میں کیونکر نہ ہو عصمت کا چہرہ آفتاب — نورِ رخ کا پڑ گیا غاکِ درِ شبیر سے

(رسالہ جوہر بابت دسمبر ۱۹۳۶ء و اخبار خادم گلکتا اپریل ۱۹۳۳ء و رسالہ نظارہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

قدسیہ

قدسیہ سلطانہ اختر بیگم صاحبہ محل نواب اختر زمان خاں بہادر والیٔ باندہ۔ آپ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتی ہیں، ایک قطعہ وفات کے چند شعر جو ہمیں مل سکے پیش کئے جاتے ہیں،

ہے یہ کس نونہال کا ماتم — رو رہی ہے یہ کس لئے شبنم
کس کی آوازِ گریہ آتی ہے — کس پہ ٹوٹا ہے کوہِ رنج و الم
صبر کہتا ہے دل سے ضبط کرو — ضبط کہتا ہے اشک سے تھم تھم
عقل کہتی ہے رنج سے حاصل — کوئی جا کر پھر ابھی ہے آدم

(رسالہ عصمت بابت فروری ۱۹۳۷ء)

قمر

حیدری بیگم نام اور ماہ طلعت بیگم خطاب تھا، شہزادہ مرزا ہمایوں بخت کی دختر اور مرزا محبوب علی قوس کی بہن اور جان عالم واجد علی شاہ کی منکوحہ تھیں، مولف تذکرۃ النساء راوی ہے کہ جان عالم کے انتقال کے بعد قمر نے عبد الغفور نساخ سے عقد ثانی کیا تھا۔ ۱۲۸۱ھ میں فوت ہوئیں، عشقیہ شعر بڑے اچھے کہتی تھیں،

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا — بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا

آنکھیں پتھرا کے ہو گئی ہیں سفید — کسی بت کی جو انتظاری ہے

لے گیا قیس یہ بھی فوق تمہارا وحشی — مر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوٹا

ہوئی ہوں تشنۂ جامِ شراب اے ساقی — اٹھوں گی قبر سے میں بھی سبو سبو کرتی

(رحمن شعرا، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، بہارستان ناز، حدائقِ عشرت، مشاہیر نسواں رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء)

کنیز

کنیز فاطمہ بیگم، نواب نصرت الدولہ بہادر کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، پندرہ سال کے سن میں علومِ ضروریہ کی تحصیل سے فارغ ہو کر شعر کہنے لگیں اور بیس برس کی عمر میں انتقال کیا، ان کے متعلق تذکرہ نویسوں کو اختلاف ہے۔ مولف ماہِ درخشاں کا خیال ہے کہ نصرت الدولہ کی کنیز تھیں، مولف چمن انداز اور مولف تذکرۃ النسا نے نصرت الدولہ کی چھوٹی بیٹی کی کنیز لکھا ہے۔ مگر مولف بہارستان ناز دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ خاتون نصرت الدولہ کی صاحبزادی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کے نام کے جزو کنیز کی وجہ سے ان تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہو، بہر حال شعر خوب کہتی تھیں،

نقاش نے اُس بت کا مرے نقش جو کھینچا — ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ وہ ہاتھ کو کھینچا

جانتے بھی ہو پری رو! تم کیا کرتے ہو کیا؟ — مارتے ہو زندہ کرتے ہو قیامت کرتے ہو

وصل کی شب ہو گا کیا حاصل ہمیں جز نالے سے — جب تلک تم بند کھولو کے سحر ہو جائیگی

ماہِ درخشاں، تذکرۃ النساء، چمن انداز، بہارستانِ ناز)

کیفی

تیموریہ گھرانے کی شہزادی تھیں، یہ بھی عجیب بات ہے کہ اکثر تیموری

شہزادیوں نے قدسی کی غزل کو خمسہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ کا بھی ایک خمسہ ملاحظہ فرماتے جس کے چند بند یہ ہیں۔

کس کا منہ ہے جو کرے مدح تری میں بیتی — نعتِ اطہر میں جب شخص ذکی محض عجمی
جد ذات تری مایۂ حاجت طلبی — مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدائت پہ عجب خوش لقبی

نور تھا تیرا وہاں نورِ حقیقت سے بہم — دیکھ کر موسیٰ عمراں ہوئے غش شاہ ام
نورِ مہر رخ تاباں پہ ہے کیا ہی عالم — من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ بہ جمال ست بریں بوالعجبی

در عصیاں سے ہے پیدا نہایت کبیری — حکمتِ لطف سے اس درد کے تم ہو ساقی
عازمِ درگہِ قدسی ہے مثال قدسی — سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

(حدیثِ قدسی، تذکرۃ النساء)

محبوب

نام معلوم نہ ہو سکا، واجد علی شاہ کے محل کی زینت ہوئیں تو محبوب محل خطاب پایا، منکوحہ تھیں، شعر کا ذوق فطری مناسب کہتی تھیں۔

اٹھا کے نہ مصیبت فراقِ یار میں روح — نکل گئی تنِ لاغر سے انتظار میں روح
جو آنا ہو تجھے مدِ نظر تو آ ظالم — نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح
نہ نکلی حسرتِ دل ایک بھی کہ موت آئی — ہمیشہ تڑپے گی تیرے لئے مزار میں روح

(رسالہ نگار عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، تذکرۃ النساء، سخن شعرا، ماہ رخشاں، مشاہیر نسواں، بہار ستان ناز، نشاط افزا)

مخفی

نواب سلطان جہاں بیگم نام اور مخفی تخلص تھا، صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر ابن مرزا اکرم سخت ابن مرزا خورد نبیرہ ظفر بن جہاں دار شاہ بادشاہ دہلی کی محل خاص تھیں، مرزا صابر کا ایک تذکرہ گلستانِ سخن بہت مشہور ہے ۱۲۵۰ھ کے پس و پیش زندہ تھیں آپ شعر نہایت اچھے کہتی تھیں خصوصاً غزل گوئی میں بڑا اچھا ملکہ تھا، یوں تو آپ کے سبھی شعر اچھے ہیں مگر ایک بڑے غضب کا کہا ہے جو ایک دیوان پر بھاری ہے ؎

کوئی اُن کی شوخی تو دیکھنا، لئے زلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پاس آکے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

اس میں آپ نے اپنے مطلوب کی شوخی اور شرارت کی تصویر کھینچی ہے کہ وہ زلف خم شدہ ہاتھ میں لے کر پیچھے سے دبے دبے آکر چہرے کے پاس خم شدہ زلف کو لٹکا دیتا اور سانپ کہہ کر ڈراتا ہے۔ زلف کو یوں بھی سانپ کہا جاتا ہے اور سانپ سے سبھی ڈرتے ہیں، اور عورتوں کی تو اس کے نام سے روح فنا ہوتی ہے۔ اس پورے قصے کو صرف ایک شعر میں اس عمدگی سے ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی،

لُٹھائی سے کہ پیں خفتگانِ خاک شرابی — قسم خدا کی عسس کو بڑا ثواب ہوا!

خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی — کہ اس ظلم پر کچھ بھاتا بہت ہے

(نگار نامہ سروری، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں، بہار ستان ناز)

ناز

عالم آرا بیگم المتخلص بہ ناز، خاندانِ تیموریہ کی شہزادی اور مذہب امامیہ کی پیرو تھیں، تذکرۃ النساء ناری کے ترتیب کے وقت زندہ تھیں مولف تذکرۃ الخواتین نے حالات اور کلام کا نمونہ تذکرۃ النساء ناری سے لیا ہے۔ مگر وہی شعر جو سوسنی کے نام سے لکھے جا چکے ہیں ان کے نام سے بھی لکھ دیئے ہیں یہ اوج ہے ہمارے تذکرہ نویسوں کی، مولف تذکرۃ النساء کو بھی یہی شک ہوا ہے کہ ناز اور سوسنی ایک ہی ہیں۔

مجھ سے رو ٹھا وہ یار جانی ہے — جان جانے کی یہ نشانی ہے

کہ غلامی علی کی تو اے ناز — ہے اگر دھیان بادشاہی کا

(ماہ رخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں، بہار ستان ناز، تذکرۃ الخواتین رامسی)

ولائتی

ولائتی بیگم، خاندانِ تیموریہ کی شہزادی تھیں، آپ نے ایک غدری مُکّی کہی ہے جو بہت مشہور ہے

چودہ کا وہ سال، مہینہ ماہ کا اس بھائی — روز جمعہ کا تھا دوج تھی ولائتی بیگم نے ہوئی گائی
کری دونوں کی بُرائی — ہنیں کیسی بڑی مچائی

(تذکرۃ النساء)

یاد

خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں، مولف تذکرۃ النساء کے کسی دوست سے مشورہ کرتی تھیں، جنھوں نے ان کی وفات کی تاریخ کہی ہے جس سے ۱۲۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔

لحد میں یاد نے جب منہ چھپایا — رہا ہے کثرتِ غم سے کسے ہوش
کہو تاریخ اس کی کون کہوے! — ہوئی جو یاد اب از خود فراموش

یاد نے یہ قطعہ نزع کے عالم میں کہا تھا اور حق یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا! کہ اب یاد تو یاں سے چلنے کو ہے
سرانجام غسل و کفن کر رکھو تن زار سے جاں نکلنے کو ہے

(راہ و رشتاں، تذکرۃ الفنا، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

آپ نے جن شہزادیوں کے کلام اور حالات کا مطالعہ کیا وہ سب کی سب نری شہزادیاں یعنی بادشاہوں کی بیٹیاں نہیں ہیں مگر ان میں سے بعض بادشاہوں کی بیٹیاں، پوتیاں ہیں اور بعض بادشاہوں اور شہزادوں کی مملات اور بعض ان کی اقربا ہیں اس طرح جن خواتین کے حالات فراہم کئے گئے ہیں یہ سب کسی نہ کسی طرح محلاتِ شاہی سے متعلق ضرور ہیں۔

تذکرہ نویسوں نے بڑی بڑی ستم ظریفیاں کی ہیں کسی نے ایک ہی شعر دو خواتین سے منسوب کر دیا ہے کسی نے تخلص ایک خاتون کا اور نام ایک خاتون کا ملا کر دونوں خواتین کے شعر یک جا لکھ دئے ہیں، غرض اس قسم کی بوالعجبیوں سے اردو شعر کہنے والی عورتوں کے تذکرے بھرے ہیں ہم نے جہاں تک ہو سکا احتیاط سے حالات فراہم کئے ہیں اور غور و فکر کے بعد ایک دوسری خواتین کے اشعار بھی الگ کر دئے... ہیں مگر ممکن ہے پھر بھی کچھ نہ کچھ خامی رہ گئی ہو کیونکہ تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ آج جو مواد فراہم ہوا کل اس کے خلاف مواد دستیاب ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایک سطحی خاکہ ہے جو پیش کیا جا رہا ہے اور اپنی نوعیت کا بالکل پہلا مقالہ ہے جو معرضِ طبع میں آ رہا ہے

اس مواد میں آپ کو بعض خواتین کے ایسے اشعار ملیں گے جو بہترین اور عمدہ کہلانے کے مستحق ہیں بعض ایسی محترم خواتین جو گاہے ماہے فکرِ شعر فرماتی ہیں ایسے عمدہ اور اچھے شعر کہتی ہیں کہ بڑے بڑے شاعروں کے اشعار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں، حضرت بیگم صاحبہ دکن ہی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اُن کو عہدِ وفا کی لاج نہیں در دِل کا کوئی علاج نہیں
روز ہی دن میں بدل گیا نقشہ کل جو تھا لطف مجھ پہ آج نہیں
درد دینے لگا مزا دل کو اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

مطلع کس قدر جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اسی طرح دوسرا شعر اختلافِ مزاج کی کتنی اچھی تصویر پیش کر رہا ہے۔ تیسرا شعر غالب کے اس خیال ع رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج سے کتنی عمدہ شرح ہے۔

اس کے بعد بیگم صاحبہ رام پور کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

ہاں ٹھہرائے موت! اے ناواقفِ جذباتِ عشق!
میں خدا حافظ تو کہہ لوں دوست کی تصویر سے!

کتنا پاکیزہ خیال ہے۔ شہزادی اختر تیموریہ کا خمسہ حضرتِ قدسی کی غزل پر کتنا مقبول اور بے ساختہ ہے۔ اس خمسہ کے علاوہ بھی جو شعر کہے ہیں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں، خصوصاً

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا اُن کا تھا کھیل خاک میں مجھ کو ملا دیا

یا آسیہ کا یہ شعر

عشق دار و مدار ہے اپنا بے قراری قرار ہے اپنا

نواب ہوس نیشاپوری کی صاحبزادی پارسا کا یہ شعر پڑھئے اور سر دھنتے جائیے۔

تن صورتِ حباب بنا اور بجھ گیا یہ قصر لاجواب بنا اور بجھ گیا

تاجور مغفور بیگم صاحبہ بھوپال کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے۔

تاجور چشمِ اہلِ الفت میں کچھ فقیری سے بڑھ کے راج نہیں

پارسا کی چھوٹی بہن حیا کا یہ شعر کس غضب کا ہے۔

آج صیادِ ستم پیشہ نے کیا گل کترے دُور سے جا کے چمن پر بلبل کترے

شہزادی قدسیہ بیگم رعنائی کا یہ شعر کس کیفیت کا ہے۔

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

صدر محل بیگم صدر کی مرصع غزل کے یہ شعر پڑھئے،

حسرتِ آرزوئے وصل و وصیت فرقت سب گاہے لطف الگ الگ سکا مزا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر چلیے خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ

عشرت محل عشرت کا یہ فلسفیانہ شعر غور سے پڑھئے

گرمیٔ عشق مارِ نشو و نما ہوئی میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

صاحب عالم مرزا صابر بخش کی محل مخفی کا یہ شعر ایک استاد کے دیوان پر بھاری ہے۔

کوئی ان کی شوخی تو دیکھنا لئے زلفِ خم شدہ ہاتھ میں
مرے پاس آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

غرض اس گلشن سدا بہار کی سیر سے آپ خود حظ اٹھائیے ان خواتین نے گلستانِ شاعری میں وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

تسکینِ عابدی

تجلّیات

(۱)

دل کو میں حُسن سے تو بہلاؤں
اور اگر جان سے چلا جاؤں!

رفعتِ چرخ کو سمجھ لوں گا
اک ذرا سطح تک اُبھر آؤں

تُو جہاں اے خیال رہتا ہے
کاش میں بھی وہیں پہنچ جاؤں

ہو گیا عیش سے بھی جی بیزار
ہائے اب کیا کروں کہاں جاؤں

میرے اشعار ایسے ہیں اختر!
کہ میں جادو نگار کہلاؤں

(۲)

حُسن کو بے نقاب دیکھا ہے
میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے

اپنے ایک ایک سانس میں میں نے
عمر بھر کا عذاب دیکھا ہے

زندگی کی ہر ایک کروٹ میں
اک نیا انقلاب دیکھا ہے

میری نظروں میں کیا جچے اب غم
میں نے اس کا شباب دیکھا ہے

دل کے آئینے میں کبھی اختر
خود کو بھی بے حجاب دیکھا ہے

اختر انصاری

دو مسئلے

رحم

مسجد کا حجرہ - شام سے کچھ پہلے

(مولوی صاحب مصلے پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں، ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح ہے اُن کے قریب اُکڑوں لڑکا عمر دس سال، بیٹھا ہوا مٹھائی کھانے میں مصروف ہے ایک شخص حجرے میں داخل ہوتا ہے جو مسجد سے متصل ایک دکان میں کرایہ دار ہے)

کرایہ دار۔ مولوی صاحب! اجازت ہے!

(ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

مولوی صاحب۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد، کسی قدر درشت لہجے میں) تم کیوں آئے ہو؟

کرایہ دار۔ آپ نے میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں تو . . .

مولوی صاحب۔ (بات کاٹ کر) مقدمہ دائر نہ کرتا تو کیا کرتا، تم ایسے کرایہ کب دینے لگے؟

کرایہ دار۔ جناب مجھے کرایہ دینے سے تو انکار نہیں، آج تک باقاعدہ دیتا رہا ہوں، کبھی ایک کوڑی نہیں رکھی،

مولوی صاحب۔ دو مہینے سے تو ایک پیسہ نہیں دیا، اور اگر پہلے دیتے رہے تو کیا مجھ پر احسان کرتے رہے ہو!

(تسبیح زور سے پھیرنے لگتا ہے)

کرایہ دار۔ نہیں جناب احسان کی تو کوئی بات نہیں۔

مولوی صاحب۔ تو پھر اس بکواس سے فائدہ؟

کرایہ دار۔ آپ ناراض نہ ہوں، میں نے کوئی گستاخی کی بات تو نہیں کی، صرف اتنا عرض کیا تھا کہ پہلے بھی کرایہ دیتا رہا ہوں، اب بھی دے دوں گا،

مولوی صاحب۔ تو دیتے کیوں نہیں؟ دینے کا ارادہ بھی ہو!

کرایہ دار۔ (ہاتھ باندھ کر) چند روز اور انتظار کیجئے، میں کوڑی کوڑی چکا دوں گا، گھر میں بیماری کی مصیبت نہ ہوتی تو کبھی یہ نوبت نہ آتی، مہینے بھر سے میرے دونوں بچے بیمار پڑے سسک رہے ہیں، ایک گھڑی بھی آرام نصیب نہیں، کاروبار بھی نہیں کر سکتا۔ کئی دن سے دکان بھی بند ہے، آپ میری حالت پر رحم کریں۔

مولوی صاحب۔ بچے بیمار ہیں تو میں کیا کروں! علاج کراؤ، اور یہ بیماری تو ایک بہانہ ہے کرایہ نہ دینے کا، ابھی کل کہتے تھے میری بیوی بیمار ہے، آج کہتے ہو بچے بیمار ہیں کل آؤ گے تو کسی اور کی بیماری کا بہانہ کرو گے، تمہارا تو یہی دستور ہو گیا ہے۔

کرایہ دار۔ جناب بلوں ہی بیمار کون بنتا ہے! جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ الگ بات ہے غریب نادار ہوں شرافت اور غیرت کا مارا آپ کی منت سماجت کر رہا ہوں، میرا ترس کیجئے، آپ کے بال بچوں کو دعائیں دوں گا۔ (آبدیدہ ہو جاتا ہے)

مولوی صاحب۔ تم بڑے غیرت مند ہو تو کرایہ ادا کر دو، اول تو اب یہ بات کرنا ہی فضول ہے، عدالت خود ہی وصول کرے گی، مجھ سے رحم کی درخواست کے کیا معنی؟ جج کے بچوں کو دعائیں دو، وہ تمہیں چھوڑ دے تو چھوڑ دے، میں تو نہیں چھوڑ سکتا۔

کرایہ دار۔ مولوی [illegible] بال بچوں والا ہوں میری حالت پر رحم کیجئے

(لڑکا بڑے [illegible] گھبرایا ہوا باپ کی طرف دیکھتا ہے)

مولوی صاحب۔ رحم، رحم پکارنے سے آخر فائدہ؟ ایک دفعہ کہہ جو دیا ہے، میرا وقت ضائع نہ کرو، جاؤ۔ (وظیفہ میں مصروف ہو جاتا ہے)

کرایہ دار۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مایوسی کے انداز میں) جناب چلا جاؤں؟

مولوی صاحب۔ ہاں جاؤ

کرایہ دار۔ آپ مقدمہ واپس نہیں لے سکتے؟

مولوی صاحب۔ نہیں،

(کرایہ دار سخت غمگین ہو کر باہر نکل جاتا ہے)

لڑکا۔ ابا جان!

مولوی صاحب۔ خاموش رہو بیٹا،

لڑکا۔ (قریب آکر بیٹھ جاتا ہے) ابا جان! آپ نے صبح سبق پڑھاتے وقت کہا تھا رحم کرنا بڑا اچھا ہے۔

مولوی صاحب۔ صبح؟ ہاں کہا تھا

لڑکا۔ آپ نے کہا تھا کہ غریبوں پر رحم کریں تو اللہ میاں خوش ہوتے ہیں

مولوی صاحب۔ ہاں اللہ میاں بہت خوش ہوتے ہیں

لڑکا۔ تو آپ نے اس شخص پر رحم کیوں نہیں کیا؟

مولوی صاحب۔ رحم غریبوں پر کرنا چاہئے۔

لڑکا۔ یہ بے چارہ بھی غریب ہے۔

مولوی صاحب۔ نہیں یہ غریب نہیں،

لڑکا۔ وہ تو کہتا تھا میں بہت غریب ہوں

مولوی صاحب۔ جھوٹ بکتا ہے،

لڑکا۔ تو غریب کون ہوتا ہے؟

مولوی صاحب۔ جب تم بڑے ہو گے تو جان لو گے، اور دیکھو تمہیں کہا جائے مان لیا کرو، زیادہ باتیں نہ بنایا کرو، جاؤ اب اپنی جان سے جا کر پوچھو، ابا جان کہتے ہیں کھانا تیار ہے!

تعلیم

مکان کا کمرہ

استاد (عمر ۴۰ سال)۔ شاگرد (گیارہ سال کا لڑکا)

(استاد کرسی پر بیٹھا ہوا کتاب کھولی پڑی ہے)

لڑکا۔ ماسٹر جی! اس کا مطلب ہے کہ اکبر بادشاہ ان پڑھ تھا۔

استاد۔ ہاں، بالکل ان پڑھ، جاہل،

لڑکا۔ تو کیا وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا؟

استاد۔ نہیں، کچھ بھی نہیں، کہتے ہیں، ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کا ایلچی خط لے کر اس کے دربار میں آیا، اکبر نے خط کو الٹا پکڑ کر دیکھنا شروع کیا، اس پر وہ ایلچی بہت حیران ہوا اور درباری بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکے۔

لڑکا۔ وہ اتنا ہی ان پڑھ تھا تو بادشاہ کیسے بن گیا؟

استاد۔ بادشاہ کیسے بن گیا؟ وہ بڑا بہادر اور دانا تھا، اس نے تھوڑے ہی عرصے میں بڑے بڑے علاقے فتح کر لئے، سلطنت کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کیا، راجپوتوں کی قوم بڑی طاقتور تھی، اُن سے رشتے ناتے جوڑ کر انہیں بھی مطیع بنا لیا،

لڑکا۔ لوگ اس کی بات کیسے مانتے تھے؟ کیا وہ بڑا ہی دانا تھا؟

استاد۔ ہاں، بڑا دانا، اس کے دربار میں بڑے بڑے شاعر، فلسفی اور عالم فاضل لوگ موجود تھے، وہ نورتن کہلاتے تھے، یہ درباری امیر جب جمع ہوتے تو بڑے بحث مباحثے کرتے، بادشاہ بھی اُن کی مجلس میں شریک ہوتا اور ہر مسئلہ پر گفتگو کرتا،

لڑکا۔ اگر وہ ان پڑھ تھا تو ایسے پڑھے لکھے لوگوں سے بحث کیسے کر سکتا تھا؟

استاد۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ دانا بہت تھا۔

لڑکا۔ لیکن، ماسٹر جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی ان پڑھ ہو اور پھر دانا بھی ہو؟

استاد۔ تم عجب بے وقوف لڑکے ہو، تمہیں ابھی سمجھایا ہے اور تم نے کتاب میں بھی پڑھا ہے، پھر پوچھتے ہو۔

(لڑکا ندامت اور تعجب سے کبھی کتاب کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی استاد کا منہ تکتا ہے)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ایران کی جدید شاعری

ادبیات کا تعلق قوموں کی زندگی کے ساتھ اس قدر گہرا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ادبیات ہر ملتے کا شفاخانہ احساسات آں ملت ست" مشہور ہے۔ قوموں کے دورانِ حیات میں جتنے انقلاب آفریں واقعات گزرتے ہیں ان سے شاعری ضرور متاثر ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جدا جدا رنگ رکھتی ہے۔ ایرانی شاعری پر بھی اس کے دورانِ حیات میں موافق اور مخالف واقعات گزرتے رہے۔ اور اس انقلاب کی وجہ سے ایرانی شاعری اور ادب کا معیار گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔

جدید شاعرانہ احساس کے بیدار ہونے سے پہلے ایرانی شاعری کی جو کچھ عام حالت تھی۔ وہ چند نظری اسباب کے تابع تھی۔ ان میں سے اکثر اسباب سیاسی اور بعض معاشرتی ہیں۔ عربوں نے جب ایران پر تسلط کیا تو ان کی ہر چیز پر عربی رنگ چڑھنے لگا۔ چنانچہ فارسی شاعری نے عربی شاعری کے زیر اثر نشو و نما پائی جس کا اعتراف خود عجمیوں کو ہے ؎

شاعری دانی کہ امی قوم کرد مدآنکہ بود — اہلِ شان امراء الشعرا آخر شان بوفراس

(انوری)

عرب کی شاعری ابتداءً نیچرل شاعری تھی جس میں سچے جوش اور فطری جذبات کا خاکہ ہوتا تھا۔ فارس نے جب عرب کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ غلامانہ تملق اور خوشامدانہ جذبے نے شاعری کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ اور اس فن لطیف کا دائرہ زیادہ تر مدحیہ اور عشقیہ مضامین ہی میں محدود ہو گیا۔ شاعر ذہین اور طباع تھا۔ اس غیر فطری شاعری کے میدان میں استاد سے آگے بڑھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری چند مضامین کی تاریک وادی میں پھنس کر رہ گئی۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ جدید شاعری سے کس دور کی شاعری مراد ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر فارسی شاعری کے مختلف دوروں پر ڈالی جائے۔ انقلابی شاعری سے پیشتر عہد کی شاعری حسب ذیل دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہے:۔

پہلا دور قبل از اسلام اور دوسرا دور بعد از اسلام پہلا دور تقریباً قدیم تین ازمنہ تاریخی سے پانچویں صدی میلادی تک۔ اور دوسرا دور غالباً اس کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس میں دورِ انحطاط کو نکال کر اس دور کی شاعری کی ذیلی تقسیم اس طور پر ہو سکتی ہے:۔

(۱) سنہ ۹۰۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک یعنی رودکی۔ اسدی عنصری اور فردوسی وغیرہ کا زمانہ۔ یہ دور چونکہ تمدن اور شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا اس لئے زبان سادہ تکلف اور مبالغہ سے خالی۔ نظری تشبیہیں اور استعارے بہت قریب کے ہیں۔ اس دور کی مشہور تصنیف شاہنامہ ہے۔

(۲) سنہ ۱۱۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک یعنی خاقانی۔ انوری۔ نظامی ظہیر فاریابی وغیرہ کا زمانہ۔ اس دور میں ایران نے عربی مدرسین علوم معانی بیان اور رموز فصاحت و بلاغت کی تعلیم حاصل کر لی۔ تمدن اور تنعم نے بھی ترقی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استعارات پیچیدہ اور دور از کار تشبیہات کی بھرمار ہو گئی۔ اس دور کی مایۂ ناز تصنیف سکندر نامہ ہے۔ شاہ نامہ اور سکندر نامہ کے طرزِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اوّل الذکر میں شاعر زبان حسن ذاتی کے ساتھ سادہ۔ مگر دلکش پیرایہ میں جلوہ افروز ہے۔ بخلاف اس کے موخر الذکر استعارات کے لباس فاخرہ اور تشبیہات کے بیش بہا زیورات سے آراستہ ہے۔ اسی طرح قصائد میں بھی نمایاں فرق ہے۔

(۳) سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک یعنی سلمان سعدی۔ خواجہ حافظ وغیرہ کا زمانہ اس دور میں شاعری میں رد عمل ہوا۔ دوسرے دور کی پر تکلف اور مصنوعی شاعری سے لوگوں کی طبیعتیں اکتا گئی تھیں۔ اب پھر سلاست

زبان لطافتِ الفاظ اور جذبات کی تصویر کشی کی طرف توجہ کی گئی لایعنی تکلفات سے احتراز کیا گیا۔ سعدیؔ اور حافظؔ اس انقلاب کے روح رواں ہیں۔

۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک یعنی عرفی۔ ظہوری، اسیر نظیری۔ بیدل وغیرہ کا زمانہ۔ اس دور میں جب شعرا نے دیکھا کہ شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہوگیا ہے اور ان کے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہی تشبیہات اور استعارات کا سرمایہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنا کمال اسی میں سمجھا کہ استعارہ کو استعارہ در استعارہ اور مجاز در مجاز بنا کر خراجِ تحسین لیں جلال، اسیر، بیدل۔ ظہوری وغیرہ اسی میدان کے مرد ہیں۔

(۵) یہ دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پھر ردِ عمل ہوا۔ زبان کی سلاست اور بندش کی سادگی کا دور دورہ قائم ہوا۔ یہی دور ہے جس کو انقلابی شاعری کا پیش خیمہ یا عصرِ اصلاح کہا جا سکتا ہے۔ اور جدید شاعری کا ابتدائی زمانہ یہی ہے جس کا علم بردار قاآنی ہے۔ اس نے استعارہ در استعارہ اور مجاز در مجاز کی بدعت کو ترک کر کے دورِ ثالث کا رنگ اختیار کیا سلاست اور روانی کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ مگر درحقیقت عصرِ حاضر کی شاعری کے جس کو جدید شاعری یا انقلابی شاعری کہا جاتا ہے، خط و خال اس کے کلام میں بھی نمایاں نہیں۔

جدید شاعری کی ذیلی قسمیں بتانے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی امتیازی خصوصیات پر سرسری نظر ڈالی جائے۔

۱۔ زبان صاف اور سلیس۔ بندش بالکل سادہ اور سہل ہوتی ہے۔ اشرف الدین رشتی کی ایک قومی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اسلام رفت غیرتِ اسلامیاں چہ شد — ناموس رفت ہمتِ ایرانیاں چہ شد
دستِ بلند تا درِ گیتی ستاں چہ شد — اے تیرہ بخت دست بزنجیر جدا وطن
بیکس وطن غریب وطن، بے نوا وطن

آخری مصرع کتنا سیدھا سادہ اور صاف ہے۔ مگر کس قدر مؤثر۔

ڈاکٹر محمود خاں افشار کی ایک نظم "شبِ مہتاب" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شبے از نورِ مہ چوں روزِ روشن — فروزندہ ہمے گستردہ خرمن
تو گفتی آسماں طاقے بلند است — چراغِ مہ بداں طاق است آدن
دیا مانند آتیانوس آرام — مرتاہاں بسانِ پرِ توانگن

زبان کس قدر سلیس ہے اور تشبیہات بہت قریب کی مگر کس قدر موزوں اور جاذب۔

۲۔ زبان کی توسیع کو مدنظر رکھ کر خارجی زبانوں کے صدہا الفاظ مفرس کر کے یا یوں ہی استعمال کر دئے ہیں ؎

دریغت آسمانم لایک ستارہ نیست — نامے زمن بپرسل ایں ادارہ نیست
بے اعتنا بہیئت کابینۂ فلک — گردیدہ ام کہ پارٹی آم یک ستارہ نیست
(میر محمد رضا عشقی)

یا مثلاً فرخی یزدی کے ایک مسمط سے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اے دموکرات بت باشرفِ نوع پرست — کہ طرفداری مارنجبرال خوئی تو نیست

چند شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

روز و شب از شش جہت تو سیسل در نوا — چوں کبوتر صف زدہ ایدپلی نہادر ہوا

یورپی الفاظ خصوصاً فرانسیسی زبان اور اس کے مصطلحات کثرت سے ایرانی ادبیات میں داخل ہو گئے ہیں کہیں کہیں تو ان کی ایسی بھرمار ہوئی ہے کہ زبانِ قدیم کے قدردانوں کو ایران کی جدید شاعری کچھ سے کچھ نظر آنے لگی۔ مرزا ایرج کی ایک نظم ملاحظہ ہو ؎

بسکہ در لیوبو و ہنگام لت — دوسیہ کردم و کارمن ترتیب
بسکہ محت دادم و ایکت کردم — اشتباہ بروت دت کردم
سوزن اردم دسنجاق زدم — پونز و پنس بادراق زدم
ہی نشستم بہناعت پس میز — ہی تپاندم دوسیہ لائی شیر
ہی پاراف ہشتم و امضا کردم — خاطر مدعی ارضا کردم
گاہ با زنگ زمانے باہو — پیش خدمت طلبیدم بہ بورو
تو بمیری ز آمور افتادم — از شرر شور دشعور افتادم
چکنم زانہمہ شیفر و نومرو — نیست در دست مرا غیر زرو
ہی بدہ کارتن دبستان روسیہ — ہی بیار از در دکاں نسیہ

---

۱ PERSONAL
۲ CABINATE
۳ PARTY
۴ DEMOCRAT
۵ ہوائی جہاز
۶ L. LIUER جاڑا
۷ LETE گرمی
۸ DOSSIER فائل
۹ CORTONE بڑا فائل
۱۰ TRAITE مرتب کرنا
۱۱ NOTE یادداشت
۱۲ INQUETE تفتیش کرنا۔
۱۳ BRUT خادم
۱۴ PUANISE آپسن
۱۵ PINCE کلپ
۱۶ CHEMISE لفافہ
۱۷ PARAPHE (INITIAL) چھوٹا دستخط
۱۸ BUREAD دفتر
۱۹ AMOUR عشق
۲۰ CHIFFER عدد
۲۱ NUMERO نمبر
۲۲ ZERO صفر

اس کے علاوہ اس قسم کے دوسرے الفاظ نئے قالب میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں مثلاً خطِ آہن (لوہے کی پٹری)، جوانانِ نظامی (پولیس کے نوجوان)، حکومتِ مشروطہ۔ عصرِ مشعشع (دورِ تمدن) دوچرخہ (بائسکل)، وغیرہ وغیرہ

۳۔ جملہ اصنافِ نظم میں مسمط کا رواج بہت زیادہ ہے خصوصاً مخمس ہر بند کے پہلے تین مصرعے ایک قافیہ میں ہوتے ہیں اور یہ قافیہ ہر بند میں بدلتا رہتا ہے چوتھے اور پانچویں مصرعے کا قافیہ اول سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے مخمس کو عملی جامہ دراصل قاآنی نے پہنایا لیکن اس کے مخمس پرانے طرز کے ہوتے ہیں۔ آج کل کے مخمس کا طرز یہ ہے ؎

از چیست چنیں بیچارہ شدیم — کوتہ دست و غم خوارہ شدیم
از خانۂ خود آوارہ شدیم — نادیدہ چو ماکس در بدری

ہُوَ حق مددی مولا نظری

(پورِ داؤد)

مسمط کے بعد مستزاد کا نمبر ہے۔ قدیم شاعری میں اس کا رنگ رباعی کے ساتھ مخصوص تھا مگر اب عام ہے۔ اس دور میں مستزاد کی ایک صورت "مستزاد در مستزاد" ہوگئی ہے ؎

اے وطن پرورِ ایرانی با مسلک دہوش — ہاں مکن جوش و خروش
پندہائے من با تجربہ بنمائے بگوش — گر توئی پند نیوش
اجنبی گو بشل سیدہت — ساغر نوش
نوش نیش است نوش
وز پی خستن او بہر ہادوقات — بکوش
تا تواں واری دوش
کہ عدو دوست نگردد بخدا گر بنی ست — اجنبی اجنبی ست

من سرگشتہ چو پرکارِ جہاں گردیدم — رنج ہا بکشیدم
پا برہنہ رہِ دشت و درہ را بریدم — دستِ غم بگزیدم
حالتِ ملتِ عثمانی و ژرمن دیدم — خوب دید بشنیدم
باز برگشتہ ز اجنبیاں نومیدم — حالیا فہمیدم
کہ اگر شیخ خورد گول اجانب صبی ست — اجنبی اجنبی ست

(فرخی یزدی)

(۴) عروض میں یورپی شاعری کا تتبع ہو رہا ہے۔ ایک ہی نظم میں قافیہ اور ردیف کا بدل دینا تو عام ہو رہا ہے۔ مگر ایک ہی بند میں بحر کا بدل دینا بھی رواج پذیر ہو رہا ہے

بخواب اے دختر زیبا — بالام لائے لائے — لالام لائے لائے
میان محفل دیبا — بالام لائے لائے — لالام لائے لائے
دو چشمانت بہ بند امشب — بروئے من مخند امشب — بالام لالا لالا — لالام لالا لالائے
کہ مے بینی گزند امشب — بالام لائے لائے — لالام لائے لائے

مساجد گشتہ ویرانہ — معابد گشتہ مے خانہ — وطن پر شد ز بیگانہ
بالام لائے لائے — لالام لائے لائے — بخواب اے دختر شیریں ادا بنگر بکیر

بالام لائے لائے — لالام لائے لائے
بے بے جزی دریں ہمران — مرا خشکیدہ ہیں پستان
تو بے سیرنی و من بے نان — بالام لالا لالا — لالام لالا لالائے

اس نظم میں تمام مصرعے ایک بحر میں ہیں لیکن لالام لائے الخ دوسری بحر میں ہے۔

(۵) فارسی قدیم میں اگرچہ طنزیات کی کمی نہ تھی لیکن یورپی طرز کے سٹائر (SATIRE) کا مخصوص رنگ عہدِ حاضر ہی کی ایجاد ہے۔ اس قسم کی نظمیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ اشرف الدین رشتی کی نظم "خطاب بغزنمیاں" اس صنف کی بہترین نظم ہے ؎

اے فرنگی ما مسلمانیم جنت مالِ ماست — در قناعت حور و غلماں نازِ نعمت مالِ ماست
اے فرنگی اتفاق و علم و صنعت مالِ تو — عدل و قانون و سادات و عدالت مالِ تو
نقل و عالمگیری و جنگ و جدلاوت مالِ تو — حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مالِ ماست
خواب و راحت عیش و عشرت ناز و نعمت مالِ ماست

گر زنی بے سیم از دریا بساحل تنگ ناف — گر کنی ظلمِ غرا نانون و سنما تو گراف
در نمائی بہر خود اداطلس و مخمل لحاف — سندس و استبرق اندر باغ جنت مالِ ماست
استراحت خواب راحت عیش و عشرت مالِ ماست

روحانی کی نظمیں حماسی[1] تھیں۔ اور دیوان عدالت[2] بھی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وطنی۔ قومی۔ جذباتی اور نظری شاعری اس عصر کی خصوصیات ہیں۔

ایران کی جدید شاعری کی حسب ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں :-

وطنی اور قومی شاعری

موجودہ صدی میں جس صنفِ نظم نے شاعری کے مردہ کالبد میں از سرِ نو روح پھونک دی ہے اور جس نے مشرقی شاعری کے مخالفین اور معترضین کی نگاہوں میں بھی اس کی اہمیت قائم کر دی ہے۔ وہ محض قومی اور وطنی شاعری ہے بیسویں صدی سے پیشتر قومی شاعری کا وجود فارسی شاعری میں مطلقاً نہ تھا۔ اور ہوتا کیونکر کیونکہ اس قسم کی شاعری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ملک کسی غیر قوم کے تسلط میں ہو یا خود اپنا بادشاہ ظالم و سفاک ہو اور ساتھ ہی ساتھ قوم کو اپنی غلامانہ زندگی۔ یا اپنے بادشاہ کے مظالم کا احساس بھی ہو۔ اور اس سے گلو خلاصی کی فکر دامنگیر ہو،

[1] قطعہ وطنی [2] وطن

چنانچہ ایران میں بھی اس قسم کی شاعری کا وجود اسی جذبہ کا ممنون احسان ہے ایرانیوں نے استبدادی حکومت کو مشروطہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اسی وقت سے شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ وطنیت اور حریت کے جذبات نظم ہونے لگے۔ چنانچہ ادیب نیشاپوری۔ مرزا ابراہیم خان پوردادود حبیب یغمائی حسام زادہ[1] بازارگاد سید اشرف الدین نسیم شمال۔ عارف قزوینی۔ عبدالعظیم گرگانی۔ فرخی یزدی مرتضےٰ خاں فرہنگ محمود طرزی وغیرہ وطنی جذبات نظم کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ جناب پوردادود کی ایک وطنیہ نظم رستخیز کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

ہل شیشۂ مے بگیر شمشیر — از گیسوئے یار بند مپذیر
بشتاب کہ نوبت رسی دیر — اے سست نہ ہم درنگ سست

برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

از مہر وطن بجان بکوشیم — در رزم میان پیل بجوشیم
چوں شیر ز رزم ہم بخروشیم — گر دشمن اژدر و پلنگ است

برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

اسی طرح آپ کی دوسری نظمیں۔ نوائے بومی۔ ایرانیاں ایرانیاں وغیرہ وطنی اور قومی جذبات سے لبریز ہیں۔ حسام زادہ پاشارگادی کی ایک نظم سرود کودکان ملاحظہ ہو جس میں وطنی اور قومی جذبات ہونے کے علاوہ موسیقیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے ؎

ما کودکان — بہر ایران — باید کوشیم از دل و جان
علم و ہنر — موجب فخر — ما گردد — در دو جہان

سعی و عمل رہبر ما باشد اے فرزند کیان
فخر و شرف شغل ما۔ دریں ماہ تیرہ و میان

ما — نو — باد — گان۔ دبستان از بہر ایران
باید — کوشیم — از — دل و جان ہوتا....

سید اشرف الدین (نسیم شمال) کی نظم بیکس وطن کا ایک بند ملاحظہ ہو کہ کس غضب کا درد اور جوش وطن ہے ؎

اے باغ پر شگوفہ گل و یاسمن چہ شد
آں نزہت و طراوت سرو چمن چہ شد
برما شقان کشتہ مزار و کفن چہ شد
گریاں بحال زار تو مرغ ہوا وطن

بیکس وطن۔ غریب وطن بے نوا وطن

دردا رسید سیل فتن دا محمدا
نبود کسے بفکر وطن دا محمدا
در وحشت است روح زتن دا محمدا
اے تابع شریعت خیر الورے وطن

بیکس وطن۔ غریب وطن بے نوا وطن

اسی طرح عارف قزوینی کی یاد وطن۔ عبدالعظیم گرگانی کی وطن، ایران، فرخی یزدی کی سقط وطنی۔ اے دموکرات۔ اے وطن پرور..... فرہنگ کی کارکن در وطن.... خاک ایران۔ محمود طرزی کی وطن، آہ اسلام وغیرہ بہترین قومی اور وطنی نظمیں ہیں۔

ڈرامائی شاعری

اس قسم کی شاعری کا اطلاق اگرچہ فارسی کی قدیم مثنویوں کے جستہ جستہ ٹکڑوں اور بعض مخصوص نظموں پر ہو سکتا ہے چنانچہ "نظامی" اور "خسرو" کی مثنویوں میں اس کا رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے بمثلاً لیلیٰ مجنوں اور شیریں و خسرو کی مثنویوں میں مناظر قدرت کی صورتیں۔ خزاں اور بہار کے مناظر لیلیٰ کا حسن و جمال۔ واردات عشق نظارۂ حسن وغیرہ کے بیانات اور مکالمے ایسے ہیں جن میں ڈرامائی شاعری کی بہت کچھ جھلک پائی جاتی ہے لیکن اصل ڈرامائی شاعری جو موسیقی کے ساتھ یا بغیر موسیقی پڑھ کر سنانے یا اسٹیج پر اداکاری کے ذریعہ پیش کرنے کی غرض سے لکھی جائے۔ جدید ایرانی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ قاآنی کا ایک منظوم مرثیہ جس میں ڈراما اور مکالمہ کا رنگ پایا جاتا ہے ملاحظہ ہو ؎

بار دچہ؟ خون، کہ؟ دیدہ چساں؟ — روز و شب چرا؟
از غم، کدام غم؟ غم سلطان — اولیا؟
نامش چہ بود؟ حسین! نژاد کہ؟ — از علی!
مامش کہ بود؟ فاطمہ! جدش کہ بود؟ — مصطفےٰ!
چہ شد؟ شہید شد! بہ کجا؟ — دشت ماریہ
کے؟ ما شرحرم؟ پنہاں؟ — نہ بر ملا

اس کے بعد دوسرے شعرا نے اس طرف بہت کم توجہ کی۔ البتہ روحانی امیر محمد رضا اشتی مرحوم اس کے علم بردار ہوئے۔ غلام رضا خاں روحانی نے

---

[1] چند کلمہ پیرامون امروز ایران

[2] بیکس وطن۔ شاہ وطن کوشش بنمود کہ

ایک اوپیرا "پیس مفصلین ضعیف" نظم کیا اور چند قطعات ڈرامائی طرز میں نظم فرمائے جو تھیٹر کمپنیوں میں بے حد مقبول ہیں۔

عشقی مرحوم کی نظم "ایدہ آل" ایرانی ڈرامائی شاعری کا بہترین نمونہ ہے تین پردوں کا مختصر سا منظوم ڈراما ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک بڈھا حریت اور آزادی کی راہ میں اپنے دو لڑکے قربان کرتا ہے۔ اس کی لڑکی مریم ایک جوالہوس نوجوان کے عشق کا نشانہ بنتی ہے۔ جوان اور مریم کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

جوان :۔ سلام مریم سہ پارہ۔

مریم :۔ کیست ایوائی ؟

جوان :۔ منم مترس عزیزہ ازچہ وقت ایں جائی ؟

مریم :۔ توئی عزیزہ دلم بچہ دیر میائی ؟

سپس درآں شب سہ آں شب تمامشائی

اسی قسم کی گفتگو کے بعد نوجوان شراب کی بوتل نکالتا ہے اور مریم کو پیش کرتا ہے۔ مریم انکار کرتی ہے ؎

مریم :۔ ہزار مرتبہ گفتم نمی خورم من ازیں

جوان :۔ بخور کہ نیست ازیں بہ شراب اندر دہر

مریم :۔ برائے من کہ نہ خوردم بتر بود از زہر

شراب خوباست امابرائے مردم شہر ؎ کہ ہست خوردن نان از تنور و آب از نہر

نشاط و عشرت ما مردمان کوہ نشیں

شہریوں کی زندگی پر طنز خالی از لطف نہیں۔

عشق کا انجام حسرت و ناکامی ہے چنانچہ مریم اس دار فانی سے کوچ کرتی ہے۔ اس کا باپ آتا ہے اور آہ و زاری کرتا ہے۔ اس کا نالہ و شیون ملاحظہ ہو :۔

بزیر خاک سیہ خام مریم۔ اے مریم چہ خوب خفتہ بآرام مریم اے مریم

برستی از غم ایام مریم۔ اے مریم بخواب و خترِ ناکام مریم اے مریم

بخواب تا ابد اے دختر اندریں بستر

تیسرے پردے میں بڈھا اپنی داستان سناتا ہے جس میں ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح وہ اراکین سلطنت کے جبر و ستم کا شکار رہا۔

اسی قسم کی دوسری تصنیفات رستاخیز سلاطین ایران اور خرابہ ہائے مدائن ہیں جن میں سلاطین ایران کی تباہی کے نظارے اور وطن پرستی کی تحریک ہے۔ خرابہ ہائے مدائن کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر براؤن نے ایس تارا پوروالا نے کیا ہے، اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہو گیا۔

بیانیہ شاعری

فن شاعری کی یہ صنف تمام دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ خیز معین ہے۔ اس میں افعال اور اعمال انسانی میں سے کوئی سا ایک فعل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے بعض اوقات رزمیہ شاعری سے تشابہ ہو جاتا ہے اور اس میں ڈرامیٹک پوئٹ منظومات کی طرح جزئی حالات کی تفصیل بھی شامل ہو سکتی ہے۔ فارسی زبان میں اس قسم کی شاعری کا ذخیرہ بہت کافی تھا لیکن جدید شاعری میں بیانیہ نظموں کا معیار اور بلند ہو گیا ہے۔ نئے نئے الفاظ اور جدید طرز کی خرابیاں کچھ اس طرح رکھا ہے کہ وہ بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ جناب افشار کی ایک نظم "شب ماہتاب" کے کچھ اشعار لکھے جا چکے ہیں۔ جناب فلسفی کے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شب افگندہ بر روئے گردوں نقاب بتاریکی اندر شدہ آفتاب

ز ابر سیہ روئے گردوں چو قیر نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر

شبے در سیاہی و تنگی چو گور ز تاریکیش چشم بینندہ کور

بہ گیتی دگر دوں نہ بینی فروغ تو گوئی کہ خورشید باشد دروغ

اندھیری رات کا بیان کس قدر دلچسپ اور موزوں الفاظ میں کیا ہے۔

مرزا غلام رضا خاں روحانی کی ایک نظم جو انھوں نے دوچرخہ (بائسکل) پر لکھی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

مرکبے دارم و ایں طرفہ کہ باشد خود رو نہ علف خواہد و نہ یونجہ و نہ کاہ و نہ جو

چار شاخ است مرا اسپ و بہ بالا دو بزیر تا بانہا نہ نہم دست نہ گردد ہرو

سائیکل کے لیمپ اور بجلی روشنی کو بیان فرماتے ہیں ؎

ہست اندر شب تاریک دو چشمش روشن یک چشمے بعقب دارد و چشمے بجلو

ہست یک چشمش چوں زہرہ و یکچشمش مریخ پائے او ماہ تمام است و دمش چوں سہ نو

سائیکل رانی کا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ دوسری سواریوں کی طرح ہشو بچو، خبردار سے کے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ؎

خود زند بانگ چو انگشت بگوشش بزنم خود کند بہر خبردار چو سنگ با ہو ہو

کارگر و کارفرما مادہ قلب مادہ (ایرج مرزا) طلب بھوج۔ اشک یتیم (بدیع الزماں خراسانی) پازار کاہ (صمام زادہ) زارع۔ شب ماہتاب (رکھبا) البرز (افشار) پیر زال از خانماں دور (دو گھڑا) توصیف بہار (رعدی) شب آسمان۔ گل بیش رس وغیرہ بہترین بیانیہ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ صدہا نظمیں ہیں

ideal

جو عارفوں، مقربوں۔ قدرتی مناظر پر مشتمل ہیں جن بیان اور دل کشی میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

اخلاقی اور اصلاحی نظمیں

اس قسم کی نظموں میں شاعر کا مطمح نظر دنیا کو کسی اخلاقی سبق کا سکھانا کسی مذہبی عقیدے کا سمجھانا یا کسی فلسفیانہ خیال کی توضیح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ گویا شاعر ایک ریفارمر اور مصلح کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے اور ایک معلم کی خدمات انجام دیتا ہے۔ دیگر فنون لطیفہ کی طرح شعر کا بنیادی مقصد اخلاق انسانی کی آراستگی ہے۔ اگرچہ اخلاقی شاعری کا ذخیرہ ہر زبان میں محدود رہا ہے لیکن فارسی شاعری کو اس باب میں تمام دنیا کی زبانوں سے زیادہ فروغ حاصل ہے۔ سعدی شیرازی کی خالص اخلاقی شاعری اس نوع کا قابلِ رشک کارنامہ ہے لیکن عصرِ حاضر کے شعراء نے اس میں جار چاند لگا دئے ہیں۔ اس دور میں شعراء نے انھیں چیزوں میں اصلاح کرنا اپنے ذمے لیا ہے جن سے ان کے خیال میں قوم اور ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے مثلاً حقوقِ نسواں کی پامالی کو دیکھ کر مرزا محمد کسمائی نے ایک نظم بعنوان "تسویۂ حقوق زن و مرد" لکھی۔ اس کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

در مملکتے کہ زن بہ قانون — با مرد حقِ سخن ندارد
گر مرد شمن ہیت زن بگیرد — او جرأت چہ و چون ندارد
در موقع عقد بستن او — اصلاحِ ایں و آن ندارد
دیگر چہ تساوی حقوق است — آقائی مقالہ سازیں کن
اندر عنکبوتِ خو نخوار — کمتر تعریف از مگس کن

روحانی کی ایک نظم "در ترکِ اشیاء تجملی" کے چند شعر ملاحظہ ہوں جس میں انھوں نے نمائش اور تکلفاتِ لایعنی سے احتراز کرنے کی نہائش کی ہے ؎

ایں ہمہ اشیاء کہ کمیر سدا فرنگ — عرد سک جور جور منجمہ رنگ رنگ
پس آنگہ اندر عوض ز مملکت ہیدرنگ — قران رود مشت مشت لیرہ رود بہ چنگ
نقرہ رود کوہ کوہ طلا رود بار بار

اسی طرح چند بند لکھنے کے بعد فرماتے ہیں ؎

بجانب اقتصاد اگر گزاری قدم — متاع ایران شود درہمہ جا محترم
کند بہ پیش دول و ملت ما قد علم — ملک ما زد سعید شود میان امم
شوکتِ ما مستدام قدرتِ ما برقرار

لہ عالی

غنائی شاعری

اس صنف کی شاعری کی کمی کسی دور میں نہیں رہی۔ قدیم فارسی میں غزل یہ خدمت انجام دیتی رہی لیکن دورِ جدید میں بذاتِ خود ایک مستقل صنف بنگئی ہے۔ چنانچہ ملک الشعرا بہار کو اس قسم کی نظمیں لکھنے میں خاص دسترس حاصل ہے۔ اور ان کی نظمیں گرمیونوں میں ضبط ہوتی ہیں۔ ان کی گرمیونوں والی ایک نظم ملاحظہ ہو ؎

زمن نگارم خبر ندارد — بحالِ زارم نظر ندارد
خبر ندارم من از دلِ خود — دلِ من از من خبر ندارد
کجا رود دل کہ دلبر شیست — کجا پرد مرغ کہ پر ندارد
ماں از ایں عشق فغاں از ایں عشق — کہ غیر خونِ جگر ندارد
ہمہ سیاہی ہمہ تباہی — مگر شبِ ما سحر ندارد
بہارِ مضطر بنال دیگر — کہ آہ و زاری ثمر ندارد

ترانہ ہائے جناب روحانی کی تصنیف اور ان کی غنائی شاعری کا مجموعہ ہے۔ حسام زادہ پادارگاہ کی وطنی نظم "سرودِ کودکاں" جس کا ایک بند لکھا جا چکا ہے غنائی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ عبد العظیم خاں گرگانی کی نظم "وطن" جو طلبائے اسکول کے ورد زبان ہے اور گرامو فونوں میں بھی ضبط ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

کشورِ ما کشورِ ایران بود — مسکنِ شیران و ویران بود
پادشہش کورس و دارا بود — چوں جم و خسرو شہ والا بود
پادشہ عادل او نیشیروان — گشتہ پرآوازہ ز عدلش جہاں

اسی طرح فرمانے کے بعد لکھتے ہیں ؎

اے وطن، اے حبِ تو آئینِ من — دوستیت کیشِ من و دینِ من
مے تو و جو و بن یک، دم مباد — سایۂ تو از سرِ من گم مباد

ایران کی جدید شاعری

ایران میں بھی پردے کا مسئلہ معرضِ بحث میں ہے اور وہاں بھی مخالفین کی تعداد کم نہیں چنانچہ ڈاکٹر افشار نے ایک نظم پردے کی مذمت میں بعنوان "عفت" نظم فرمائی۔ اس کی مخالفت جناب محمد کسمائی صاحب نے فرمائی (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵۱) حسام زادہ کی ایک نظم "غرق در لجہ . . . ." بھی اسی موضوع پر ہے۔ اسی طرح صدہا اصلاحی اور مثلی نظمیں ہیں۔ جن میں بزرگ ترین گناہ (پور داؤد) درویش شورغی، خطاب بدختران مشرق۔ تریاکی وشیرہ وغیرہ بہت مقبول ہوئیں،

لہ ملاحظہ ہو سخن دران و عصرِ حاضر۔ جلد اوّل صفحہ ۸۱

دولت و اقبالِ تو پاینده باد نام بلندت بجهان زنده باد

یوروپی طرز کی شاعری

اس صنف کے تحت میں وہ تمام اشعار آسکتے ہیں جو یوروپی طرز مثلاً سانیٹ سٹائر وغیرہ کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ یا یہ کہ یوروپی بحروں میں نظم کئے گئے حسام زادہ پانارگاہ کی ایک نظم یوروپی طرز میں جو انھوں نے طلبائے مدارس کے لئے نظم فرمائی ہے ملاحظہ ہو ؎

اے غنچۂ ناشگفتہ در باغ اے لوگل زیب بوستانی
اے جلوۂ باغ در دلق راغ وائے ہمدم روح آسمانی
وائے قلبِ تو پاک تر ز گوہر
وز عطر صفائے دل معطر
امروز مراست شکوۂ چند روئے سخنم بتو است امروز

اسی طرح قوم کی حالت بیان فرمانے کے بعد بچوں سے فرماتے ہیں ؎

ہشدار گوسل نہ یکدگر دام در رہگذر تو دامہا ہست
در دفتر روزگار و ایام از نیک و بد تو نامہا ہست
ہشدار کہ دیو رہ نہ بندد
بدخواہ بروئے تو نہ خندد
چشم ہمہ خیرہ خیرہ بر تو است برخیز کنوں دمِ عقب خواب است
آں گوہر بیشہا ہوار رفتاست دیگر کہ نہ طاقت و نہ تاب است
دیدست چہ چنیں؟ بروں آئی
وآں گوہر و اصل خویش بنمائی

عارف قزوینی کی ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہنگامہ ے وصل گل دگشت (جانم گشت و جانم گشت و) چمن شد
در بادِ بہاری تہی از زاغ و (جانم زاغ و ضد از زاغ و) زغن شد
از ابرِ کرم خطاری رشکِ ختن شد
دل تنگ چو من مرغ (جانم مرغ) قفس بہر وطن شد
چہ کجو فتاری اے چرخ، چہ بدکرداری اے چرخ ہر کیں داری اے چرخ
نہ دین داری، نہ آئین داری، (نہ آئین داری) اے چرخ

آپ اس طرز کی نظمیں ڈھالنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں چنانچہ آپکی اکثر نظمیں اسی طرز میں ہیں۔

ملک الشعراء بہار کی قلب شاعر۔ مرغ سحر۔ دیہاتی۔ قطعہ وطنی

SATIRE ۹۲ SANNET ۹۲

اس طرز میں بہترین نظمیں ہیں۔

یہ ہے مختصر حال اس ایرانی انقلاب کا جس نے تمام چیزوں میں انقلاب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبیات میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ اور یہ ہے مختصر کیفیت ایران کی جدید شاعری کی جس کو انقلابی شاعری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

قارئین کرام اندازہ فرما سکتے ہیں کہ چند ہی سال کے عرصے میں ایرانی شاعری کہاں سے کہاں پہنچ گئی +

اظہر علی فاروقی

رباعی

یہ چشم ہم اور وہ شغول کرشمہ
دل بحث و نزاع اور یہاں شکر شوخ
میں کنجِ خرابات میں سب سے فارغ
ساغر لئے دیکھتا ہوں خوابِ ہشت

اعجاز

ہر سائز کے کتب خانے و غیرہ
ملنے کا پتہ
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
مکمل فہرست مفت
طلب کریں۔

اشکبارِ فراق سے

مرے الم میں نہ ہو اشکبار جانے دے
خزاں قبول نہ کر اے بہار! جانے دے

یہ زردِ حُسنِ محبت، یہ سُرخ دیدۂ شوق
یہ اہتمامِ شبِ انتظار جانے دے

نہ باندھ رات کے دامن سے دامنِ فریاد
کرم! کرم! مرے اختر شمار جانے دے

نگاہِ حُسن طلب ہو نہ جائے شرمندہ
تصورات کا کیا اعتبار جانے دے

تری حیا کے تصدق تری وفا کے نثار
لٹا نہ اپنا سکون و قرار، جانے دے

نہ پھینک کاہکشاں پر کمندِ نالۂ غم
شبِ چمن کو نہ کر سوگوار جانے دے

نظر فروزِ جوانی کو پائمال نہ کر
نہ کر بہار میں خونِ بہار جانے دے

فلک نشین ستاروں کے دل نہ رُک جائیں
پکار مجھ کو نہ دیوانہ وار جانے دے

میں گر رہا ہوں کہ تُو اور دم بھرے میرا
بس اور مجھ کو نہ کر شرمسار جانے دے

مری حیاتِ حزیں میں بشاشتوں کو نہ ڈھونڈ
مری خزاں میں نہیں ہے بہار جانے دے

نہ اس طرح مجھے ممنون کر کہ مر جاؤں
فقیر پر یہ کرم شہریار جانے دے

احسان دانش

شیخ صاحب

شیخ صاحب کون تھے؟ اگر کوئی شیخ صاحب جو اپنے نام کے ساتھ شیخ . . . صاحب لکھنے کے عادی ہیں اس کردار کو اپنے نام کی طرف منسوب کریں گے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت برآئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب ایک عجیب گھپم گھپا انسان ہیں جن کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیا ہیں، جو خصلتیں تیس کروڑ انسانوں میں علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں وہ سب ان میں اللہ میاں نے زبردستی اکٹھی کر دی ہیں، انہیں "شیخ تیس کروڑ" کہنا تو بالکل بے معنی ہے کیونکہ یہ نہیں کہ وہ بے نام ہی پیدا ہوئے ہیں ان کا نام تو ضرور ہے اور صرف ان کا نام ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے ان کا ساتھ دے رہا ہے ورنہ بعض اوقات تو ان کا سایہ بھی ان سے دور بھاگتا ہے، آپ کا نام صرف فخر الزمان ہے لیکن آپ کبھی کبھی محض اس وجہ سے کہ لوگ سوء ادبی سے کام نہ لیں اپنے نام کے ساتھ "شیخ الشیوخ" لکھ دیا کرتے ہیں، خدانخواستہ ان کا مقصد شیخی مارنے کا نہیں اور اگر ہو بھی تو جہاں اتنے لوگ دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے بقول کسے ۴۲۰ سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ایسا کر بھی دیا تو اس سے ان کی شان کم نہیں ہو سکتی خوبی تو یہ ہے کہ آپ انسان ہونے کے علاوہ عجیب انسان ہیں ——— ایک نادر و مجسم اضداد! تضاد دم تو ہر ایک انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ لیکن آپ کہا کرتے ہیں کہ جب تک ہولناک تضاد دم نہ ہو تو خوبی ہی کیا ہوئی! ہاں تو آپ کا اسم گرامی شیخ فخر الزمان ہے۔ رہنے والے آپ اس طرف کے ہیں جس کا ذکر آپ کے لئے سوہان روح ہوتا ہے، باتوں ہی باتوں میں ٹال جاتے ہیں۔ بھئی! ہمیں لاہور میں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ اب ہمیں یہیں کا سمجھنا چاہئے۔" معلوم نہیں اس راز میں کیا پردہ ہے۔

لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب لاہور میں انقلاب پسندوں نے شورش برپا کر رکھی تھی تو آپ کو ڈی اے وی کالج کے گرد گھومتے ہوئے پولیس نے آ دبوچا۔ آپ کے اس جواب نے کہ "مجھے لاہور کا ہی سمجھنا چاہئے" پولیس کے شک میں دو چند اضافہ کر دیا۔ محض "اس سمجھنا چاہئے" کی بدولت آپ آٹھ دس روز تک حوالات کی ہوا کھاتے رہے، تو اس بات پر فیصلہ ہوا کہ آپ کے وطن کے متعلق یا تو خدا کو علم ہے یا شیخ صاحب کے باپ کو باقی رہی شکل و صورت تو اس کے متعلق بھی کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی، دنیا کی ناپائیداری کا ان کے چہرے پر اتنا اثر پڑا ہے کہ ان کے رخ مبارک کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کہنا زیادہ موزوں ہوگا، صبح کے وقت بدصورت اور شام کو حسین معلوم ہوتے ہیں اور کبھی شام کو کریہہ المنظر اور صبح کو سجیلے جوان دکھائی دیتے ہیں، بنیادی طور پر چہرے کی ساخت بالکل قطبی ہے یعنی پیشانی ہمالہ کی طرح کشادہ اور ٹھوڑی راس کماری کی طرح نکونی ہے۔ البتہ اس پر نائشی تبدیلیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں کبھی کرزن فیشن اور کبھی اچھا خاصا ڈاڑھا کبھی فرنچ کٹ اور کبھی فلسطینی قطع کبھی آدھی مونچھ اور کبھی پوری۔ لباس میں بھی وقت کی راگنیاں گاتے ہیں۔ سوٹ بھی پہنتے ہیں قمیص شلوار بھی، پلس فور بھی پہنتے ہیں اور تہبند باریک کرتے کے ساتھ بھی، گو کسی تہوار میں اعتقاد نہیں رکھتے لیکن عید میلاد کے دن خاص طور پر چھ دفعہ لباس بدلتے ہیں، گو محلے والوں سے زیادہ راہ و رسم نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ساری دنیا خصوصاً محلے والے مطلب پرست اور خود غرض ہوتے ہیں لیکن لباس تبدیل کرنے کے بعد ضرور ہر ایک کو سلام کرتے جاتے ہیں کبھی کبھی بالکل ننگے زنہ بند ضرور ہوتا ہے) بھی بھاگ کر ڈاک خانے سے ٹکٹ لے آتے ہیں لیکن اس صورت میں کہ ٹکٹ انہیں خود استعمال کرنا ہو ورنہ ایک دن بیوی صاحبہ نے کہہ دیا تو دانت دکھا دکھا کر ڈاڑھی ہلا ہلا کر (ان دنوں ڈاڑھی رکھی تھی) دانت پیس پیس کر کہنے لگے "دیکھتی نہیں کس حال میں ہوں۔ ایسے چلا جاؤں تو ڈاکخانے والا بابو مجھے گاؤدی ہی سمجھے گا نا! اور تم تو یہی چاہتی ہو! میرا سوٹ جلدی نکال میں ابھی لائے دیتا ہوں"

جب انھوں نے سوٹ کا نام لیا تو بیوی نے ٹھنڈا سانس

لیا کیونکہ پندرہ منٹ میں محلے کے لال بکس سے ڈاک نکلنے والی تھی اور وہ کم از کم آدھ گھنٹہ سوٹ پہننے کے لئے صرف کرنے والے تھے۔

"آپ تکلیف نہ کیجئے، میں بیرنگ ہی بھیج دیتی ہوں"

"میں تمہارے باوا کو نہ جانتا ہوں تو کچھ بات بھی ہے، آخر دو آنے مجھے ہی دینے پڑیں گے، نیز ایک دفعہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم سوٹ پہنیں گے تو ہر صورت میں پہننا ہی ہوگا"

سوٹ آیا تو پتلون میں ایک شکن دیکھ کر ملتے پر شکن آگیا۔

"لو ناگرم ہے؟ کہاں ہوگا اس وقت گرم! اچھا تو ٹھنڈا ہی اٹھا لاؤ"۔

ٹھنڈا لوٹا پورے بل بوتے کے ساتھ آٹھ دس دفعہ پتلون پر اس طرح رگڑا کہ پسینہ آگیا، شکن دور ہوا یا نہ ہوا لیکن انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا،

عادات متضاد اور جذبات سینے میں ہچکولے کھاتے ہیں، پل میں ماشی اور پل میں چیخڑی بایوں کہئے کہ پل میں مولانا شوکت علی اور پل میں مہاتما گاندھی کبھی میز پر، کبھی فرش پر اور کبھی چولہے کے سامنے بھی کھانا کھا لیتے ہیں، پبلک کے خلاف انہیں شکایات ہیں بھی اور نہیں بھی کسی وقت تو اپنے آپ کو "شہید قوم" بھی کہہ لیتے ہیں اور کسی وقت ساری قوم کو جہنم میں دھکیلتے ہیں کبھی احرار کی تعریف میں انقلاب فرانس کی مثال پیش کرتے ہیں اور کبھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر تصور کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ سارے لیڈر قوم کا روپیہ کھاتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ کھائیں تو ان کا گزارا بھی کیسے ہو۔ اسی دن سے آپ تمام اخبار نویسوں کو "نامعقول" کہتے ہیں جس دن سے آپ کا ایک مضمون محبوبہ کی قبر پر ایک مقامی روزنامے نے واپس کر دیا تھا، صبح اٹھ کر کالج کو جانے والی چھوکریوں کو گہری نظروں سے دیکھتے بھی ہیں اور جو دیکھتے ہیں انہیں برا بھی کہتے ہیں، کبھی شیکسپیئر کی مدحت سرائی کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اس بھڑوے کو آتا ہی کیا تھا، کبھی اپنے آپ کو افلاطون سے اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں، چوبیس گھنٹوں میں ساڑھے تین گھنٹے شاعر ہوتے ہیں باقی وقت سب کچھ، اکثر کہا کرتے ہیں "دنیا میں ہر ایک شخص ایک دوسرے کو دھکا دے رہا ہے" اور اس وقت اپنے کو اس دنیا سے بہت دور سمجھتے ہیں، یورپ کے سیاسیات کا مزے لے لے کر ذکر کرتے ہیں، کبھی وہاں کے سیاست دانوں کو عیار کہتے ہیں اور کبھی نامعقول، کبھی دلیر کہتے ہیں اور کبھی بزدل، کبھی کہتے ہیں کہ بس لڑائی ہوا چاہتی ہے، کبھی کہتے ہیں کہ جب تک انگریز قدم نہ بڑھائیں لڑائی نہیں ہو سکتی، غرضکہ آپ کے تضاد اور تصادم کی فہرست بہت لمبی ہے اور آپ جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتے ہیں اس کا بیان سوہان روح بن کر رہ جائے گا۔ لیکن اتنا بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان ہچکولوں کے باوجود آپ نہایت مستقل مزاج ہیں یعنی جب ایک خیال آپ کے ذہن میں جا گزیں ہو گیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے باہر نہیں نکال سکتی خواہ وہ عرصہ ایک گھنٹے کا ہی کیوں نہ ہو۔

آج بڑے گھمسان کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ اپنے کمرے میں ٹہل رہے ہیں، آج کل آپ کی ڈاڑھی مونچھیں صفاچٹ۔ شتری رنگ کا ایک بڑا گرم کوٹ پہنے ہیں، گنجیا کو مفلر سے لپیٹے ہوئے ہیں اور پاؤں میں سلیٹی رنگ کی فوجی جرابیں پہنے ہوئے ہیں، انگیٹھی میں کوئلے راکھ بن چکے ہیں لیکن کبھی کبھی اس راکھ پر ہی ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے ہیں۔ غالباً کوئی مضمون لکھنا چاہتے ہیں، قلم ہاتھ میں لے کر کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ سلائی اندر آتی ہے۔

"کیوں جی! وہ چائے کو کیا ہو گیا؟"

"حضور! آپ سے عرض کرنے آئی تھی کہ بیوی جی نے چائے تیار کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ چائے سے آپ کا دل کمزور ہو جائے گا"

"دل کی بچی! میرا دل یا میری بیوی کا دل۔ میرے دل سے اسے کیا تعلق؟"

"وہ کہتی ہے کہ میں آپ کے دل کی ذمہ دار ہوں"۔

"ارے! وہ ہم سے زیادہ حکمت جانتی ہے؟ ہم اپنا نفع نقصان نہیں سوچ سکتے؟ اسے کہہ دو کہ میرے دل کا سوائے میرے کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ اس پگلی کو کیا علم کہ چائے کے بغیر ہم ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے بہر صورت تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ میرا حکم میرا حکم ہوگا کسی بشر کو مجاز نہیں کہ اس میں رخنہ اندازی کرے، ــــ اُف! میں سمجھ گیا! ــــ بات ہوئی نا! گھر میں دودھ نہیں ہوگا، بارش ہو رہی ہے۔ بیوی جان نے یہ خیال کیا ہوگا کہ ہماری پیاری بڑھیا نالائق کاسم چور مغلانی کہاں جائے گی۔ بہانہ کر کے ٹال دیا، کیوں! یہی بات ہے نا! اب بولتی نہیں! خیر! جاؤ دودھ کے بغیر ہی لے آؤ، چلی ہوا ذرا بات تو سنتی جانا، ان رسائے

والوں نے بہت تنگ کیا ہے، ہر روز ایک خط آجاتا ہے (حالانکہ صرف ایک خط آیا تھا) کہ سالنامے نکل رہے ہیں، (منہ بنا کر) اللہ کوئی مضمون بھیجو، آپ کے مضمون کے بغیر سالنامہ ایک دھڑی کا نہیں ہوگا، آپ کی تصویر بھی شائع ہوگی، سمجھ میں نہیں آتا کس موضوع پر لکھوں، بہتیرا دماغ کو کھجلایا ہے۔ لیکن کوئی بات ذہن میں نہیں آئی، تمہیں بھی تو میرے پاس رہتے ہوئے بیس سال ہوگئے، کوئی بتاؤ راستہ، ہاں کوئی اچھا سا موضوع تجویز کرتا۔"

"حضور! میں کیا اور میری بساط کیا، مضمون نگاری میں آپ ایسے وقت کے حاتم طائی ہیں، آپ کو کچھ بتانا زمانے کو چراغ دکھانا ہوا، میرے خیال میں موسم پر آج تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا آپ لکھیں تو بس غضب ہی ہو جائے گا۔"

"کیا کہا! موسم؟ آگئی ہے کہیں سے مجھے مشورہ دینے! بھاگ یہاں سے، مجھے کوئی گنوار سمجھی ہو کہ موسم پر لکھوں! ایک حرف بھی اب تم نے بکا تو زبان تراش لوں گا۔"

مغلانی بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی تو آپ ہوا سے مکہ بازی کرنے لگے، رہ رہ کر مغلانی پر دانت پیس رہے تھے۔

"پاجی عورت! مجھے کوئی پانچویں جماعت کا لڑکا سمجھا ہے۔"

قلم دانتوں میں لے کر کچھ سوچنے لگے لیکن اب کسی اور خیال کا ذہن میں گھسنا محال تھا، جھلا کر اٹھے۔

"پاجی عورت! اس وقت سامنے ہو تو چوٹی ہی کاٹ لوں۔"

دو تین بار کمرے میں ادھر اُدھر نہایت تیزی سے چل گئے۔ پھر مٹھا کھڑے ہوگئے اور منہ چڑا کر کہنے لگے۔

"موسم پر آج تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا ــــ"

"آپ لکھیں تو بس غضب ہی ہو جائے گا۔" پاجی عورت! بڑھیا کھوسٹ! شیطان کی خالہ۔"

بہت جد و جہد کی لیکن موسم کا خیال بار بار ستا رہا تھا، ادھر بارش کا شور ادھر داغی کاوش نے کچھ عجیب جنجال میں ڈال دیا، گھونسا تان کر کھڑکی کی طرف چلے، قریب تھا کہ آپ گھونسے کا وار کر بیٹھتے لیکن مٹھا خیال آگیا کہ یہ ایڈیٹر تو نہیں شیشہ ہے۔

کمکھنت دیتے دلواتے تو کچھ نہیں، چلو موسم پر ہی الم غلم لکھ کر ڈال دو، اب ذرا قلم کی روانی دیکھئے۔

"معلوم نہیں ہندوستانیوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے، جب گرمی آئے تو کہتے ہیں اس سے تو جاڑا اچھا تھا، انسان لپٹ لپٹا کر اندر جا بیٹھتا ہے اور کچھ نہیں تو انگیٹھی سے کمرہ گرم کر سکتا ہے اور جب جاڑا آئے تو سب سینے پر ہاتھ باندھ لیتے ہیں، موسم کو، موسم بنانے والے کو اور ہندوستان کی آب و ہوا کو بے نقط سناتے ہیں۔ بھائی! اس سے گرمی ہزار درجے بہتر، بندہ چاہے ننگا ہی پھرے اور غریب کے لئے تو گرمی کا موسم کس قدر سود مند ہوتا ہے، چاہے گلی میں پڑ رہے یا کسی دکان کے تختے پر دراز ہو جائے۔ غرض کہ حیف ہے ہندوستانی کی عقل پر، اگلے وقتوں کے کیا اچھے سمے تھے، ٹھیک وقت پر موسم کی افتاد ہوتی ہے، مجال ہے جو ایک دن بھی آگے پیچھے ہو، اب تو خدا کے پروگرام میں بھی عجیب بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں کہ کبھی تو اکتوبر ہی میں دانت بجنے شروع ہو جاتے ہیں اور کبھی سارا دسمبر ہی گرم کوٹ کی ضرورت کے بغیر گزر جاتا ہے۔ صدیوں سے ہندوستان کی روائت چلی آرہی ہے کہ ساون میں سیاہ بادل جھوم کر آتے ہیں اور ہر روز گھٹا ٹوپ گھٹائیں چھاتی ہیں، مینہ کھل کر برس جاتا ہے تو چاروں طرف ہریاولی ہی ہریاولی نظر آتی ہے لیکن زمانہ بھی دیکھنا تھا کہ سارا ساون ہی سوکھا گزر جاتا ہے اور لوگ منہ کھول کر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، کبھی اکتوبر میں ہو رہی ہے اور کبھی نومبر میں، مانا کہ لوگوں کے اعمال درست نہیں ہیں۔ لیکن خدا کو بے قاعدگیاں کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، اسے غالباً معلوم نہیں کہ سدھرنے کی بجائے انسانوں پر اس طرح برا اثر پڑے گا۔"

اتنا لکھ کر آپ نے انگیٹھی کی طرف نگاہ ڈالی۔ دانت بجنے لگے گویا ٹائپ کی مشین چل رہی ہو، دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوب ملا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

"ہمارے نوجوانوں نے سن رکھا ہے کہ یورپ میں گرمی بہت کم پڑتی ہے اور سارا سال ایسا موسم ہوتا ہے کہ آدمی خوب جان مار سکتا ہے، یہاں پر جس کو دیکھو یہی کہہ رہا ہے کہ اگر ہندوستان کا یورپ جیسا موسم ہو تو پھر دیکھو ہم ۱۴ گھنٹوں میں سے ۱۸ گھنٹے کام کریں، ہندوستان کی عزت بھی جاتی نظر نہ آئے، ان بھلے مانسوں نے ہندوستان کو بدنام کر دیا ہے، ان اوندھی کھوپڑیوں سے کوئی یہ پوچھے کہ تمہارے اسلاف جنھوں نے دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دی، اسی موسم میں پل کر جوان ہوئے یہیں سے اُٹھے اور اسی خاک میں مل گئے اور اپنا نام دنیا میں چھوڑ گئے،

انہوں نے تو آج تک موسم کی شکایت نہ کی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، علیک سلیک کے بعد ہر ایک یہی کہتا ہے "شیخ صاحب! موسم اچھا نہیں، کسی کام کو دل نہیں چاہتا" شیخ صاحب! موسم بہت اچھا ہے، باہر گھومنے کو دل چاہتا ہے" کوئی بیماری بھی ایسی ہوگی جس کے لئے موسم کو ملزم نہ ٹھیرایا جاتا ہو، اگر کسی سے کہا جائے کہ مجھے زکام ہو رہا ہے تو فوراً جواب ملے گا "موسم اچھا نہیں، ذرا احتیاط کیا کریں"۔ ایک دفعہ مجھے بخار ہوا، پہلے ہی کونسا میں پہلوان ہوں لیکن بخار نے تو میرا کچھ مرہی نکال دیا، بہت علاج کیا لیکن جب تک ہڈیوں سے ہڈیاں نہ بج گئیں بخار نے پیچھا نہ چھوڑا، میرے ایک عزیز دوست تیمارداری کے لئے آئے، آپ ایسے منہ بنا کر کہنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"کوئی بات نہیں شیخ صاحب، آج کل موسم ہی خراب ہے۔ آج کل تو چنگا بھلا آدمی بھی بخار سا محسوس کرتا ہے، میں دانت پیس کر ہی تو رہ گیا، ان کے خیال میں مجھے ضرور بخار چڑھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ موسم ہی ایسا تھا، جس ڈاکٹر سے ملتا وہ یہی کہتا "موسم خراب ہے ذرا احتیاط رکھیں"۔ ڈاکٹر تو خیر ڈاکٹر ہی تھے لیکن جس جان پہچان والے سے ملا ہوں ہر ایک یہی کہتا تھا۔

شیخ صاحب! موسم خراب ہے، ذرا کونین کا استعمال رکھیں، شیخ صاحب! میری صلاح پوچھئے تو جلاب ضرور لے لیجئے، آج کل جلاب کا موسم ہے، بنفشہ ابال کر ضرور پیجئے گا، میرے ابا جان نے ایک دوائی بتائی تھی، خدا جانتا ہے کہ اس کے ایک دفعہ کھانے سے کوئی بیماری نزدیک نہیں آتی" ہر کامریڈ آپ استعمال نہیں کرتے؟ افوہ اس سے بہتر اکسیر تو دنیا میں آج تک پیدا ہی نہیں ہوئی، شیخ صاحب! ہر وقت سوئف چابتے رہئے۔ شفا تو خدا کے اختیار میں ہے۔ لیکن میں شرط بدنے کو تیار ہوں کہ ہاضمہ کبھی خراب نہ ہوگا اور ہاضمہ کی خرابی سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

کہاں تک لکھوں! دنیا کا ہر ایک مرد اور عورت ڈاکٹر ہے صحت کی تھوڑی سی شکایت کر دیجئے تو اس کے جواب میں ہر ایک شخص کی زبان سے ایک نسخہ سن لیجئے اور لطف یہ کہ ہر ایک شخص اس کے مجرب ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ ہاں! قوت یہ تھی کہ بیماری کے اسباب میں سے موسم کو سب سے پہلے مطعون کیا جاتا ہے، جیسے کانگریسیوں کے نزدیک گورنمنٹ کی ہر ایک حرکت قابل الزام ہے۔ اسی طرح موسم انسان کے لئے کبھی انصاف نہیں کر سکتا اور لطف تو یہ کہ انسان بھی کبھی کسی موسم سے خوش نہیں ہوتا"

یہاں تک لکھنے پائے تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی، دستک سے ہی پہچان گئے کہ عبدالرزاق ہے، باچھیں کھل گئیں کہ عبدالرزاق میرا اچھا مضمون سن کر ہنستے ہنستے نڈھال ہو جائے گا، حالانکہ انہیں ایک مرتبہ پہلے بھی یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اسی عبدالرزاق کے کہنے پر آپ نے بھری محفل میں ایک مزاحیہ مضمون سنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ سارا مضمون پڑھ گئے لیکن کوئی مسکرایا تک نہیں، البتہ ایک بوڑھا جو بہت دور بیٹھا تھا اور جس نے ایک لفظ بھی نہ سنا تھا، مضمون کے ختم ہونے پر کھلکھلا کر ہنس پڑا!

"کیوں جی، یہ نکما سا مقالہ تھا؟" شیخ صاحب بہت جھلائے اور اس جھلاہٹ میں چند ایسی حرکات کیں جس پر قہقہے اڑتے رہے، شیخ صاحب نے اس دن سے عہد کر لیا کہ کسی محفل میں اپنے قیمتی تخیلات کی ارزانی نہیں کروں گا، انہیں حیرت تھی تو اس بات کی کہ جب وہ نہایت متین اور شستہ موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو لوگ بے اختیار ہنستے تھے اور جب وہ مزاحیہ مضمون سناتے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا، لوگوں کی بدمذاقی پر وہ آنسو بہانے لگے اور یہ وعدہ کر لیا کہ آئندہ صرف عبدالرزاق کو مضمون سنایا جائے گا اور بس، عبدالرزاق کا معمول ہو چکا تھا کہ آتے ہی پوچھتا

"شیخ صاحب! کوئی مضمون لکھا؟"

ادھر شیخ صاحب گاؤ تکیہ اتارتے ہوئے کہتا "ہاں! مزاحیہ لکھا ہے" عبدالرزاق مضمون سننے سے پیشتر لفظ "مزاحیہ" سنتے ہی ہنسنا شروع کر دیتا تھا اور دوران مضمون میں تو اکثر بے موقع قہقہے لگایا کرتا تھا

عبدالرزاق نے اندر آتے ہی کہا۔

"دیکھا شیخ صاحب! محض آپ کا مضمون سننے کے لئے بارش میں شرابور یہاں پہنچا ہوں، مزاحیہ لکھ رہے ہو نا؟ کیا کیا جائے موسم بہت خراب ہے"

"بس یار! اب کے تو میں نے موسم کو ہی رگید دیا ہے"

عبدالرزاق ساتھ ساتھ کانپتا جاتا ہے اور بار بار خالی انگیٹھی کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے۔ شیخ صاحب! جب تک انگیٹھی کوئلوں سے بھری

ہوئی باہر نہ آئے ہم ایک لفظ بھی نہ سنیں گے۔"

شیخ صاحب بھاگے ہوئے گئے اور دوسری انگیٹھی ہانپتے ہوئے لے کر اندر داخل ہوئے۔ نہایت تیزی سے دروازے کو بھیڑ چڑھا دی اور دروازے کے سوراخ پر کان رکھ کر کچھ سننے لگے گویا کوئی شخص ان کا تعاقب کر رہا تھا، عبدالرزاق تاڑ گیا تھا کہ بیوی ان کے پیچھے بھاگی آئی ہوگی

"اب بات بنی ماما" یہ کہہ کر عبدالرزاق نے اپنا گیلا کوٹ اتارا اور انگیٹھی پر خشک کرنے لگا، شیخ صاحب کبھی متین ہو کر، کبھی مسکرا کر، کبھی مٹک مٹک کر، کبھی زور دے کر، کبھی تھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دے کر اپنا مضمون سنا رہے تھے اور وہ پاجی بے اختیار قہقہے لگا رہا تھا، حالانکہ ان قہقہوں میں وہ کچھ بھی سن نہ رہا تھا،

جب مضمون سنا چکے تو شیخ صاحب فرمانے لگے۔

"دوست! کشمیرے کا ایک نیا سوٹ سلوایا ہے، ذرا دیکھو تو سہی بدن پر بیٹھتا ہے یا نہیں"

شیخ صاحب نے آن واحد میں سوٹ صندوق سے باہر نکالا اور عبدالرزاق کے سامنے ہی بدلنا شروع کر دیا، عبدالرزاق تھوڑا سا کھسیانا ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگا، جب شیخ صاحب فارغ ہو چکے تو عبدالرزاق چھٹیں مار مار کر ہنسنے لگا۔

"ارے میرے دولہے! ارے میرے دولہے!" کہتا ہوا شیخ صاحب کے نزدیک آگیا اور ان سے بغلگیر ہو کر کہنے لگا،

"آج تو آپ کو ہر صورت باہر جانا ہوگا"

"عبدالرزاق! ذرا موسم اچھا نہیں، آج کیچڑ ویچڑ بھی بہت ہوگا"

"ارے بھائی! آج تو اس سوٹ پر لڑکیاں قتل ہو جائیں گی، آج مال روڈ پر جس کی طرف تم نے دیکھا بس وہ عمر بھر کے لئے لونڈی ہو جائے گی، اب تو اکا دکا بادل آسمان پر بھٹک رہے ہیں، آج آپ نہ گئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے فرائض معاشرت کی عدم ادائیگی میں سنگین ترین گناہ کیا"

عبدالرزاق کا اتنا کہنا تھا کہ شیخ صاحب فوراً تیار ہو گئے، اس میں شک نہیں جب وہ گھر سے چلے تھے تو مطلع صاف ہو چکا تھا لیکن راستے میں پھر مشرق سے بادل اٹھے اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ فالبًا ان بوندوں کو تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن زمین سے کیچڑ کا اچھال بالکل ناقابل برداشت تھا اور خاص کر شیخ صاحب تو اس دن نیا سوٹ پہن کر نکلے تھے اور خدا کی مرضی یہ کہ ان کی چال بھی عجیب و غریب تھی، کیچڑ اچھل اچھل کر راہگیروں کی خبر لا رہا تھا، سامنے کے چھینٹے ہاتھ سے صاف کر کے پتلون کی جیب میں صاف پونچھ لیتے، پچھلے حصے میں کیچڑ جو کچھ کر رہا تھا۔ اس سے بے خبر تھے، سردی کے مارے لرزہ براندام ہو رہے تھے۔ کم بخت عبدالرزاق نے سویٹر بھی تو نہ پہننے دیا، اس خیال سے کہ نئے سوٹ کی شان میں فرق آجائے گا، بے چارے عجیب مصیبت میں مبتلا تھے،

گھر پہنچے، دیر تک بے چارے سوٹ کا مرثیہ پڑھتے رہے اور چاقو سے چھیل چھیل کر گرم کپڑے کی تمام برائی دی۔ لیکن کیچڑ تو ایسا دھس گیا تھا کہ صرف جلانے سے ہی نکل سکتا تھا۔ آپ از حد بھرے اور خوب جی بھر کر عبدالرزاق کو بے نقط سنائیں جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو کوٹ کو میخ پر لٹکا دیا، تمام رات نیند نہ آئی، کئی بار اٹھ اٹھ کر میخ کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

دوسرے روز آپ بہت بے قرار تھے چنانچہ غصے میں پھر سیر کو اکیلے ہی نکل کھڑے ہوئے، سب سے پہلے آپ نے چھاتا خریدنے کا تہیہ کیا، دکاندار سے کہا

"کوئی اچھا سا چھاتا دے دو"

"شیخ صاحب! آپ کو بالکل نئی چیز دکھاؤں گا"

دکاندار خود بخود کھل جانے اور بند ہونے والا چھاتا لے آیا اور شیخ صاحب کے سامنے عمل کیا، شیخ صاحب کچھ اس خیال سے کہ دکاندار نے انہیں شیخ صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور کچھ یہ بات کہ وہ نئی چیز ہاتھ میں دیکھنا چاہتے تھے، چھاتا خرید لیا۔

ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ بادل کڑکا اور چھم چھم بارش شروع ہو گئی، اب شیخ صاحب چھاتے پر دھرے ہو رہے ہیں لیکن بٹن دبانے کا ڈھنگ وہ بھول گئے، بھیگتے جا رہے ہیں اور چھاتے سے ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ کپڑوں میں سے پرنالوں پانی بہہ رہا ہے۔ جب خوب شرابور ہو گئے تو چھاتا ٹن سے کھل گیا، اس وقت بارش بھی ختم ہو چکی تھی، انہیں امید نہ تھی کہ چھاتا کھل جائے گا۔ اس بوکھلاہٹ میں چھاتا کھلنے سے ایک بھلے مانس کی ہیٹ اڑتی نظر آئی ہوا تیز ہو چکی تھی اس لئے ہیٹ سڑک پر قلابازیاں لگاتی ہوئی بھاگ رہی تھی، کہیں ایک صاحب کا کتا یہ تماشا دیکھ رہا تھا وہ ہیٹ کے پیچھے دوڑا اور کافی فاصلے پر جا کر ٹوپی کو دبوچ لیا، سڑک پر چاروں طرف قہقہے بلند ہو رہے